تصوف، دانش اور محبت
ایک ربطِ باہم
انور علی شاہ

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

تصوف، دانش اور محبت

ایک ربطِ باہم

(ناولٹ)

انور علی شاہ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

801.953 Shah, Anwar Ali
Tasawaf, Danish Aur Mohabbat/ Anwar Ali Shah.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2012.
240pp.
1. Urdu Literature - Novelette.
I. Title.

2012
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2509-4
ISBN-13: 978-969-35-2509-0

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اپنی پیاری بیگم

سیّدہ آمنہ بخاری

کے نام

پیش لفظ

تصوف، دانش اور محبت ایک ایسی کتاب ہے جو مختلف مذاہب میں تصوف کے نظریات کو تلاش کرتی۔ اُن کی الہامی کتابوں سے ماخوذ آیات کا ترجمہ پیش کرتی ہے۔ جو اس حقیقتِ ابدی کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت کا اقرار اور اس سے ملاقات کی تمنا روز ازل سے موجود ہے اور روز ابد تک قائم رہے گی۔ در حقیقت حقیقت کی تلاش انسانی روح کا تقاضا ہے اور یہ جستجو مختلف انداز سے مختلف طریقوں سے موجود ہے مگر مقصد و منشا ایک ہی ہے۔ خدا کی تلاش اور اس سے ملاپ کی جستجو۔

مصنف نے مذہبی حوالوں سے ہی نہیں اور الہامی کتابوں سے ہی نہیں بلکہ یونانی مفکرین سے لے کر جدید ترین فلاسفر تک جو مختلف نظریات کے حامل ہیں۔ جن میں برٹرینڈ رسل سے ملحد اور ژاں پال سارتر جیسے منفیت پسند اور زندگی سے بے زار لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کے افکار میں سے دانش اور محبت کو ڈھونڈ نکالا ہے جو تصوف ہی کی صورتیں ہیں۔ مصنف نے ایک ہی سلسلے کی کڑیوں کو جوڑا ہے اور ایک تاریخی ربط تلاش کیا ہے جو انسانی فکر کے دھارے میں جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس کتاب میں جہاں تصوف و دانش ہے وہاں محبت اور رومانس بھی ہے۔ کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے حقیقت کو تھوڑا سا فکشن سے ملا دیا گیا ہے تا کہ قاری نفسِ مضمون کے دقیق پہلوؤں کے ابہام سے محفوظ رہے جو کہ عام طور پر ایسی کتابوں کی اساس ہوتی ہے۔ اس کتاب میں معرفت اور محبت کو ملا کر ایک چاشنی، ایک مٹھاس پیدا کی گئی ہے کہ قاری کے ذوق ذائقہ کو ایک میٹھی راحت کا احساس دلائے

گی اور اس کی طبیعت بوجھل نہیں بلکہ ہشاش بشاش ہو جائے گی۔ اس کتاب میں علمیت نہیں، بصیرت کے نایاب موتی ہیں۔ حضرت علیؑ کے خطبات اور اقوال ہیں۔ حکمت کی باتیں ہیں۔ بصیرت کے روشن چراغ ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف مثبت سوچ کو جنم دے گی بلکہ پریشان دلوں کا سکون، مضطرب روحوں کو قرار اور بے چین دل کو قرار بخشے گی۔ میری گزارش ہے کہ ایک مرتبہ آپ کتاب یا اوراق پلٹ کر مطالعہ شروع کریں۔ کتاب کو آپ چھوڑ دیں لیکن کتاب آپ کو نہیں چھوڑے گی۔

سید امتیاز علی بخاری

ڈی۔ جی

اکاؤنٹ سروس اکیڈمی، لاہور

دیباچہ

یہ کتاب..... کتاب نہیں ہے۔ تصوف، بصیرت اور محبت کی کہانی ہے۔ ایسی کہانی جو دیو مالائی نہیں حقیقی ہے۔ تاریخی ہے، الہامی ہے، آسمانی کتابوں کا ماخذ ہے۔ حقیقت اور محبت کی ایک زنجیر ہے جس کی کڑیاں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ کتاب نہیں تسبیح ہے۔ عقل و دانش اور فکر و تدبر کے دانے پروئے ہوئے ہیں۔ اس تسبیح کے امام حضرت علیؑ ہیں جو ولایت کے بانی، دانش کا پیکر اور علم کا دروازہ ہیں۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا کیونکہ مجھے علم ہے کہ مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ بس ایک وجدان، ایک جنون میرا مددگار رہا ہے جو مجھے صبح صادق کو جگاتا تھا اور میری دانش سے سوچ کے دائرے ایک غیر مرئی قوت کے زیر اثر الفاظ میں ڈھل جاتے تھے۔ میرا صرف اتنا ہی کمال ہے کہ میرا کوئی کمال نہیں۔

بقول غالب:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

انور علی شاہ

یہ اقبال ٹاؤن لاہور کے گلشن بلاک کا ایک دس مرلے کا گھر تھا۔ جو چار کمروں پر مشتمل تھا۔ اقبال ٹاؤن ایک متوسط طبقے کی آبادی ہے جہاں زیادہ تر نوکری پیشہ لوگ جیسے ڈاکٹرز، انجینئرز اور بینکرز رہتے ہیں۔ کچھ گھر پروفیسر حضرات اور درمیانہ درجے کے کاروباری لوگوں کے بھی ہیں۔

پروفیسر زبیر ایسے ہی ایک گھر میں اپنی ہمشیرہ رابعہ کے ساتھ مقیم تھے۔ رابعہ نے امتیازی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا تھا اور اب ایک ڈگری کالج فار گرلز میں لیکچرار تھی۔ والد اس وقت فوت ہو گئے جب وہ بی۔اے میں پڑھتی تھی اور اب دو سال سے والدہ بھی قضائے الٰہی سے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔

رابعہ ایک طویل قامت، سیڈول بدن والی خوبصورت لڑکی تھی۔ بچپن میں بہت شوخ و چنچل ہوا کرتی تھی۔ کالج میں انگریزی ادب سوسائٹی کی صدر رہی تھی اور مباحثوں میں شوق سے شریک ہوا کرتی تھی۔

اپنے خوبصورت نقوش، باریک ہونٹوں اور بڑی بڑی آنکھوں کی وجہ سے کالج میں اس کی سہیلیاں اکثر حسد کرنے لگتی تھیں۔ رابعہ ایک باوقار اور پر اعتماد لڑکی تھی لیکن والدہ کی ناگہانی موت نے اسے شدید متاثر کیا تھا۔ وہ شادی کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی کہ اچانک وہ ایک تلخ دنیا میں بیدار ہو گئی۔ گھر کے اخراجات اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے لیکچرار بننا پسند کیا تھا۔ ان دو سالوں میں وہ تنہائی کا شکار ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس کے بڑے بھائی پروفیسر زبیر نے اس کے ساتھ ایک بھائی اور دوست کا تعلق رکھا ہوا تھا۔ پروفیسر زبیر بھی انگریزی ادب کے استاد تھے اور کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھے لیکن ماں کی وفات نے گھر میں ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جو دوبارہ

بھر نہ سکا۔ پروفیسر زبیر 46 برس کے ہو گئے تھے لیکن چاک وچو بند تھے۔ انہوں نے والدہ کے بے حد اصرار کے باوجود شادی نہیں کی تھی۔ اگرچہ وہ خود ساختہ مجرد زندگی سے تنگ آ چکے تھے لیکن انہیں فائزہ کی ناکام محبت نے ایسا گھائل کیا تھا کہ پھر یہ زخم نہ بھر سکا۔ محبت کی ناکامی نے انہیں ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ احمد فراز کے شعر کی مانند

ٹوٹا تو ہوں پر ٹوٹ کے بکھرا نہیں فراز

میرے بدن پہ میری شکستوں کا جال ہے

اسی جال کو سمیٹے وہ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ رابعہ کی شادی کی فکر بھی انہیں پریشان رکھتی تھی۔ رابعہ اپنی عمر کی پچیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ پروفیسر زبیر زیادہ سوشل آدمی نہیں تھے۔ دو چار دوستوں کے علاوہ کسی سے نہیں ملتے تھے اور کالج سے گھر آ کر مشکل ہی سے کہیں باہر جاتے تھے کیونکہ رابعہ کو گھر میں اکیلا نہیں رکھتے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر نوکرانی ان کے گھر ہی رہتی تھی جس کی بیٹی کھانا بنانے، صفائی وغیرہ میں رابعہ کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ جب وہ بھی اپنے چھت والے کمرے میں چلی جاتیں تو گھر بہت اداس ہو جاتا۔ اگرچہ بھائی بہن کھانے کی میز پر تبادلۂ خیال کرتے تھے اور اکثر ادبی بحث میں بھی الجھ جاتے تھے۔ رابعہ بنیادی طور پر رجائیت پسند تھی۔ اسے انگریزی ادب میں جین آسٹن، ایما ڈکنسن اور شارلٹ برانٹے بہت پسند تھے جبکہ شاعری میں ملٹن، شیلے، لارڈ بائرن اور ورڈز ورتھ پسند تھے جبکہ پروفیسر زبیر کو چوسر، ملٹن، جون کیٹس اور براؤنگ پسند تھے۔ ناول نگاروں میں تھامس ہارڈی، چارلس ڈکن، شارلٹ برانٹے پسند تھے۔ پروفیسر زبیر زیادہ نہیں تو تھوڑے سے قنوطیت پسند ہو گئے تھے۔ زندگی نے انہیں سکھ کے بجائے دکھ زیادہ دیئے تھے۔ وہ اداسی اور تنہائی کا شکار تھے۔ ایک ہی دفعہ محبت کے قائل تھے۔ زندگی نے جتنے بھی زخم دیئے تھے، انہیں چپکے سے سہہ گئے تھے اور کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ ایسے Introvert لوگ غم کے دریا بھی پی جائیں تو ہونٹوں پر احتجاج کی صدا بلند نہیں کرتے۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں کرتے۔ اندر ہی شمع کی مانند پگھلتے رہتے ہیں۔ اپنی ذات کے گرداب میں خود ہی ڈوب جاتے ہیں۔ وہ نہ دکھ کا اظہار کرتے ہیں، نہ غم کو زبان دیتے ہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھی اس کرب کا عکس نہیں دکھاتے جو اندر ہی اندر گھاؤ لگا رہا ہوتا ہے۔ وہ خاموشی میں گفتگو کرتے اور آنکھوں سے غم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پروفیسر زبیر ایسے ہی تھے۔

اس روز وہ گھر دیر سے آئے تو رابعہ آ چکی تھی اور کچن میں تھی۔ وہ سلام کر کے اپنے

سٹڈی روم میں چلے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک سنگل بیڈ اور ایک صوفہ رکھا ہوا تھا۔ صوفہ پرانا ہو چکا تھا۔ اس لیے اس پر سفید رنگ کی چادر چڑھادی گئی تھی۔ سامنے ایک بڑا شیلف تھا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ محبت میں ناکامی کے بعد زبیر نے کتابوں سے محبت کر لی تھی اور اب کتابیں ہی اس کی محبوبہ تھیں۔ وہ ان کتابوں میں ڈوب کر خود کو تلاش کرتے۔ دنیا کے عظیم فلاسفروں کے خیالات اسے متاثر کرتے۔ وہ سوچنے والا آدمی تھا۔ وہ زندگی کے معانی تلاش کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اب تو اس نے جدید ناول نگار (Best Sellers) جیسے ہر ولڈ رابن کے مشہور ناول A stone for Danny fisher "Stillots" ،"The Carpet begger" اور "The thotn bird" کا Never meet a stranger۔ رابن کوک، جیمز ہیڈ لے چیز کا "The other side of mid-night" Moria Piazzo ۔ کا ''گاڈ فادر'' اور شیلڈن سیڈ لے بریڈ فورڈ کا "A women with a substance" اسے بہت پسند تھا۔

اس کے شیلف میں تاریخ، فلسفہ، ادب اور شاعری کی بے شمار کتابیں تھیں۔ کتابوں کے عشق نے ہی تو اسے فائزہ کے عشق سے بیگانہ کر دیا تھا۔ درحقیقت دونوں ایم۔اے کے کلاس فیلو تھے۔ فائزہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا آدھے سے زیادہ خاندان حاضر اور ریٹائرڈ فوجی افسروں پر مشتمل تھا۔ وہ خود کو بھی مارشل ریس سمجھتی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں بڑی گاڑی پر آتی تھی اور اس کا لباس، اس کا فیشن اسٹیل سٹائل دوسری لڑکیوں میں حسد پیدا کر دیتا تھا۔ وہ ایک لاپروا اور شوخ و چنچل دوشیزہ تھی۔ وہ زبیر کی طرف مائل تھی۔ اسے زبیر کی ذہانت اور (Intellectualism) پسند تھا۔ وہ اکثر زبیر کے ساتھ لائبریری میں بیٹھ کر انگریزی ادب پہ باتیں کرتی اور وہ بہت متاثر ہوتی۔ زبیر کی اسی خوبی نے اسے زبیر کا دیوانہ کر دیا۔ وہ خوبصورت باتیں سننے کی دلدادہ تھی۔ زبیر کو John Keats کی ساری "Odes" زبانی یاد تھیں۔ وہ اکثر کہتی کیٹس نے A thing of beauty is a joy for ever میرے لیے کہا ہے I am the beauty۔ وہ بڑے فخر سے کہتی اور زبیر کا ہاتھ پکڑ کر کینٹین لے جاتی۔ اسے کافی اور چکن پیز بہت پسند تھے۔ وہ زبیر کو اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر دیتی۔ اشاروں کنایوں میں اپنی محبت کا اظہار کرتی۔ لوگ ان دونوں کی محبت کی کہانیاں بناتے۔ سکینڈل مشہور ہوتا مگر وہ بے پروا تھی۔ وہ کسی کی پروا نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو صاف کہہ دیتی۔ ''ہاں! مجھے زبیر پسند ہے۔ وہ میرا آئیڈیل ہے۔ میں اسے دل سے چاہتی ہوں۔'' وہ آزاد خیال، روشن اور خود دار تھی۔ ایک چڑھتی ہوئی ندی

کی طرح۔ ایک تیز و تند جھرنے کی مانند۔ اس کے کلاس فیلوز اُس سے بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وہ دوسروں کے لیے تیز دھوپ تھی تو زبیر کے لیے ٹھنڈی چھاؤں۔ اس کے نقرئی قہقہے زندگی کی تمازت تھے۔ جذبات کی حرارت تھے۔ وہ شرم و حیا کی بند کلی نہیں تھی، کھلا ہوا مغرور پھول تھی۔ اسے اپنے حسن پر ناز تھا لیکن شوخ تتلی کی طرح محوِ پرواز رہتی۔ آہستہ آہستہ زبیر اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ ایک واضح Status gap تھا، ایک تضاد تھا لیکن اس کی جذباتی باتیں زبیر کو گھائل کر دیتیں۔ وہ اس کے قریب آتا چلا گیا۔ وہ دونوں یونیورسٹی کے لان میں سردیوں کی دھوپ انجوائے کرتے۔ وہ گھاس کے تنکے توڑتی زبیر سے پوچھتی۔ "کیا تم ایم۔ اے کے بعد C.S.S کا امتحان دو گے؟" زبیر کی ہلکی سی ہاں پر وہ مطمئن نہ ہوتی۔

"دیکھو زبیر! میری جان۔ میرا خاندان افسروں کا خاندان ہے۔ ہم لوگ عہدہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اگر تم مجھے پانا چاہتے ہو تو D.M.G کے افسر بن جاؤ۔ C.S.S کے لیے جان لڑا دو ورنہ میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

زبیر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اسے انگریزی ادب سے عشق تھا۔ وہ پروفیسر بننا چاہتا تھا۔ اسے علم سے محبت تھی۔ وہ افسر شاہی کا کل پرزہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ دولت اور عہدہ کا متقاضی نہیں تھا۔ وہ ظلم، بے رحمی اور اختیارات کے استعمال کا شوقین نہیں تھا۔ وہ کمشنر نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کے اندر ایک درویش پوشیدہ تھا جو جاہ و حشمت کا متلاشی نہیں تھا۔ وہ بہت زیادہ Ambitious بھی نہیں تھا۔ وہ ایک پرسکون زندگی کے خواب دیکھتا تھا جس میں خلوص، محبت اور دھیما پن ہو لیکن فائزہ تو تیز ہوا تھی۔ برق رو تھی۔ وہ بلند سے بلند تر اڑنا چاہتی تھی اور اپنے ساتھ زبیر کو بھی اونچا اڑانا چاہتی تھی۔

جب آخری سمسٹر قریب آیا تو فائزہ اداس رہنے لگی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ دنوں کو پر لگ گئے تھے۔ لمحوں کا سفر ختم ہونے لگا تھا۔ وہ زبیر کو قائل نہ کر سکی اور جب فائنل کا رزلٹ آ گیا تو ایک اداس شام میں فائزہ نے آنسو بھری آنکھوں سے دلگیر لہجے میں کہا: "زبیر میری منگنی میرے ایک کزن سے طے ہو رہی ہے جو امریکہ میں ڈاکٹر ہے اور سارا خاندان اس رشتے پر خوش ہے۔ میں تو زبیر تمہیں چاہتی ہوں۔ میں نے تمہارے بارے میں ہی سوچا ہے لیکن میں پورے خاندان سے نہیں لڑ سکتی۔ وہ ایک لیکچرار، جو تم بننا چاہتے ہو، سے میری شادی کبھی نہیں کریں گے۔ تم نے میری بات مانی ہوتی تو میرا مقدمہ مضبوط ہو جاتا۔ میں فخر سے کہہ سکتی کہ میں ایک سی ایس

پی افسر سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو میں کامیاب ہو سکتی تھی لیکن ایسے نہیں۔ تم نے مجھے کھو دیا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ ''میں پرسوں امریکہ جا رہی ہوں۔ میں تمہیں خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔ کچھ بولو زبیر، تم چپ کیوں ہو؟ مجھے زبردستی روکو۔ مجھے بے وفائی کا طعنہ دو۔ مجھ سے لڑو۔ میں اب کبھی تم سے مل نہیں پاؤں گی۔''

لیکن زبیر تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ ایک بت کی طرح خاموش۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے، بے حس اور بے جان۔ فائزہ نے اس کے ہاتھ کو چوما اور آنسو صاف کرتی ہوئی سائے کی طرح شام کے ملگجی اندھیرے میں گم ہو گئی۔

فائزہ تو چلی گئی لیکن زبیر افسردگی اور بے چارگی کا مجسمہ بن گیا۔ اس کی زندگی میں جو تازہ ہوا کا جھونکا آیا تھا، وہ گھٹن کو مزید تیز کر گیا۔ زبیر کو ایسا لگا جیسے اس کی بند مٹھی میں ریت پھسل گئی ہو اور ہاتھ خالی ہو گیا ہو اور واقعی ہاتھ خالی رہ گیا تھا۔

زبیر نے سوچ کا دائرہ توڑتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور صوفے پر بیٹھ کر ڈیگو کاریٹا مارکیز کا ناول "Hundred years of solitude" پڑھنے لگا۔ ابھی ایک صفحہ پڑھا ہو گا کہ رابعہ کی آواز آئی:

''بھائی جان! کھانا تیار ہے۔ آ جائیں۔''

کھانا کھا کر زبیر اپنے بیڈروم میں لیٹ گئے۔ انہیں نیند کا احساس ہوا۔ شاید دن بھر کی تھکن نے ان کے اعصاب شل کر دیے تھے۔

شعور نے گرفت ڈھیلی کی تو فائزہ ایک ہیولا بن کر سامنے آ گئی اور اس کا سایہ زبیر پر جھکا۔ تو سرگوشی کر رہی تھی:

''زبیر! کیا ہوا۔ تھک گئے ہو؟ زندگی کا بوجھ بہت بھاری ہو گیا ہے۔ لگتا ہے تمہارے اعصاب شل ہو گئے ہیں۔ زندگی کسی خوبصورت خواب کا نام نہیں۔ یہ تلخ حقائق کا مجموعہ ہے۔ یہ ریگستان میں ننگے پاؤں چلنے کا نام ہے۔ لیکن زبیر! ہمت کرو۔ میری محبت تمہارے ساتھ ہے۔ میرا جسم امریکہ میں ہے لیکن دل تمہارے ہی لیے دھڑکتا ہے۔ دل کے ساغر تمہاری یاد سے لبریز رہتے ہیں۔ روح کی تڑپ تمہاری آواز کی آہٹ سنتی ہے۔ اٹھو، میری محبت کو اپنی طاقت بناؤ۔ میری یاد کی شبنم تمہاری تمازت کو کم کر دے گی۔ میرا وجود بادل بن کر تمہارے سر پر سایہ رکھے گا۔ ناصر کے اس شعر کی طرح:

کیسے کٹے گا ہم سے کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو جہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں"

فائزہ کا ہیولا اور قریب آیا اور ایک پیار بھرا ہاتھ پیشانی پر رکھا تھا۔

"زبیر میری جان، گھبراؤ مت۔ میری محبت تمہارے ساتھ ہے۔" زبیر کو محسوس ہوا ایک عجیب سی مسیحائی اس کی روح میں اتر گئی ہو۔ طمانیت کا لطیف احساس وجود میں سما گیا ہو۔ اس کی بے چین روح اور مضطرب احساس کو سکون کی آشا مل گئی ہو۔ آنکھیں بند ہونے لگیں اور ابھی نیند کی دیوی اپنی آغوش میں سمیٹ رہی تھی کہ رابعہ کی آواز آئی:

"بھائی جان! آپ کا فون ہے۔"

ٹیلی فون پر دوسری طرف پروفیسر دلاور تھے۔

"زبیر! شام کو کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ خاص نہیں، فارغ ہی ہوں۔" زبیر نے کہا۔

"میرا دوست اور اس کا بیٹا امریکہ سے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا تم سے بھی ملوا دوں۔ گپ شپ رہے گی، ہم چائے پر آپ کے گھر آ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر پروفیسر دلاور نے فون بند کر دیا۔

پانچ بجے پروفیسر دلاور اپنے دوست ساجد اور بیٹے ندیم کے ساتھ زبیر کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ دلاور نے تعارف کروایا۔ "یہ میرے بچپن کے دوست ساجد صاحب جو آج سے پندرہ سال پہلے امریکہ چلے گئے تھے۔ وہاں مختلف Odd jobs کرتے رہے۔ پھر چھوٹا سا سٹور کھول لیا اور آج کل نیویارک میں ایک بڑے سپر سٹور کے مالک ہیں۔ ڈالروں میں کھیل رہے ہیں۔ ان کا بیٹا ندیم M.B.A کرنے کے بعد ان کا ساتھ دے رہا ہے بلکہ سارا کاروبار سنبھال رہا ہے۔ ساجد نے ایک امریکی عورت سے شادی کر لی تھی جو بہت خوش بختی کی علامت بن گئی۔ ساجد کو امریکی شہریت مل چکی ہے اور بیٹا تو پیدائشی امریکی ہے۔"

پروفیسر زبیر نے کہا "ذرا ٹھہریے۔ میں چائے کا کہہ کر آتا ہوں۔"

پروفیسر دلاور ایک سنجیدہ طبع لیکن مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ جسم ذرا فربہ تھا لیکن

گوری رنگت کی وجہ سے پرکشش تھے۔علم ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔کتابیں پڑھنا اور گفتگو کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔وہ تاریخ کے پروفیسر تھے لیکن فلسفہ اور تصوف ان کے پسندیدہ مضامین تھے۔ گویا تاریخ جو علم کی بنیاد کہلاتی ہے، ان کی سرشت میں شامل تھی۔ وہ فلسفہ اور تصوف پر اتنی خوبصورت گفتگو کرتے کہ سننے والا سحرزدہ ہو جاتا۔یہی ان کا کمال تھا۔

پروفیسر زبیر واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو پروفیسر دلاور بولے:

''یار کیا بات ہے۔کچھ اداس سے لگ رہے ہو۔'' واقعی زبیر کے چہرے پر اداسی کے گہرے سائے تھے۔

''نہیں، کچھ نہیں دلاور صاحب۔کوئی خاص بات نہیں۔'' زبیر نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو زبیر۔'' پروفیسر دلاور بولے۔

''انسانی چہرہ ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔یہ اندرونی کیفیات کا آئینہ ہے۔یہ سوچ کا پَرتو ہے۔خیالات کا عکس ہے۔مسرت کا ترجمان ہے۔غم کا دیباچہ ہے۔دکھ کی تحریر ہے۔ اداسی کا نقش ہے۔محبت کا ترجمان ہے۔نفرت کا خلاصہ ہے۔مایوسی کا حرف آغاز ہے اور شادمانی کا منظر۔ چہرے تو پڑھے جاتے ہیں۔ چہرے تو سچ بولتے ہیں، ساری بدن بولی (Body Language) چہرے پر سمٹ آتی ہے۔سچ سے چہرہ دمک اٹھتا ہے تو جھوٹ سے مرجھا جاتا ہے۔عیاری میں اس کے تیور اور ہوتے ہیں۔مکاری میں نقش بدل جاتے ہیں۔حسد چہرے کو کالا کر دیتا ہے۔انتقام اُسے آگ کا شعلہ بنا دیتا ہے۔بے حسی چہرے کو پتھر میں تبدیل کر دیتی ہے اور بے رحمی اسے خون زدہ کر دیتی ہے۔زبیر صاحب! آپ چہرے کو نہیں چھپا سکتے۔بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔''

پروفیسر زبیر کو محسوس ہوا کہ اُن کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا:

''پروفیسر صاحب، آج کل کونسی کتاب پڑھ رہے ہیں۔مجھے کچھ فلاسفی سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔کچھ فلسفے کے بارے میں بتائیے۔''

ساجد صاحب نے بھی تائید کی۔ان میں جاننے کی ایک طلب تھی۔

پروفیسر دلاور گویا ہوئے ''الہامی کتابوں کو چھوڑ کر علم کو انسان کے قریب تر کرنے کی

پہلی کوشش افلاطون (Plato) نے کی۔ فلسفہ بقول افلاطون ایک دلآویز مسکراہٹ تھی۔ زندگی کے معانی تلاش کرنا انسانی جبلت ہے۔ براؤننگ کی طرح ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی معانی سے خالی ہے اور اس کے معنی دریافت کرنا ہی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔

زبیر صاحب! ہماری زندگیوں کا بیشتر حصہ دراصل بے مصرف ہوتا ہے۔ خودکشی، تذبذب اور بیکاری ہم اس اختلاف سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ جو خارج میں اور ہمارے وجودِ باطنی میں برپا ہے لیکن ہمیں یہ یقین ہے کہ ہمارے وجود میں کوئی معنی خیز اور قوتِ حیات سے بھرپور اہم چیز موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی روح سے آگاہ ہو جائیں۔

بیکن نے ذہن کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا: "پہلے ذہنی خوبیاں حاصل کرو۔ باقی چیزیں یا تو مل جائیں گی یا ان کی کمی کا احساس بھی نہ ہوگا۔" صداقت ہمیں دولت مند نہیں بناتی لیکن آزادی عطا کرتی ہے۔"

ساجد صاحب بولے "فلسفہ تو مبہم ہے۔ بے مصرف اور جامد ہے۔ آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ فلسفہ تو دم توڑ چکا ہے۔ وہ سائنسی سوچ (Imperical thinking) کا سامنا نہیں کر پایا۔ سائنس آگے بڑھ رہی ہے، فلسفہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔"

"نہیں ساجد صاحب۔ بظاہر تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی سے اتنا متاثر ہو چکے ہیں کہ ساری حقیقتیں تبدیل ہوگئی ہیں لیکن سائنس ابھی بہت ہی محدود ہے۔ بہت سے مسائل سائنس کے دائرہ عمل سے باہر ہیں۔ مثلاً خیر و شر، حسن و بدصورتی، جبر و قدر، مرگ اور زیست، وجود کی نفی اور اثبات، روح کی موجودگی، سچ اور جھوٹ، فہم اور ادراک۔"

ہر سائنس کا آغاز فلسفہ ہے اور انجام آرٹ۔ سائنس مفروضہ (Hypothesis) ہے۔ یہ فکشن سے ریئلٹی (Reality) کی طرف آتی ہے۔ یہ طبیعات سے مابعد الطبیعات کا سفر ہے۔ یہ صداقت اور جمالیات کی راہ ہے۔ سائنس انسانی جسم کو راحت دینے اور معلومات فراہم کرنے کی لاتعداد ایجادات کی مالک ہے لیکن تسکینِ قلب، احساسِ مروت اور روحانی اور وجدانی کیفیات کا احاطہ نہیں کرتی۔ سائنس ہمیں علم ضرور عطا کرتی ہے لیکن دانش صرف فلسفہ دے سکتا ہے۔

لیکن لوگوں کے ذہنوں پر سائنس اور ٹیکنالوجی سوار ہے۔ فلسفہ تو عضوِ بیکار ہے۔ اس پر بات کرنا بھی عجیب لگتا ہے۔"

ساجد صاحب نے ہوش مندی سے کہا۔

پروفیسر دلاور بولے" ساجد صاحب! جدید دور میں آپ کا مشاہدہ درست ہے۔ ہم سائنس سے بہت مرغوب ہو گئے ہیں۔ مشاہدہ خارجی ظاہری ہے تو مشاہدہ داخلی باطنی۔ فلسفہ پانچ قسم کے مطالعات پر مشتمل ہے۔ منطق، جمالیات، اخلاقیات، سیاسیات اور مابعد الطبیعات۔ فلسفی بھی اولیا اور شہدا ہوتے ہیں۔ فلسفہ ہمیں وہ لذت دیتا ہے جسے سیونارڈو" مسرت اور لذت فہم" کہتا ہے۔ ایمرسن کہتا ہے" تم جانتے ہو کہ سچے عالم کی پہچان اور اس کا راز کیا ہے۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی ایسا علم رکھتا ہے جو میں اس سے سیکھ سکتا ہوں۔ اس معاملے میں گویا اُسی کا شاگرد ہوں۔"

جیسے کہ میں نے کہا تھا، افلاطون کا استاد سقراط (469ق۔م) ایتھنز میں پیدا ہوا۔ وہ عظیم فلسفی تھا اور کہا کرتا تھا کہ" مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔" وہ احتساب نفس اور شعور ذات کو ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا قول ہے:

" جو شخص اپنی زندگی کا جائزہ نہیں لیتا اور اپنے نفس کا احتساب نہیں کرتا، وہ زندہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔"

سقراط ایتھنز کے نوجوانوں کے ساتھ بیٹھتا اور محبت و اخلاق کا درس دیتا۔

ایتھنز کے ارباب اختیار کو سقراط کا نوجوانوں سے ربط ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور عام طور پر اس پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق تباہ کر رہا ہے۔ مزید برآں سقراط بت پرستی کا مخالف تھا اور روایتی رسوم و عبادات ادا کرنے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک خدا کو جانتا تھا اور ایک خدا کو مانتا تھا۔ اسی بنا پر امیر لوگ اُس سے نفرت کرتے تھے۔ سقراط کا دعویٰ یہ تھا کہ ایک خفیہ باطنی آواز اسے بُرے کاموں سے منع کرتی ہے اور ہدایت دیتی ہے۔ سقراط کی صحبت میں امیروں کے بیٹے بھی بیٹھتے تھے جس سے حکام وقت کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ یہ لوگ مل کر حکومت کا تختہ نہ الٹ دیں۔ اس پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس نے تمام الزامات کی پرزور تردید کی لیکن جج صاحب اسے راستے سے ہٹانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ جب سقراط کو یقین ہو گیا کہ اسے موت کی سزا دی جائے گی تو اس نے انہیں مخاطب کر کے کہا" میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ اگر میرے جیسے شخص کو جان سے مار دو گے تو تم مجھے اتنا ضرر نہیں پہنچا سکو گے جتنا کہ اپنے آپ کو پہنچاؤ گے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ دوسروں کو قتل کر کے تم انہیں اس بات سے باز رکھ سکو گے کہ وہ تمہیں تمہاری برائی پر

ملامت نہ کریں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ فرار کا یہ راستہ عزت کا راستہ نہیں ہے۔ نہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ سب سے آسان اور سہل طریقہ یہ ہے کہ دوسروں پر جبر و تشدد کے بجائے تم لوگ خود اپنے آپ کی اصلاح کرو۔"

لیکن سقراط تو جبر کے راستے کا کانٹا تھا۔ اسے سزائے موت سنائی گئی۔ اس وقت کرپٹ معاشرے میں زندان کو رشوت دے کر فرار آسان تھا۔ سقراط کے شاگردوں نے اسے بھاگ جانے کی ترغیب دی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ سقراط ستر سال کا بوڑھا تھا۔ اس نے کہا "موت مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی اور موت کوئی ایسی شے بھی نہیں کہ اس سے دور بھاگنے کی کوشش کی جائے۔" سقراط حیات بعد از موت کا قائل تھا۔ اسے یقین تھا کہ مرنے کے بعد اس کی روح ایسے عالم میں جائے گی جہاں اس کے لیے ازلی مسرت کا سامان موجود ہے۔

موت کا دن آیا تو سب سے پہلے سقراط نے بیوی بچوں کو رخصت کیا کہ ان کی گریہ زاری اس کے آخری لمحات کو تلخ نہ کر دے۔ پھر داروغہ سے زہر کا پیالہ لانے کو کہا۔ سقراط کے شاگرد غم سے نڈھال تھے۔ سقراط نے داروغہ سے پوچھا "موت کو سہل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟" اس نے جواب دیا "آپ زہر پی کر ٹہلنا شروع کر دیں۔ جب ٹانگیں شل ہو جائیں تو لیٹ جائیے۔ زہر کا اثر ٹانگوں سے دل و جگر میں اتر جائے گا اور موت واقع ہو جائے گی۔" چنانچہ سقراط نے نہایت اطمینان سے زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور غٹا غٹ پی گیا۔ سقراط کے شاگرد بے اختیار رونے لگے۔ سقراط نے اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ جب ٹانگیں بیکار ہو گئیں تو وہ لیٹ گیا اور کہا "تم لوگ ضبط اور حوصلے سے کام لو۔ میں نے عورتوں اور بچوں کو اس لیے ہٹا دیا تھا کہ وہ رونا پیٹنا شروع کر دیں گے۔" آخر اس نے محسوس کیا کہ زہر اس کے رگ و پے میں اتر گیا ہے تو اس نے نہایت سکون سے کریٹو سے کہا "اسکلیس سے میں نے ایک مرغا ادھار لیا تھا۔ یہ قرض چکا دینا اور دیکھو بھولنا مت۔" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے ساتھ ہی موت راحت کی نیند بن کر اس کی پلکوں میں اتر آئی۔

سقراط کی شہادت کے بعد اس کے نظریاتی اساس کو افلاطون نے اپنایا۔ (Plato) افلاطون ایک جگہ لکھتا ہے: "خدا کا شکر ہے اس نے مجھے مرد بنایا، عورت نہیں بنایا اور مجھے سقراط کے عہد میں پیدا کیا۔" افلاطون ریاضی کو بہت اہم سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی درس گاہ کے سامنے کے دروازے پر یہ الفاظ کندہ کروائے:

"جو شخص ہندسہ نہیں جانتا، اندر نہ آئے۔"

افلاطون کے فلسفے کا اصل اس کا نظریۂ امثال (Idealism) ہے جس نے اس کی سیاسیات، عمرانیات، اخلاقیات اور جمالیت پر گہرے اثر ڈالے ہیں۔

اچانک رابعہ نے دروازے پر دستک دی اور چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

پروفیسر زبیر نے تعارف کروایا "یہ رابعہ ہے، میری چھوٹی بہن۔ اس نے بھی میری طرح انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہوا ہے لیکن پکوڑے بڑے اچھے بناتی ہے۔" سب ہنس پڑے۔

سب نے پکوڑے لیے اور جب رابعہ نے خوابیدہ نگاہوں سے ندیم کو دیکھا تو بس ایک لمحے کو اسے احساس ہوا۔ عجیب سا احساس۔ اس نے پلیٹ بڑھاتے ہوئے ندیم سے کہا "یہ گاجر کا حلوہ لیجیے۔ یہ بھی گھر کا بنا ہوا ہے۔" رابعہ نے محسوس کیا کہ ندیم کی آنکھیں کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ شاید ٹشو کا ڈبہ لیکن یہ بات نہیں تھی۔ وہ تجسس آمیز نگاہوں سے رابعہ کا سراپا دیکھ رہا تھا جو مشرقی لباس میں ملبوس معصومیت کا پیکر لگ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ ایک بجلی سی کوند گئی۔ ایک غیر محسوس احساس کا حصار بن گیا۔ وقت کی نبض لمحے بھر کو رک گئی اور کیوپڈ دیوتا نے اپنا تیر چلا دیا۔ ایک ۔ لمحے میں کچھ ہو گیا۔

یہ لمحہ بھی عجیب چیز ہے۔ وقت کی سب سے چھوٹی اکائی لیکن اسی ایک لمحے میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ ایک لمحہ میں محبت کا چراغ جلتا ہے تو ایک لمحہ میں نفرت کی چتا بھی روشن ہوتی ہے۔ اسی ایک لمحے کے بطن سے مسرتوں کے سوتے پھوٹتے ہیں، غم کے الاؤ جلتے ہیں۔ یہ لمحہ ایک حادثہ ہے۔ ایک تغیر ہے۔ کائنات کی ہلچل ہے۔ ستاروں کی روشنی ہے۔ کہکشاؤں کا چلن ہے۔ محبت کی قندیل ہے۔ نفرت کی دلیل ہے۔ ایک اچھا لمحہ، ایک خوبصورت گھڑی۔ ایک دلآویز ساعت مسرت کا سرچشمہ بھی ہے تو دکھ کا دریچہ بھی۔ چاہت کا گھروندہ بھی ہے، خواہشات کا ملبہ بھی ہے۔ اسی لیے تو واصف نے کہا تھا:

"اے اللہ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ برے دن، بری رات، بری گھڑی اور برے وقت سے اور آپ کے ناگہانی عذاب سے اور ہر طرح کے غصہ سے اور نعمتوں کے چھن جانے سے اور عافیوں کے پھر جانے سے۔"

ایک لمحہ بھر میں کوئی حادثہ ہوا اور جب رابعہ واپس کچن میں آئی تو اس کی سانس تیز تھی۔ دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ وجود میں عجیب سی سنسناہٹ تھی۔ ایک انجانے احساس نے

لپیٹ لیا تھا۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ وہ حیرت زدہ تھی، یہ کیا ہوا۔ ایسے تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے وجود کی شمع پگھلنے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ سے ڈر گئی۔ خوفزدہ ہو گئی۔ سالوں کی گردش نے دل کے آئینے پر جو گرد بٹھادی تھی، وہ پل بھر میں صاف ہو گئی۔ یہ عجیب تجربہ تھا۔ دل ہلا دینے والا، روح کو گرما دینے والا۔ ذات کے اندر کا سفر، ہستی کی دریافت، وجود کی نئی پہچان۔

اُدھر ندیم بھی گھائل ہوا تھا۔ ایک امریکی نوجوان، چاہتوں سے لبریز، خواہشوں کا خزانہ، مستقبل کے خوابوں میں ملبوس۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار، مغرب اور مشرق کے ملاپ کا سنگم۔ طویل قامت گلابی رنگت، تیکھے نقوش، خوبصورت آنکھیں، حسین چہرہ۔ ندیم ایک خوش شکل نوجوان تھا اور ڈارک بلیوسوٹ میں مردانہ وجاہت کا پیکر لگ رہا تھا۔ اگرچہ وہ امریکہ آزاد ماحول میں جوان ہوا تھا لیکن ساجد صاحب کی طرح پاکستانی کلچر کے قریب تھا۔ فطرتاً شریف الطبع تھا۔ اگرچہ وہ کلبوں میں جاتا تھا لیکن اس نے کبھی بھی امریکی کلچر کو نہیں اپنایا تھا۔ اس سے پہلے کالج میں امریکی لڑکیوں کے ہجوم میں رہا تھا لیکن وہ امریکہ کے کلچر اور آزاد منش معاشرے کی قباحتوں سے محفوظ رہا تھا۔ وہ اپنی امریکی ماں سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ اگرچہ امریکی عورت تھی لیکن شرافت اور وفاداری کا پیکر تھی۔ ساجد سے شادی کے بعد وہ ایک وفا شعار بیوی اور ندیم کی پیدائش کے بعد ایک شفیق ماں تھی۔ وہ بہت مخلص اور پیار کرنے والی ہستی تھی۔ اس کی تربیت نے ندیم کو بھی شرافت، دیانت اور وقار کا پیکر بنا دیا تھا۔

رابعہ نے اس کے تن بدن میں ہلچل مچادی تھی۔ وہ محسوسات کی دنیا سے آشنا ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کے من کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ محبت کی دیوی نے اسے آغوش لیا تھا۔ پہلی نظر نے اسے فتح کر لیا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک حرارت اور حرکت کو محسوس کیا۔ عجیب سا احساس، خود سے پہلی ملاقات، پہلی دریافت۔ پہلی نظر کی محبت نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ من کی دنیا آباد ہو گئی تھی۔ تن میں اضطراب کے بھنور جاگ گئے تھے۔ پہلی نظر ساون کی پہلی بارش کی طرح اسے سیراب کر گئی تھی۔ وہ بیگانگی کے صحراسے شناسائی کے سمندر میں اتر گیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا لیکن کچھ تو ہو گیا تھا۔

پروفیسر ڈالور کی آواز ندیم کو سحر کی دنیا سے حقیقت کی وادی میں لے آئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"ہاں تو ہم افلاطون کی بات کر رہے تھے۔

افلاطون نے شادی نہیں کی۔ فلسفہ ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اس کے مقالات کا شمار دنیا کے بہترین علم و ادب میں ہوتا ہے۔ مقالاتِ افلاطون میں جمہوریہ (Republic) بہت مشہور ہوئی۔ افلاطون کے نظریہ امثال (Idealism) کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ افلاطون نے کہا کہ علم عقل استدلالی (Logic and reasen) سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

افلاطون کی امثال (Doctrine of Ideas) لاتعداد ہیں۔ جس طرح خیر، صداقت اور حسن کے امثال ہیں۔ اسی طرح شر، بدصورتی اور بدی کے بھی امثال ہیں۔ سب سے اعلیٰ اور اکمل "خیر مطلق" ہے۔ افلاطون کی مختصر پانچ باتیں یاد رکھیں ورنہ افلاطون کو سمجھانے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ امثال ازلی، ابدی، قائم و ثابت ہیں۔ تغیر و حرکت صرف ظاہری عالم میں ہے۔ (2) عالم امثال کے ساتھ ساتھ مادہ بھی موجود ہے جس پر امثال کی چھاپ لگتی رہتی ہے اور ظاہری عالم کی اشیاء وجود میں آتی رہتی ہیں۔ زمان (Time) غیر حقیقی ہے یعنی وقت کا نہ کوئی آغاز تھا نہ انجام ہوگا۔ کائنات ازل سے ہے اور ابد تک اسی طرح رہے گی۔ وقت کی حرکت مستقیم نہیں ہے، دولابی ہے۔ کائنات بامعنی یعنی اس کا ایک واضح مقصد اور غایت ہے۔ موت کے بعد روح انسانی باقی رہتی ہے اور اسے اپنے اعمال کے مطابق جزا ملتی ہے۔ انسانی روح مادے کی گرفت میں آ کر قید ہو گئی ہے اور اپنے ماخذ کی طرف لوٹ جانے کے لیے بے قرار ہے۔ حسن ازل کی کشش ارواح کو ان کے مبدائے حقیقی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ افلاطون کا قول ہے "کسی انسان پر اس سے بڑی مصیبت نازل نہیں ہو سکتی کہ وہ عقل و خرد کا دشمن ہو جائے۔"

"پروفیسر صاحب ارسطو کے بارے میں کچھ بتائیے جو افلاطون کا شاگرد تھا؟" ساجد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھ لیا جبکہ پروفیسر زبیر توجہ سے سن رہے تھے۔

پروفیسر دلاور بولے "ارسطو اپنے استاد کی طرح مثالیت پسند ہے کیونکہ وہ بھی امثال (Idea) کو ازلی اور ابدی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک امثال (Ideas) مادی اشیاء سے علیحدہ یا ماورا نہیں ہیں بلکہ خود ان کے بطون (Womb) میں موجود ہیں۔ ہر شے مادے اور ہیئت یا فارم پر مشتمل ہے۔ مادہ اور ہیئت (Matter and Shape) ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خدا کائنات کا خالق نہیں، نہ وہ فرد یا شخصیت ہے۔ وہ غیر مادی ہیئت ہے۔ مقناطیسی کشش ہے جس کی طرف کائنات کھنچی چلی جا رہی ہے۔ انسان کی تمام جدوجہد اور تگ و دو حصول مسرت کے لیے ہے جو صرف نیکی اور فکر و تدبر سے میسر آ سکتی ہے۔ کردار کی پختگی کے بغیر علم بیکار ہے۔ اچھی عادتوں کو

اپنانے سے کردار مضبوط ہوتا ہے۔

ارسطو سکندر اعظم کا اتالیق تھا۔ اسے بارہ برس تک فلسفہ کی تعلیم اور اخلاق کا درس دیتا رہا۔ سکندر اعظم نے اسے ہمیشہ باپ کا درجہ دیا اور اپنا استاد سمجھا۔ وہ کہا کرتا تھا "باپ نے مجھے زندگی عطا کی لیکن استاد نے مجھے زندگی گزارنے کا فن سکھایا۔" ارسطو نے کہا "روح کوئی شے نہیں ہے جو جسم میں داخل بھی ہوتی ہے اور پھر باہر بھی نکل جاتی ہے۔ روح جسم کا فعل ہے جو جسم کے فنا ہونے پر فنا ہو جاتی ہے۔" لیکن ارسطو نے عقل فعال (Active intellect) کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ Passive Intellect فانی ہے جبکہ Active Intellect لافانی ہے۔ اسی طرح ارسطو نے شخصی بقا سے انکار کیا تھا۔ ایک جگہ ارسطو نے کہا ہے کہ جس طرح جسم کی ہیئت ہے۔ اسی طرح خدا کائنات کی ہیئت ہے۔ بعد میں ایک مسلمان پیروکار ابن رُشد نے بھی اسی بنا پر شخصی بقا سے انکار کیا تھا۔ ایک جگہ ارسطو نے کہا ہے کہ جس طرح روح جسم کی ہیئت ہے۔ اسی طرح خدا کائنات کی ہیئت ہے۔ ہمارے ہاں "صوفیہ وجودیہ" اور ابن عربی نے اس قول کو وحدت وجود کے اثبات میں پیش کیا ہے۔ ارسطو کہتا ہے جس طرح ایک صحت مند اور توانا نوجوان کے رخساروں پر از خود گلاب کے پھول جیسی سرخی آ جاتی ہے اسی طرح نیک آدمی از خود مسرت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اسی مسرت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ پرجوش شہوات و جذبات کو عقل و خرد کے تابع رکھا جائے۔ جس شخص کے جذبات عقل و خرد کی گرفت سے آزاد ہو جاتے ہیں وہ نفسانی مسرت سے لطف اندوز تو ہو سکتا ہے لیکن سچی خوشی اور مسرت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

ڈیکارٹ مشہور فرانسیسی فلاسفر تھا۔"

"رکیے پروفیسر صاحب۔" ساجد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "نشست بہت طویل ہوگئی ہے اور کچھ فلسفہ ہضم بھی آسانی سے نہیں ہوتا۔ اس لیے اب پروفیسر زبیر سے اجازت لیتے ہیں۔"

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساجد نے کہا "اگلے ہفتے میرے گھر پر کھانے پر سب تشریف لائیں۔ زبیر صاحب، اپنی بہن رابعہ کو بھی ضرور ساتھ لائیے گا۔"

ندیم نے پروفیسر زبیر سے کہا۔ "انکل اپنا ٹیلی فون یا سیل نمبر دے دیں، میں پروگرام کنفرم کر دوں گا۔" نمبر لینے کے بعد تینوں مہمان چل دیے۔ ندیم کی نظریں رابعہ کو ڈھونڈ رہی تھیں جو اپنے کمرے میں تھی اور سارتر کا ناول "Being and nothingness" پڑھ رہی تھی۔

دو دن گزر گئے۔ رابعہ کی سوچ کا محور ندیم بن گیا تھا جو اس کے تصور میں اُبھرتا تھا اور ایک ہولا بن کر غائب ہو جاتا تھا۔ رابعہ اُس کشش کے اصول کے بندھن میں تھی کہ جب کوئی انسان دوسرے انسان کے بارے میں شدت سے سوچتا ہے تو ٹیلی پیتھی لہریں (Telepathic waves) ایک دوسرے کو متصل ہوتی ہیں۔ کشش کے اصول کے تحت ہر چیز اپنی قسم کی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پیسہ پیسے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ خوشی خوشی کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور پریشانی پریشانی کو۔ اچھا اچھے کو اور بُرا بُرے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بیماری بیماری کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور صحت صحت کو۔ عقل عقل مند کو اور بے وقوفی بے وقوف کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

رابعہ ندیم کے بارے میں سوچ رہی تھی اور ندیم اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ یہی تو جادو ہے۔ آپ جس کے بارے میں بھی سوچیں گے، وہ آپ کے بارے میں سوچے گا کیونکہ انسانی دماغ سے سوچ کی لہریں نکلتی ہیں اور جس کے بارے میں سوچا جائے اس کے دماغ میں اسی فریکوئنسی سے وصول (Receive) ہوتی ہیں۔ ندیم بھی رابعہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر اس نے فون کر ڈالا۔

رابعہ بول رہی تھی۔

''ہیلو رابعہ میں ندیم بول رہا ہوں۔'' رابعہ کا لاشعور شاید اس کال کا منتظر تھا۔ اسے دلی خوشی کا احساس ہوا۔

''آپ کیسے ہیں؟'' رابعہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''میں ٹھیک ہوں اور آپ کے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ میں کل شام پانچ بجے جناح باغ میں مال روڈ والے مین گیٹ پر ملوں گا۔ خدا حافظ۔''

رابعہ نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ رابعہ کے دل و دماغ کو عجیب سے احساسات نے گھیر لیا تھا۔ ذہن جیسے ماؤف اور اعصاب شل ہو گئے ہوں۔ صرف دل کے زور سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایسی آواز اور ایسا ردھم (Rethum) اس نے پہلی بار سنا تھا۔ ایک ہلچل تھی۔ اضطراب تھا۔ گھبراہٹ تھی۔ اس کے وجود کی خاموش جھیل میں ملاقات کی پہلی کنکری نے لہریں بیدار کر دی تھیں۔ وہ لہریں جو ادب اور علم کی خاموش سطح نے دبا دی تھیں۔ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھیں۔ ایک تلاطم، ایک ہیجان۔ گومگوں کی ایک کیفیت۔ ''جاؤں نہ جاؤں، ملوں نہ ملوں۔ بھائی جان کیا

سوچیں گے، لوگ کیا کہیں گے؟''

وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے سکون کی تلاش میں، ہیجان کی نجات کے لیے نیند کی چادر اوڑھنا چاہی لیکن نیند کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ نیند تو غائب ہوگئی تھی اور ندیم حاضر ہوگیا تھا۔ وہ کیا کرے۔ اچانک دل سے ایک مدھم سی آواز آئی ''میں جاؤں گی۔'' فیصلہ ہوگیا تو اضطراب نے فرار ڈھونڈی۔ ہلچل ختم گئی، بے سکونی سکون میں بدل گئی اور نیند نے پیار کی لوری سنا دی اور وہ مدہوش ہوکر خواب کی وادی میں اُتر گئی۔

نیند بھی عجیب چیز ہے۔ ماں کی آغوش کی طرح۔ شبنم کی ٹھنڈک کی مانند۔ بادِ نسیم کے جھونکے کی طرح۔ مدھم سُروں میں گاتی ہوئی آتی ہے اور راحت کی جنت میں اتار دیتی ہے۔ شعور کو چین اور بے خودی آجائے تو لاشعور دبی ہوئی خواہشوں کو خوابوں میں بدل دیتا ہے۔ خواب سنہرے خواب۔ اپنی خواہشوں کے سمبل بن کر کبھی باغوں میں پھولوں سے ہمکنار کرتے ہیں تو کبھی خواب کی علامت بن کر Dream سے Night mare بن جاتے ہیں۔ وہ انسان ہی نہیں جو خواب نہیں دیکھتا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا "We are such stuff as dreams are made of and our little life is surrounded by a sleep" ''ہم ایسی چیز ہیں جیسے خواب بنائے گئے ہیں اور ہماری مختصر زندگی کو نیند نے گھیر رکھا ہے۔'' بقول شاعر

میں ایسے شخص کو زندوں میں کیوں شمار کروں
جو سوچتا بھی نہیں، خواب دیکھتا بھی نہیں

غالب نے خوب کہا ہے:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

دوسرے مصرعے میں غالب نے کہا ہے کہ ہم خواب ہی نہیں دیکھتے۔ خواب کے اندر بھی خواب دیکھتے ہیں۔ خواب کے اندر خواب کی Mitrex ہی اور ہے۔

رابعہ کیا خواب دیکھتی ہے کہ وہ ایک پھولوں سے لدی وادی میں گھوم رہی ہے۔ سفید لباس میں وہ پری لگتی ہے۔ صبح کا موسم ہے۔ بادِ نسیم کے جھونکے بادِ خوشی بن گئے ہیں۔ پھول اپنی خوبصورتی سے بیگانہ ہوا میں مست ہیں۔ حسن بیگانہ احساسِ جمال ہے۔ لطیف جھونکے جلترنگ کی سُروں کو چھیڑ رہے ہیں۔ ایک الہامی سکوت طاری ہے۔ خاموشی میں کلیاں چٹخ کر سرگوشیاں کر رہی

ہیں۔تتلیاں پتیوں کے رخسار چوم کر مست ہوگئی ہیں۔ دور کہیں بلبل کی آواز پھول کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہے۔ اس کا سوز منظر کو مدہوش کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فطرت کی صناعیت نے خدا کے وجود کو مظاہر قدرت میں بدل دیا ہے۔ اس کا وجود ایک خوبصورت منظر میں ڈھل کر صبح کو معطر کر رہا ہے۔ صبح کا منظر الوہی ہو جاتا ہے۔ خدا کے وجود کا مظہر بن جاتا ہے۔ بقول جوش

ہم اہل دل کی خاطر دلیل حق کے لیے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

اس منظر کے حسن میں گم رابعہ کیا دیکھتی ہے کہ ندیم ایک سفید براق پر سوار آتا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھوڑے پر بٹھاتا ہے اور حسین وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ گلاب کا پھول ہے۔ وہ پھول رابعہ کو پیش کرتا ہے تو اچانک بھائی جان کی آواز آتی ہے:

''اٹھو رابعہ! ناشتے میں دیر ہو رہی ہے۔ آج میرا پہلا پیریڈ ہے۔''

رابعہ گھبرا کر اٹھتی ہے تو اسے کمرے میں مہک محسوس ہوتی ہے۔ گلاب کے پھول کی مہک۔ اس نے سوچا، اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے۔

کالج میں رابعہ دیر سے پہنچی، اس کی سہیلیاں نائلہ اور فرزانہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''رابعہ آج لیٹ ہوگئی ہو۔ خیر تو ہے؟ پیریڈ بھی مس ہو گیا۔ کچھ لڑکیاں تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھیں اور ہاں آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر نکھار ہے۔ مسرت کی جھلک ہے۔ کیا کوئی خوبصورت خواب دیکھا ہے۔ تم سے محبت کی مہک آ رہی ہے۔ کونسا پرفیوم لگایا ہے؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' رابعہ نے شرما کر کہا اور کلاس روم میں چلی گئی۔

شام پانچ بجے ایک ہلکی گلابی ساڑھی میں ملبوس رابعہ باغ جناح کے گیٹ پر پہنچی تو ندیم اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رابعہ ہلکے میک اپ میں بہت دلکش لگ رہی تھی۔ ندیم کی پہلی نظر نے ہی رابعہ کے دل کی گھنٹیاں بجا دیں۔

''رابعہ تم وقت کی پابند بہت ہو۔ پانچ بجنے میں ایک منٹ بھی اوپر نہیں ہوا اور تم آ گئیں۔'' دونوں باغ کی پکی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا۔ یہ ایک گلابی سردی کی شام تھی۔ ہلکی سی خنکی نے ماحول کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ سامنے سفید رنگ کی پرشکوہ عمارت اپنے گوتھک تعمیر (Geothetic) کی وجہ سے ایک شاہکار لگ رہی تھی۔ اس کے پرشکوہ ستون عظمت رفتہ کی

یاد دلا رہے تھے۔ یہ عمارت ایک آرٹ کا نمونہ ہے۔ (مائیکل اینجلو) کے مجسموں کی طرح۔ ورڈز ورتھ کے شعروں کی طرح، لیونارڈو ونچی کی مونالیزا کی طرح۔

رابعہ نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا "ندیم، اس عمارت کو دیکھو۔ اس کی تعمیر کو دیکھو۔ یہ درختوں کے جھرمٹ میں سفید ستونوں پر کھڑی ہے۔ انگریزوں نے بنوائی تھی۔ اس کی آب و تاب آج بھی باقی ہے۔"

ندیم نے غور سے دیکھا تو اسے احساس ہوا، رابعہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

"واقعی خوبصورت ہے۔ لاہور میں اتنا خوبصورت باغ، یہ فوارے، یہ عمارت، بہت خوبصورت منظر ہے لیکن رابعہ آج تم بھی کسی تراشے ہوئے مجسمے کی طرح لگ رہی ہو جسے خوبصورت ساڑھی پہنا دی گئی ہو۔" رابعہ نے ورڈز ورتھ پڑھ رکھا تھا۔ اس نے کہا "ندیم سامنے درختوں کو دیکھو۔ یہ درخت بولتے ہیں۔ جذبات رکھتے ہیں۔ سنتے ہیں، روتے ہیں۔ ہم ان کی زبان نہیں سمجھ پاتے۔ یہ خود دھوپ میں جلتے ہیں، ہمیں سایہ دیتے ہیں۔ ہمیں پھل پھول دیتے ہیں۔ سب دیتے ہی دیتے ہیں، لیتے کچھ نہیں۔ ذرا سی محبت مانگتے ہیں۔ تھوڑی سی رکھوالی۔"

ندیم کو یہ باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ امریکہ میں اس نے خوبصورت گارڈن دیکھے تھے لیکن ایسی باتیں پہلے نہیں سنی تھیں۔ وہ ایم بی اے کا طالب علم تھا۔ اس نے ایمرسن کو نہیں پڑھا تھا۔ ندیم نے موضوع بدل کر کہا:

"رابعہ۔ میں پہلی نظر میں محبت کا قائل نہیں تھا۔ امریکہ میں ایسے نہیں ہوتا لیکن تمہاری پہلی نظر کا تیر میرے دل کے آر پار ہو گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟"

رابعہ خاموش رہی۔

ندیم پھر بولا "دیکھو رابعہ، محبت یکطرفہ تو نہیں ہوتی۔ یہ تو جذب باہم کا نام ہے۔ دو دلوں کی دھڑکن ہے۔"

رابعہ نے خاموشی کو توڑا۔

"دیکھو ندیم، پہلی نظر کی محبت پائیدار نہیں ہوتی۔" رابعہ کے لہجے میں خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ "یہ تو ایک وقتی جذبہ ہے۔ ایک جذباتی ہلچل، ایک ساعت کا ہیجان۔ بجلی کے چمکنے کی طرح۔ جب بادل چھٹ جاتے ہیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ خالی آسمان ہوتا ہے۔"

"مجھے پتہ نہیں۔ محبت تو محبت ہوتی ہے اور بس۔" ندیم نے آہستہ سے کہا۔

رابعہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے خود کو قابو کرتے ہوئے کہا:

''آپ امریکہ سے کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں؟''

''ایک مہینے کے لیے آیا تھا۔ آخری ہفتہ رہ گیا ہے۔ آنے والے ہفتے کی رات کو روانگی ہے لیکن میں رُک سکتا ہوں، اگر آپ چاہیں تو۔'' ندیم نے رابعہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

رابعہ عجیب سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے اندر کا دبا ہوا رومانس جاگ رہا تھا لیکن حقیقت تو سراب کی مانند تھی۔

رابعہ نے سوچتے ہوئے کہا ''آؤ اس بنچ پر بیٹھتے ہیں۔'' اور پھر اعتماد سے بولی۔

''دیکھو ندیم۔ میں ایک حقیقت پسند ہوں۔ ٹھیک ہے محبت ہو جاتی ہے اور ہمیں محبت ہو گئی ہے ورنہ میں کبھی ملنے نہ آتی لیکن میں عمر میں تم سے بڑی ہوں۔ میرا تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ میں نے تنگی دیکھی ہے، خوشحالی نہیں دیکھی۔ میں نے صرف خوبصورت زندگی کے خواب بُنے ہیں۔ اس کے اسباب تلاش نہیں کیے۔ میرا باپ پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں معمولی افسر تھا۔ میں بی۔ اے میں تھی جب ماں کینسر سے مر گئی۔ ہم اس کی زیادہ کیئر نہ کر سکے۔ میرا بھائی ایک پروفیسر ہے۔ اس نے شادی نہیں کی۔ مجھے احساس ہے میرے بغیر وہ بالکل اکیلا ہو جائے گا۔ میں ایک استاد ہوں۔ انگریزی ادب نے میرے علم میں وسعت پیدا کی ہے۔ مجھے انسانی جذبوں سے پہچان کروائی ہے۔ صرف شیکسپیئر ہی زندگی کے راز بتا دیتا ہے۔ حدیثِ جاں بیاں کر دیتا ہے۔ انسانی فطرت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

دیکھو ندیم! میں ایک مڈل کلاس کی محبوس لڑکی ہوں۔ میں مذہب، اخلاق اور روایات کی چار دیواری میں قید ہوں۔ میرے جذبے بھی جوان تھے۔

لیکن ندیم! سماجی گھٹن نے سب جزانوں کی لَو مدھم کر دی ہے۔ ابھرتی ہوئی شوخ جوانی ماں کی اذیت ناک بیماری اور موت نے برباد کر دی۔ شرارتوں کے زمانے میں سنجیدگی چھا گئی۔ قہقہوں کے دور میں آنسو بہہ نکلے۔ نوجوانی کی موجِ مستی کی جگہ درد کی صلیب اٹھانی پڑی۔ کرب کی سولی چڑھنا پڑا۔ زندگی انجانے خوف میں گزری ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ محبت سے بھی ڈر لگتا ہے۔ خوف اندر گہرائیوں میں بیٹھ گیا ہے۔ خود سے بھی خوف آتا ہے۔''

ندیم نے حیرانی سے پوچھا ''اس خوف کی کوئی وجہ تو ہو گی؟''

"ہاں ندیم۔اس خوف کی لاتعداد وجوہات ہیں۔ایک لڑکی جو ابھی بی اے کی طالب علم ہو،اس کی ماں مر جائے۔وہ بھائی کے ساتھ اکیلے رہتی ہو تو ہمارا سماج اسے جینے نہیں دیتا۔اس کا پیچھا کرتا ہے۔ہمارے سگے رشتہ داروں کی زبانی لمبی ہو جاتی ہیں۔کہانیاں بنائی جاتی ہیں۔افسانے گھڑے جاتے ہیں۔ایسی ایسی باتیں منسوب کر دی جاتی ہیں جن کا وجود بھی نہیں ہوتا۔میں سماج سے لڑ نہیں سکتی تھی۔میں نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ایم۔اے گھر بیٹھ کر پرائیویٹ طور پر کر لیا۔ایم اے انگریزی کو نوکری مل جاتی ہے۔میں لیکچرار بن کر کالج میں پڑھانے لگی اور رہا محبت کا معاملہ۔اس سے پہلے مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی۔خاندان میں کوئی کزن بھی نہیں تھا۔جب میں شادی کے خواب دیکھتی تھی۔کوئی مجھ سے شادی کے لیے رضامند نہیں ہوا۔میرے بھائی کے پاس جہیز دینے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔تقاضے بہت تھے۔وسائل کم تھے۔بس میرے پاس کاغذ کی ڈگریاں اور علم کے موتی تھے لیکن شادی کے بازار میں ان کی کوئی قیمت ہی نہیں تھی۔میں نے محبت کے خلا کو لاشعوری طور پر کتابوں سے پُر کر لیا۔اب صرف مجھے کتابوں سے محبت ہے۔ندیم آپ نے دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دی ہے۔" رابعہ جیسے پھٹ پڑی۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

شام ڈھل گئی تھی۔سائے گہرے ہو رہے تھے۔درختوں پر تھکے پرندے گھونسلوں میں آ رہے تھے۔تاریکی کی باریک چادر ہر چیز کو لپیٹ رہی تھی۔رابعہ کی باتوں نے درختوں کو بھی اداس کر دیا تھا۔ہوا تھوڑی تیز ہو گئی تھی۔شاخوں میں شور جیسے ماتم کر رہا ہو۔رابعہ کے درد نے ماحول کو سوگوار کر دیا۔شام تو وہی تھی لیکن ذہنی کیفیت ہی شعر کو آباد کرتی ہے اور درد کی کیفیت میں شعر سائیں سائیں کرتا ہے۔سب ذہنی کیفیت اور قلبی حالت ہی باہر کی دنیا کو روپ میں ڈھالتی ہے۔دل خوش ہو تو پھول بھی مسکراہٹیں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔پرندے بھی سُریلے نغمے سناتے ہیں۔کلیاں بھی معطر لگتی ہیں۔سکوت بھی بولتا ہے۔خاموشی ہمکلام ہوتی ہے۔ہوا بھی میٹھی باتیں کرتی ہے۔پتھر بھی صنم لگتے ہیں اور ستارے بھی جھومر دکھائی دیتے ہیں۔

مگر دل اداس ہو،غمزدہ ہو تو ہراس پیدا ہوتا ہے۔درخت بھوت بن کر ڈراتے ہیں۔شاخیں نکلتے ہوئے سانپوں کی طرح خوفزدہ کرتی ہیں۔حقیقت سراب بن جاتی ہے۔بقول غالب:

ہر سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

شاخ پر پھول کا پانی میں عکس سانپ بن جاتا ہے۔پھول انگارے بن جاتے ہیں۔

کلیاں سونی سونی لگتی ہیں۔ خاموشی وحشت زدہ کرتی ہے۔ سکوت ہراس پیدا کرتا ہے۔ پرندے دکھ کے نمائندے بن جاتے ہیں۔ جھیل کا خاموش پانی سیلابی ریلا لگتا ہے۔ پتھر ٹھوکر بن جاتے ہیں۔ ستارے دکھ کے استعارے بن جاتے ہیں۔

ندیم نے اٹھتے ہوئے کہا'' تھوڑی دیر سیر کرتے ہیں۔'' شاید اسے مزید تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

ندیم کا تصور اسے امریکہ لے گیا۔ اسے اپنی کلاس فیلو لڑکیاں یاد آنے لگیں۔ شوخ، چنچل، منی سکرٹ، ٹی شرٹ اور سکن ٹائٹ جینز پہنے۔ ہنستی بولتی، قہقہے لگاتیں۔ آزادی کے ثمرات لوٹتی ہوئیں۔ بوائے فرینڈز کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے، اٹھکیلیاں کرتی۔ صحت مند اور بھرپور۔ جوانی کی لذت سے آشنا۔ لَس کی دنیا میں آباد۔ نہ کوئی دائرہ، نہ کوئی قدغن۔ آزادی ہی آزادی اور ایک رابعہ، سماج کے بندھنوں کی گٹھڑی اٹھائے۔ اپنے اندر دھنسی ہوئی، کملائی ہوئی۔ خوفزدہ چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی۔

وہ حیران رہ گیا۔ ایک ہی دنیا میں اتنی تفریق، اتنا تضاد، اتنا فاصلہ۔ اسے یقین ہو گیا کہ دنیا گلوبل ویلج تو ہے لیکن اس میں تاریک غاریں بھی ہیں۔ تنگ گھاٹیاں بھی ہیں۔ تپتے صحرا بھی ہیں۔ سلگتی وادیاں بھی ہیں۔

ندیم نے ہمت باندھتے ہوئے کہا:

'' رابعہ میں نے بہت سی امریکی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ گولڈن بالوں اور گرین آنکھوں والی مگر تم سب سے مختلف ہو۔ میں نے زندگی میں لڑکی کا یہ روپ نہیں دیکھا۔ میں پہلی مرتبہ پاکستان آیا ہوں۔ میں نے تمہیں پہلی نظر میں دیکھا اور کیوپڈ وار کر گیا۔ محبت ہو گئی ہے، اب کیا کروں؟ تم سے شادی کرنے کی تمنا جاگ اٹھی ہے۔

رابعہ ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہارے دل میں بھی میرے لیے محبت جاگی ہے۔ تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔ تمہارا دل بھی ویسے ہی دھڑکتا ہے۔ کیا میرے ساتھ شادی کرو گی؟'' ندیم نے امریکہ کے سٹائل میں بے باکی سے بات کہہ دی۔

'' دیکھو ندیم! ایسی بات نہیں۔ میں بھی انسان ہوں۔ میرے اندر کی عورت زندہ ہے۔ مجھے بھی چاہے جانے کی طلب ہے۔ میرا جی چاہتا ہے، کوئی مجھے ٹوٹ کر چاہے۔ وہ میرا ہو جائے۔

میں اس کی ہو جاؤں۔ میں خود سے دستبردار ہو کر خود کو تمہارے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہی جاؤں، میں دلہن بنوں، ارمانوں کی سیج پر بیٹھوں۔ میرے ارمان پورے ہوں۔ میرے آنگن میں میرے بچوں کے نقرئی قہقہے گونجیں، میرے بھی خواب ہیں۔ خوبصورت خواب لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"تضاد۔ بہت گہرا تضاد۔ سماجی دائرے الگ الگ ہیں۔ کہاں ایک خوشحال امریکی نوجوان۔ زندگی کی توانائیوں سے بھرپور اور کہاں ایک مڈل کلاس کی پاکستانی لڑکی۔ زندگی کے بوجھ سے جھکی ہوئی۔ گھبرائی ہوئی۔ عمروں کا تضاد۔ سٹیٹس کا تضاد۔ معاشرتی اور معاشی تضاد۔ اتنے زیادہ تضادات تو ہر جذبے کو کچل دیتے ہیں۔ زندگی کوئی تاج محل نہیں۔ کوئی پھولوں کی سیج نہیں۔ یہ تو تلخ حقیقتوں کا مجموعہ ہے۔ صرف غربت اور امارت کا تضاد ہی اتنی بڑی خلیج ہے، اتنا بڑا پاٹ ہے کہ عبور نہیں ہوتا۔ اگر کہیں دیوانگی میں وقتی طور پر عبور بھی ہو جائے تو اگلے کنارے پر ایک جہنم انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ یہ اتنے گہرے فاصلے ہیں، اتنی اونچی فصیلیں ہیں کہ محبت بھی اُسے توڑ نہیں سکتی۔ یہ گہری کھائیاں محبت کو نگل لیتی ہیں۔ جب عملی زندگی کی تلخیاں آسیب بن کر ڈراتی ہیں تو آبگینوں کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ آرزوؤں کے تاج محل مسمار ہو جاتے ہیں۔ محبت کا کرب سماج کی کالی ماتا کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ محبت کا دریا جتنی تیزی سے چڑھتا ہے اتنی ہی تیزی سے اتر جاتا ہے۔ صرف بربادیوں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔"

"لیکن رابعہ! محبت تو عظیم جذبہ ہے۔ میں نے اس کی چبھن محسوس کی ہے۔ محبت تو ہمارے وجود کی سب سے اعلیٰ اور ارفع صفت ہے۔ محبت تو خدا کی سب سے خوبصورت عنایت ہے۔ یہ تو ہماری روح کا وصف ہے۔ خدا نے انسان کو محبت کے لیے پیدا کیا۔ اطاعت اور عبادت محبت ہی کے اظہار کے ذریعے ہیں۔ محبت نہیں تو عبادت بے روح ہے، محبت تو آفاقی ہے۔ میں نے سنا ہے" جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے" محبت تو دکھ کو مٹا دیتی ہے۔ مسرت کے سوتے جاری کر دیتی ہے۔ محبت تو دل کی راحت ہے۔ روح کا چین ہے۔ یہ تو ہماری جبلت ہے۔ محبت ت ہماری رگوں میں ہے۔ ہمارے خون میں گردش کرتی ہے۔ "Love knows no sorrows" یہ تو غم کی ضد ہے۔ مسرت کی امین ہے۔ شادمانی کا رقص ہے۔ مستی کی مضراب ہے، کیف کا جا ہے۔ سُرور کا پیالہ ہے۔ دل کا نور ہے۔ روح کا رقص ہے۔ دیوانگی کی بنسری ہے تو وارفتگی کا ستا ہے۔ تن کی راحت ہے تو من کی موج ہے۔ یہ ہمیں اپنے آپ سے متعارف کرواتی ہے۔ حضرت

عیسیٰ بن مریم نے کہا، اپنے دشمن سے بھی محبت کرو۔ میری محبت کی چادر میں آ جاؤ۔ میں تمہارے بوجھ ہلکے کر دوں گا۔ تمہیں اپنی محبت میں سمیٹ لوں گا۔ محبت ہی سے عرفانِ ذات ہوتا ہے۔ یہی نجات کا راستہ ہے۔ یہی نروان کا حاصل ہے۔" ندیم نے محبت کی فلاسفی بیان کر ڈالی۔

"رکو ندیم۔ محبت کی کہانی بڑی دلفریب ہے۔ یہ کائنات ہی محبت ہے اور محبت ہی کائنات ہے۔ میں اتفاق کرتی ہوں۔ محبت کی سلطنت عالمگیر ہے لیکن یہ الوہی محبت ہے۔ بہت ارفع اور اعلیٰ، یہ ملکوتی حصار ہے۔ کائناتی جذب ہے۔ دلوں کی حکمرانی ہے۔ روح کی غذا ہے۔ میں اس ارفع محبت کا ذکر نہیں کر رہی جو صوفی خدا سے کرتا ہے۔ پوجاری دیوتا سے کرتا ہے۔ میں تو دو انسانوں کی محبت کی بات کر رہی ہوں جو شادی میں بدل کر Contract بن جاتی ہے۔

Matrial obligations کا شکار ہو جاتی ہے جو Congunial ہے جو حقوق اور فرائض کا ضابطہ ہے۔ جو کسی باغ کے مسحور کن ماحول میں دو گھنٹے اکٹھے گزارنے کا نام نہیں۔ جو چوبیس گھنٹے کا تعلق ہے۔ سالوں کا رابطہ ہے جس میں غصہ بھی ہے، اختلاف بھی ہے، جھنجھلاہٹ بھی ہے، ٹینشن بھی ہے Irritation بھی ہے۔ بوریت بھی ہے۔ بقول فراز:

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جان فراز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

محبت پتھر کی طرح سخت ہے اور محبوب کے مجسمے میں ڈھل جاتی ہے لیکن شبنم کی طرح نرم ہے۔ سورج کی پہلی کرن اسے جلا دیتی ہے۔ محبت کے شبنمی قطرے روز پیدا ہوتے ہیں، روز مر جاتے ہیں۔ کبھی تمازت آفتاب سے، کبھی پاؤں کی ضرب سے۔ ان قطروں کی زندگی مختصر ہوتی ہے۔ پھولوں کی خوشبو بھی محبت ہے لیکن عمریں کتنی مختصر ہیں۔ بقول فراز:

تمہارا قرب ہے پھولوں کی مانند
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

پروانہ شمع سے محبت کرتا ہے۔ اس کا شعلہ اسے دیوانہ بنا دیتا ہے۔ وہ محبت سے دیوانہ ہو کر اس کے گرد رقص کرتا ہے اور انتہائے دیوانگی میں اس پر فنا ہو جاتا ہے۔ رقص کرتے کرتے شعلوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔

لیکن انسان کی محبت کے کئی رنگ ہیں، روپ ہیں، بہروپ ہیں۔ جذباتی استحصال کا پنجہ ہے تو فریب کا عجائب گھر۔

ندیم! بہت سے لوگ تو صرف اپنی ذات سے محبت کرتے ہیں۔ نرگس کے اس پھول کی طرح جو سطح آب پر اپنا عکس دیکھ کر اپنی ہی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اسی طرح اکثر لوگ محبت نہیں کرتے، محبت کرواتے ہیں۔ اُن میں چاہنے کی نہیں چاہے جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ دوسرے تک پہنچتے ہی نہیں، اپنی ہی ذات کے اسیر ہوتے ہیں۔ محبت کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ Possesive ہوتے ہیں۔ قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی انا کے قید خانے میں پابند سلاسل کر دیتے ہیں۔ افتخار عارف کے ان اشعار کی طرح:

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو میری وحشتوں کا ساتھی ہو
میں اس سے جھوٹ بھی بولوں تو مجھ سے سچ بولے
میرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو
میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو میری پستیوں کا ساتھی ہو
وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے
گلی گلی میری رسوائیوں کا ساتھی ہو
کرے کلام وہ مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو میرے تیوروں کا ساتھی ہو
میں اپنے آپ کو دیکھوں وہ مجھ کو دیکھے جائے
وہ میرے نفس کی گمراہیوں کا ساتھی ہو
وہ خواب دیکھے تو دیکھے میرے حوالے سے
میرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو

ایسی محبت سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ آزادی محبت سے زیادہ عظیم جذبہ ہے۔ جہاں Possession ہوگی، وہاں آزادی نہیں ہوگی۔ جہاں آزادی نہیں ہوگی وہاں محبت نہیں ہوگی۔ آپ مکان، دولت اور ساز و سامان پر قبضہ (Possess) کر سکتے ہیں انسان کو (Possess) نہیں کر سکتے۔ آپ جتنا Possess کرو گے، وہ دور بھاگے گا۔ غلام کی طرح زنجیریں توڑ کر۔ قدرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔

بات طویل ہو گئی تھی۔
ندیم بولا "میں لٹریچر کا طالب علم نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے فلسفے میں ایم۔اے کیا ہے۔تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔میں صاف بات کرتا ہوں۔مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
رابعہ بولی "ندیم مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔میں بتادوں گی۔اب مجھے چلنا ہے۔"
شام گہری اور اداس ہوگئی تھی۔درخت آسیب زدہ لگنے لگے تھے۔چلتے چلتے دونوں گیٹ تک آگئے۔ندیم نے اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن رابعہ نے کہا:
"آپ فکر نہ کریں،میں چلی جاؤں گی۔" اور وہ آہستہ سے ایک سائے کی طرح مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے تاریکی میں تحلیل ہوگئی۔
رابعہ رات کو سونے لگی تو جیسے ندیم خواب بن کر سامنے آگیا۔
وہ کہہ رہا تھا "رابعہ میں تمہاری ہاں کا انتظار کر رہا ہوں۔" رابعہ کا لاشعور اسے جاگتے میں خواب دکھانے لگا۔جو کچھ ہم سوچتے ہیں،ضائع نہیں ہوتا۔ہمارے لاشعور میں چلا جاتا ہے۔ لاشعور ہمارے دماغ کا سب سے طاقتور حصہ ہے۔یہ وہ حصہ ہے جس کے بارے میں ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ ہماری سب مافوق الفطرت اور روحانی طاقتیں اس میں موجود ہیں۔مغرب کے کچھ روحانیت والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم سب کچھ پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ہم صرف اس کا دوبارہ تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ان کے مطابق حال،ماضی،مستقبل سب کچھ روح کو معلوم ہے اور روح لاشعور کے ذریعے اپنا کام لیا کرتی ہے۔
ماہر نفسیات کہتے ہیں "لاشعور کوئی چیز نہیں بھولتا۔آپ کے پیدا ہونے سے لے کر آج تک جو آپ کے ساتھ ہوا ہے،اس کو سب یاد ہے۔"
لاشعور کو مستقبل میں ہونے والی چیزوں کا بھی علم ہوتا ہے۔حضرت آدم کو اشیاء کا علم دیا گیا تھا۔(ہر چیز کا اندرونی علم) یہ سب علم انسان کے اندر روح میں موجود ہے۔روح سے یہ علم لاشعور میں آتا ہے۔لاشعور کو ہر چیز یاد تو ہو جاتی ہے لیکن یہ اس کو ہر وقت اٹھائے نہیں رکھتا بلکہ اسے اپنے سٹور ہاؤس میں جمع کرتا رہتا ہے۔دماغ میں کل 8 ارب خلیے (Cell) ہوتے ہیں۔اس لیے کسی چیز کو یاد (Retrieve) کرنے میں اسے مشکل نہیں ہوتی۔ہر خلیہ کی یادداشت کی گنجائش بہت سی ہوتی ہے لیکن لاشعور یہ سب کچھ یاد تو رکھتا ہے مگر ان سے متاثر نہیں ہوتا۔جب تک آپ

کسی بات یا خبر سے شدید متاثر نہ ہوں، لاشعور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ وہ تصور (Imagination) کو تخلیق کرتا ہے۔ رابعہ لمحہ بھر میں نیو یارک پہنچ گئی۔

مین ہیٹن کی فٹ پاتھ پر ندیم کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔ دونوں طرف آسمانوں کو چھوتی ہوئی بلند عمارتیں۔ تیز دوڑتی ہوئی لمبی گاڑیاں۔ ایک خوبصورت جدید فلیٹ جس میں جدید ترین سہولتیں ہیں۔ بہت بڑے بڑے شاپنگ مال، فوڑ کورسیٹیں، انٹرٹینمنٹ فلوز، تیز موسیقی، رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی پلے لینڈ۔ اتنی خوبصورت بدمست زندگی، لذت سے بھرپور۔

ندیم نے پیار سے جب اس کا ہاتھ چوما تو اس کی پیاسی روح کو قرار آ گیا۔ وہ شمع کی طرح پگھلنے لگی۔ سانسوں میں حرارت پیدا ہوئی۔ کیفیت ہذیانی سی ہوگئی۔ ایک عجیب سی سنسنی لذت آمیز حرارت کے ساتھ بدن سے خارج ہوگئی اور گہری نیند نے اس پر پردہ تان دیا۔

رابعہ اُچک کر بول پڑی" انکل آپ کی شاعروں اور شاعری کے بارے میں رائے کیا ہے؟"

پروفیسر دلاور بولے" بیٹا تم انگریزی اور اردو ادب کی استاد ہو۔ اس پر تو روشنی تم خود ہی ڈال سکتی ہو۔"

رابعہ نے یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے کہا" انگریزی ادب میں یونانی شاعر ہومر (Homer) اور ورجل (Virgil) کو چھوڑ کر چاسر، ملٹن، جان ڈون اور ولیم شیکسپیئر ہیں جن میں سے سب سے زیادہ عالمگیر شہرت شیکسپیئر کو ملی جو برطانیہ کی پہچان بن گیا۔ Stradfor upon oven میں پیدا ہونے والا شاعر اور ڈرامانگار کسی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ جب وہ لندن میں تھا تو حصول رزق کے لیے ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ اس کے سارے ڈرامے ہی اپنی مثال آپ ہیں لیکن نمایاں ترین ڈراموں میں ہیملٹ (Hammlet) کنگ لیئر (King lear) Mecbeth مرچنٹ آف وینس اور دی ٹیمپسٹ (The Tempest) شامل ہیں۔ اس کے ڈراموں میں جو شاعری کے جملے ہیں وہ ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اس کا دور (1564-1616) تک ہے۔

Lord Byron نے ایک خوبصورت نظم لکھی ہے۔

There is pleasure in the path less woods.

There is a repture on the lonely shore

There is Society, where non intrudes,

By the deep sea, and music in its roar,

I love not man the less, but nature more

From these our interviews, in which I steal.

From all I may be, or have been before,

To mingle with the Uninerse and feel

What I can never express, yet cannot all conceal.

Emily Dickinson کی چھوٹی سی نظم ہے لیکن بہت خوبصورت ہے۔

I reason, Earth is short

And angursh absolute.

And many hurt,

But, what of that

I reason, we could die

the best vitality

cannot excel deay,

But what of that?

I reason, that in Heaven.

Some how, it will be even

some new equation given

But, what of that?

Alexande Pope کی نظم "Solitude" کا آخر Stanza بہت خوبصورت ہے۔

Thus let me live, unseen, unknown

Thus unlamented let me die,

Steal from the world, and not a stone.

Tell where I lie

Ogoden Nash کی چھوٹی سی نظم ہے:

The Ant.

The ant has made himself illustrious

Through Constant industyr industious,

so what?

would you be calm and placid.

If you are full of formic acid

Sylvia Plath کی نظم "Mirror" کی پہلی چار لائنیں بہت خوبصورت ہیں۔

I am silver and exact. I have no preconceptious. whatever I see I swallow immediately. love or dislike, I am not cruel, only truthful.

رابعہ نے روانی سے بولتے ہوئے ندیم کو دیکھا جو اس کی انگریزی زبان کی ادائیگی اور یادداشت پر حیران ہو رہا تھا۔ رابعہ نے کہا، جان کیٹس (John Keats) کی Odes بہت مشہور ہیں۔ میں آپ کو اپنی پسندیدہ Ode سناتی ہوں:

There won't be anything but all the fresh air,

appels carried on the wind,

the succvlent book in the woods:

and there when the carvatious breathe we will begin.

to make ourselves a clothing something to last

through the eternity of a victorious kiss.

when to the sessions of sweet silent thought

I summon up remembrance of things past,

I sigh the lack of many a thing I sought,

And with old woes new wail my dear time's waste

then can I drown an eye, unus'd to flow,

For precious friends hid in death's dateless night,
and weep a fresh love's long since can called woe,
And moon the expense of many a vanished sight,
Then can I grieve at griveances foregone,
And heavily from woe to woe tell o'er
The sad account of fore-be moaned moan,
which I new pay as if paid before.
But if the while I think on thee, dear friend,
All losses are restored and sorrows end.
when I have fears that I may cease to be
Before my pen has gleened my teeming brain.
Before high filed look in charactery,
Hold like rich garnere, the full ripened grain,
when behold, upon the night's starred face,
Huge cloudy symbols of a high romance
ant think that I may never live to trace,
Their shadows, with the magic land of chances
And when feel fear creator on our hour,
That I shall look upon thee more,
Never have relish in the fairy power
of unrelenting love then on the shore
of the wide world I stand alone and think.
Till love and fame to nothingness do sink.

Johan Drydon نے بہت خوبصورت نظم کہی ہے جو انسانی خوشی کا راز بتاتی ہے۔

Human happines:

In wishing nothing we enjoy still most

for ever our wish is in possession, lost;

Restless we wander to a new desire,

And burn ourselves by blowhig of the fire,

we toss an turn about, our case must come by lying stills.

For all the happiness mankind can gain.

Is not in pleasure, but in rest from pain.

William Butler yeats کی چھوٹی سی نظم A Drinking song

wine comes in at, the mouth

and love comes in at the eye,

thats all we shall know for truth

before we grow old and die

I lift the glass to may mouth

I look at you and sigh.

Lord byron کی نظم She walks in beauty کا پہلا Stanza بہت خوبصورت ہے:

She walks in beauty, like the night

of cloud less climes and starry skies,

And all thats best of dark and bright

meet in her aspect and her eyes;

Thus mellowed to that tender light which heaven to gaudy day deines.

P.B.Shelley کی مشہور نظم Love's Philosophy ہے

The fountains mingle with the river

and the rivers with the ocean.

The winds of Heaven mix for ever
with a sweet emotion
Nothing in the world is single. all things by a law divine.
in our spirit meet and mingle
why not I with thine.
See the momtains kiss high Heaven
and the waves clasp one another
no sister flower would by forgiven
if it dismamed its brother;
And the sun light clasps the earth
and the moon-beams kiss the sea;
what is all this sweet work worth
if thou kiss not me?

رابعہ نے مزید کہا "لارڈ بائرن کی یہ خوبصورت نظم مجھے بہت پسند ہے۔ ندیم صاحب آپ غور سے سنیے گا۔"

When we two parted
in silence and tears,
Half-broken hearted
to sever for years.
Pale grew thy cheek and cold.
colder thy kiss-
Truely that hour fore told
sorrow to this-
The dew of the morning.
sank chill on my brow.

I felt like the warning

of what I feel now

thy vows are all broken,

and hight in thy fame:

I hear thy name spoken

and share in its shame.

W.B.yeats کی نظم When you are old کا پہلا Stanza بہت خوبصورت ہے۔

When you are old.

When you are old and grey and full of sleep,

And nodding by the fire, take down this Look,

And slowly read, and dream of the soft look

Your eyes had once, and of their shadows deep:

جان کیٹس (Keats) کی نظم A Thing of beauty کا پہلا Stanza سنا دوں۔ انکل دلاور! آپ بور تو نہیں ہو رہے؟"

"نہیں بیٹا۔ مجھے ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ یہ تو ابدی حقیقتوں کا خوبصورت اظہار ہے۔"

رابعہ نے ندیم کی طرف دیکھا جیسے اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہو۔

A thing of beauty is a joy for ever.

its lovliness increases, it will never

pass into nothingness, but still will keep

A lower quiet for us, and a sleep

full of sweet dreams, and health, and quiet breathing

Lord Tennyson کی Tears idle tears بھی بہت مشہور ہے۔

Tear idle Tears.

Tears idle tears, I know not what they mean?

Tears from the depth of some divine despair

Rise in the heart, and gather to the eyes.

رابعہ نے بات سمیٹتے ہوئے کہا:

شیکسپیئر کے ان الفاظ سے میں اپنی بات ختم کرتی ہوں جو Hammlet میں ادا ہوئے ہیں:

To be or not to be that is the question?

ندیم نے کہا" انگریزی شاعری تو رابعہ نے بڑی خوبصورتی سے سنا دی لیکن اردو ادب میں شاعری کا اونچا مقام ہے۔ وہ بھی سنائیے۔"

رابعہ نے بھائی زبیر کی طرف دیکھا۔

زبیر نے کہا" اردو میں عظیم ترین شعرا پیدا ہوئے ہیں جن میں قدیم بھی اور آج کے عہد جدید کے بھی ہیں۔ میں ترتیب سے چند عظیم ترین شاعروں کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔"

سب نے کہا۔ ارشاد۔

سب سے پہلے آغاز میر تقی میر سے کروں گا:

کہتے ہیں:

ے ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

ے لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ے نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ے میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

پھر ساجد صاحب شاعروں کے امام اسداللہ خان غالب کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔

زبیر صاحب:" غالب تو عالمگیر شاعر ہے۔ اس کا نام تو پوری دنیا میں مشہور ہے۔"

زبیر صاحب بولے: "تو پھر کچھ شعر سنیے۔ خودی کا عجب اظہار ہے۔"

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہستی کے بارے میں کہتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

اور معرفت کے اشعار

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
ہے پرے سرحد ادراک سے میرا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ابراہیم ذوق کا یہ شعر بھی خوبصورت ہے:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر بھی لافانی ہے:

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

علامہ اقبال بھی لاجواب شاعر تھے:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

جرأت رندانہ ملاحظہ ہو:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہیں:

تو بچا بچا کہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

جگر مراد آبادی بھی خوب شاعر تھے:

موت کیا ایک لفظ بے معنی
جس کو مارا حیات نے مارا
گلشن پرست ہوں میں، مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

جوش تو ایک دبستاں تھے ،ان کا ایک خوبصورت شعر حاضر ہے۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو قبول حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے توصبح کافی تھی

حفیظ جالندھری ہمارے قومی ترانے کے خالق بہت اچھے شاعر تھے۔

ہاں میں تو لیے پھرتا ہوں اک سجدۂ بے تاب
ان سے بھی تو پوچھو وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں
بے موسیٰ کا شغل تھا اپنی نماز میں
فصلِ بہار آگئی مے نوش ہو گئے
بتوں کا نام کیوں لیتی ہے دنیا
مجھے میرے خدا نے مار ڈالا
ذوق نگاہ کے سوا شوق گناہ کے سوا
مجھ کو بتوں سے کیا ملا، مجھ کو خدا نے کیا دیا

تمنا دیکھیے:

اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی
ہمیشہ وصال ہی کی رات ہوتی

غالب کے بعد سب سے بڑا شاعر فیض احمد فیض ہے جس نے عصر جدید کے شاعروں پر ان گنت نقوش چھوڑے ہیں۔

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے
غم جہاں ہو غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

ساغر صدیقی مجذوب شاعر:

آؤ اک سجدہ کروں عالم بدمستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں
نظر کی جولانیاں نہ پوچھو نظر حقیقت میں وہ نظر ہے
اٹھے تو بجلی پناہ مانگے جھکے تو دنیا خراب کر دے

احسان دانش شکوہ کرتے ہیں:

میری محبت عقیدتوں میں پرستشوں کی حدوں سے گزری
مگر وہ یوں بے نیاز مجھ سے کہ جیسے میرا خدا نہیں ہے

عبدالحمید عدم اپنی طرز کے واحد شاعر ہیں۔

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی
ایک ہستی ہوئی پریشانی
ہائے کیا زندگی ہماری ہے

اے عدم سب گناہ کر لیکن
دوستوں سے ریا کی بات نہ کر

بس ایک داغ سجدہ مری کائنات
جبیں تری آستانے ترے

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کتنا طویل تھا

موت سے زیست کا شعلہ کہاں بجھتا ہے عدم
صرف احساس کو ایک نیند سی آجاتی ہے

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

دنیا تیرے وجود کو کرتی رہی تلاش
ہم نے ترے خیال کو یزداں بنا دیا

مجید امجد کی ندرتِ خیال دیکھیے:

کیا روپ دوستی کا کہ رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

اور اب یہ کہتا ہوں یہ جرم تو روا رکھتا
میں عمر اپنے لیے بھی تو کچھ بچا رکھتا

اور ناصر کاظمی:

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا

جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
چھوڑ گئے جب سارے ساتھی
تنہائی نے ساتھ دیا تھا

ظہیر کاشمیری:

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے
ہمارے دور کے انسان خود اپنی ہی ضد نکلے
طلب ماضی کی ہوتی ہے، قدم فردا میں رکھتے ہیں

احمد ندیم قاسمی، فیض کے بعد سب سے بڑا شاعر:

یاد آئے تیرے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی
چاند جب دور افق سے نکلا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی
جس بھی فنکار کے شاہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا
کتنی حساس خاموشی ہے
سوچوں بھی تو رات گونجتی ہے
نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا خدا کہلایا
اس کے اندر کوئی فن کار چھپا بیٹھا ہے
جانتے بوجھتے جس شخص نے دھوکا کھایا
مت مانگ دعائیں جب محبت
تیرا میرا معاملہ ہے
اے خدا اب تیرے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

مری نگاہ میں وہ پیڑ بھی ہے بدکردار
لدا ہوا ہو جو پھل سے مگر جھکا ہی نہ ہو

اس قدر پیار ہے انسان کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

قتل کے حادثے سے کم تو نہیں
پھول کا شاخ سے جدا ہونا

سیف الدین سیف ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔

شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آ سکیں
وہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے

سیف زمانہ سمجھاتا ہے
کون اپنے ہیں کون پرائے

سیف اس زندگی کو کیا کہیے
ایک میت بدوش ہستی ہے

کیا قیامت ہے ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

قتیل شفائی کی شعلہ بیانی دیکھیے:

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

میں خودکشی کے جرم کا کرتا ہوں اعتراف
اپنے بدن کی قبر میں کب سے گڑا ہوں میں

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا

گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

اک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس

یہ آپ ہیں تو آپ پہ قرباں جائیے

مصطفیٰ زیدی ایک بیوروکریٹ لیکن حساس شاعر:

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی
دنیا تو لطف لے گئی میرے واقعات میں
میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم مرا ترجماں نہیں ہے
انہیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے
جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی
کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا
آنکھ جھک جاتی ہے جب بند قبا کھلتے ہیں
تجھ میں اٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے
شاعر و نغمہ گر و سنگ تراشو دیکھو
اس سے مل لو تو بتانا کہ حسیں تھا کوئی
دل کے رشتے عجیب ہوتے ہیں
سانس لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں

احمد فراز شاعری کا ایک دیوقامت شخص، شعریت سے بھرپور ایک دلکش اور روح پرور

کلام:

کیا رخصت یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی
تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ
تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

وہ خار خار ہے شاخ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

تمام شہر ہے مقتل اسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اسی کو دعائیں دیتا ہے

فراز کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے وفا ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ میں تیرا نہ تھا اور تو میرا نہ تھا

مرے جھوٹ کو کھولو بھی اور تولو بھی تم
لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے

محسن بھوپالی نے خوب کہا:

پیکر ذات سے باہر نکل کر دیکھو
کتنے ذرے ہیں کہ سورج کا پتہ دیتے ہیں

کس کرب آگاہی میں گزاری ہے زندگی
لمحہ بھی میرے واسطے یوم حساب تھا

طفیل ہوشیارپوری:

کتنی حیرت ہے کہ حالات کا خالق انساں
زد پہ حالات کی آجائے تو مر جاتا ہے

حمایت علی شاعر:

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھ پہ ہے مہرباں

دیوان کی یہ چھاؤں تو سورج کے ساتھ تھی

اور پھر ایک تخلیقی شاعر منیر نیازی:

اپنی ہی تیغ ادا سے آپ گھائل ہو گیا
چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہو گیا
ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا
میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا
کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے
سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتے

سجاد باقر رضوی:

خواہش پہ مجھے ٹوٹ کے گرنا نہیں آتا
پیاسا ہوں مگر ساحل دریا پہ کھڑا ہوں

افتخار عارف:

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں، ہم کیا، ہماری ہجرت کیا
مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے
میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
ہجر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
تم سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں
سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ ڈوبتے وقت

کسی کو ہم نے مدد کے لیے پکارا نہیں
میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر مرا رب
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے

محسن نقوی:

پتوں سے بھر رہے تھے ہواؤں کی جھولیاں
گرتے ہوئے شجر بھی سخی انتہا کے تھے
میں جاں بہ لب تھا پھر بھی اصولوں پہ اڑ گیا
بجھتا ہوا چراغ ہواؤں سے لڑ گیا
مخالفتوں سے تو ممکن ہے دوستی اپنی
منافقتوں سے مگر اتحاد کیا کرتا
بچھڑا تو دوستی کے اثاثے بھی بٹ گئے
شہرت وہ لے گیا مجھے رسوائی دے گیا

اور آخر میں پروین شاکر:

تیری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کر ناچتا ہے
تو بدلتا ہے تو بے ساختہ مری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتی ہیں
اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک پھیل گئی تاثیر مسیحائی کی

سب یک زبان ہو کر بولے:

''رابعہ بیٹا آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ کے حافظہ کی جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے۔''

ندیم تو حیرت سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا: رابعہ فنون لطیفہ، ادب و شاعری کا پیکر ہے۔ اتنی اعلیٰ ذوق کی لڑکی کے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہوگا لیکن دل نے تسلی دی۔

پروفیسر دلاور نے وہیں سے بات شروع کرتے ہوئے کہا: ''فرانسیسی مفکر روسو نے کہا

تھا "Man is born free but he is every where in chains." ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔'' ہتھکڑیوں کو کوئی برداشت نہیں کرتا، چاہے وہ محبت ہی کی کیوں نہ ہوں۔''

ہفتے کی شام آٹھ بجے رابعہ اور پروفیسر زبیر کھانے کی دعوت پر ساجد صاحب کے گھر میں داخل ہوئے تو گھر کی (Interior Decoration) نے دونوں کو حیران کر دیا۔ ندیم نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔

''آیئے۔ پروفیسر ولاور تشریف لا چکے ہیں۔''

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی پروفیسر ولاور اور ساجد صاحب نے اٹھ کر استقبال کیا۔ سب قیمتی صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ڈرائنگ روم میں قیمتی کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس بڑی مہارت سے سجائے گئے تھے۔ بہت بڑا اور قیمتی مخملیں قالین پاؤں کو راحت کا احساس دے رہا تھا۔ ایک باوقار اور خوبصورت ڈرائنگ دیکھ کر رابعہ کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔

ساجد صاحب نے ہنستے ہوئے کہا'' کھانا تو دس بجے ملے گا۔ پہلے اس دن کی ادھوری بات ہو جائے۔ اس دن آپ نے ڈیکارٹ کے بارے میں بات شروع کی تھی۔''

پروفیسر زبیر نے بھی ہاں کہتے ہوئے پوچھا۔''ڈیکارٹ عظیم عالم تھا۔ میں بھی اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

پروفیسر ولاور بولے'' تو پھر سنیے۔

ڈیکارٹ ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کا فلسفہ میکانگی ہے۔ وہ کہتا ہے کائنات چند ایسی اشیاء پر مشتمل ہے جن کو خدا نے بنایا اور ان میں حرکت رکھی۔ یہ اشیا مقررہ میکانگی کے قوانین کے تحت حرکت کرتی ہیں۔ اس لیے ان قوانین کو سمجھ کر ہم کائنات کی قوتوں پر قابو پا سکتے ہیں۔

وحدت الوجود کا مبلغ شیوزا (Spinoza) ڈیکارٹ کی مادے اور ذہن کی دوئی سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا، حقیقت ایک ہے۔ پھیلاؤ اور فکر اسی کی صفات میں یہ حقیقت واحدہ تمام کائنات پر محیط ہے اور اسے خدا کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت خود ہی ہر شے ہے۔ اس سے علیحدہ کسی چیز یا شے کا وجود نہیں ہے۔ یہ خود ہی اپنا سبب ہے اور لامحدود ہے۔ بیکن (Bacon) کا ایک قول ہے'' ہم شریعت خداوندی کی پیروی پر مجبور ہیں۔ اگر چہ ہمارا ارادہ اس سے اختلاف کرتا ہے۔ ہم کتاب مقدس پر ایمان لانے پر مجبور ہیں۔ اگر چہ ہماری عقل کو جھٹکا لگتا ہے۔''

Renaissance تحریکِ احیائے علوم نے عقلیت پسندی (Reasoning) کو فروغ دیا۔ انگلستان میں ہیوم (David Hume) اور گبن (Gibbon) اس کے نمائندے تھے۔ فرانس میں یہ تحریک زیادہ شدت سے پھیلی جسے French Enlightment کہتے ہیں۔ اس تحریک کا مبلغ مینٹگو (Montasque) بونے، ہولباخ، کباے اور لامتری مشہور ہوئے۔ ان سب کا سرخیل والٹیئر (Voltaire) تھا اور روسو علم و روشنی کے مینار تھا۔ روسو نے اپنی مشہور کتاب "Confessions" میں ایک نیا معاہدہ عمرانی پیش کیا۔ والٹیئر نے بڑی بے رحمی سے اہلِ مذہب کی ریاکاری، دکان آرائی اور زہد فروشی کے پردے چاک کیے۔ اس کی کتاب "Philosophic Dictionary" ایک مدلل کتاب ہے۔ والٹیئر کو لڑائی سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتا ہے "جنگ مہلک ترین جرم ہے۔ اس کے باوصف ہر شخص جو اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے انصاف کی آڑ ضرور لیتا ہے۔ انسان کو ہلاک کرنا قانوناً جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاتلوں کو عبرتناک سزا دی جاتی ہے۔ ہاں اگر قاتلوں کی تعداد بہت زیادہ ہو اور وہ ڈنکے کی چوٹ پر ہلاکت آفرینی میں مصروف ہوں تو انہیں سزا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" والٹیئر انسان کے بارے میں کہتا ہے "ماں کے رحم میں بچے کی حالت وہی ہوتی ہے جو نباتات کی ہوتی ہے۔ عالمِ طفلی میں انسان میں ایک حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بیس سال کے بعد بلوغت کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور عقل کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ انسان کی ساخت کا معمولی سا علم حاصل کرنے کے لیے بھی تیس صدیاں درکار ہیں۔ اس کی روح کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہو تو عمرِ نوح درکار ہو گی۔ اس کے باوصف انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے۔ آناً فاناً ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ والٹیئر نے نیک اعمال کی مثالیں پیش کیں۔ عفو و درگزر کا درس دیا۔ ایک میاں بیوی جب چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے تو والٹیئر کے قدموں پر گر پڑے۔ والٹیئر نے انہیں شفقت سے اٹھایا اور کہا "جھکنا صرف خدا کے آگے زیب دیتا ہے۔ میں نے تمہیں معاف دیا۔" وہ تیراسی (83) سال کی عمر میں موت سے لڑتا ہوا خدا کو پیارا ہو گیا تو اس کے تابوت پر یہ کلمات درج تھے "وہ ذہنِ انسانی کا بہت بڑا محرک تھا۔ اس نے ہمیں آزادی حاصل کرنے کے قابل بنایا۔" اس کی لوحِ مزار پر یہ الفاظ تھے:

"یہاں والٹیئر محوِ خواب ہے۔"

پروفیسر زبیر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "امانوئل کانٹ اور جرمن تصوریت (Idealism) کے بارے میں کچھ بتایئے۔

ندیم نے رابعہ کی طرف دیکھا جو بڑی دلچسپی سے گہری فلاسفی سن رہی تھی۔ اس نے بھرپور نظروں سے رابعہ کو دیکھا۔ اچانک آنکھیں ٹکرائیں تو شرارے پھوٹنے لگے۔ خدا نے انسان کو آنکھوں کی شکل میں ایک حسین اور لاجواب تحفہ دیا ہے۔ آنکھیں صرف دیکھتی ہی نہیں، آنکھیں بولتی ہیں، آنکھیں سنتی ہیں۔ وہ جذب کرتی ہیں اور جذب ہو جاتی ہیں۔ وہ جھیل سے زیادہ گہری ہوتی ہیں۔ ڈبو دیتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں۔ بدن بولی (Body Language) میں سب سے زیادہ نمایاں آنکھیں ہیں۔ آنکھیں انسان کے اندرونی وجود (Inner self) کی کھڑکیاں ہیں۔ ذات کے دریچے ہیں۔ آنکھوں سے محبت کے پیالے بھی چھلکتے ہیں اور نفرت کے انگارے بھی برستے ہیں۔ ایک مقناطیسی قوت سے بھرپور نظر التفات اور دلفریب نگاہ کائنات سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ دنیا کا واحد اثاثہ بن جاتی ہے۔ فیض نے خوب کہا:

"تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟"

آنکھیں کبھی کائنات کی طرح پھیلتی ہوئی اور کبھی ارتکاز کے نقطے کی طرح سمٹی ہوئی۔ اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں اور نمناک آنکھیں آنسو بھری آنکھ۔ آنسو آنکھ ہی کا عطیہ ہے۔ آنسو جو جذبات کی بوند ہے، غم کا استعارہ ہے۔ دکھ کا دیباچہ ہے۔ آنسو تو موتی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ بقول شاعرہ:

میں نے اس شخص سے آنسو کی وضاحت چاہی
جس کو موتی کے پرکھنے کا سلیقہ بھی نہیں

اشکِ ندامت گناہوں کو ایسے دھو دیتا ہے جیسے بارش فضا کو نہلا دیتی ہے۔ خدا کی سب سے پسندیدہ چیز اشکِ ندامت ہے جو واپس اپنے معبود کی طرف پلٹ آنے کی گواہی دیتا ہے۔ جو توبہ کا دروازہ ہے۔ جو بخشش کا کاسہ ہے۔ جو اطاعت کی مناجات ہے اور عبادت کی روح ہے۔ ایک مقامی شاعر نے اشک کا کیا خوبصورت استعمال کیا ہے۔

وہ اشک یعنی کہ میری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

اس وقت رابعہ اور ندیم کی آنکھیں محبت کے جذبات میں ڈوب گئیں۔ رابعہ ایسے ساکت تھی جیسے مجسمے میں ڈھل گئی ہو۔ ایک بت، ایک پتھر کی طرح۔ امجد اسلام امجد کی نظم کی مانند:

وہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے

محبت اسے تراش لے تو وہی صنم ہے
عقیدت اسے تراش لے تو وہی خدا ہے
وہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے

اور پتھروں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ کئی رنگ ہیں۔ کئی روپ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا:

ریت سے بت نہ بنا رے میرے اچھے فنکار
اک ذرا ٹھہر کہ میں تجھے پتھر لا دوں
سرخ پتھر جس دل کہتی ہے بے دل دنیا
اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کا نیلا پتھر

پروفیسر دلاور کی بھاری بھرکم آواز نے سارا سحر توڑ دیا۔ وہ کہہ رہے تھے:

''ڈیکارٹ کی بات شاید ادھوری رہ گئی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بچپن سے ہی ہر وقت سوال پوچھتا رہتا تھا۔ ڈیکارٹ کی فلسفیانہ بنیاد تشکک (Scepticism) پر ہے۔ اس نے ہر چیز کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا۔ اس نظریہ کو کارٹیشن شک (Cartesian doubt) کہتے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ''میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں۔''

اس کے خیال میں وہی شے صداقت کی حامل ہوتی ہے جو اتنی ہی واضح ہو جتنا کہ اس کا وجود یقینی ہے۔ اس کا وجود بلاشبہ ہے اور اس کے وجود کا جوہر ذہن ہے۔ جو سوچتا ہے اور شک کرتا ہے۔''

ڈیکارٹ کے نظام فکر کی بنیاد مشاہدہ نفس پر ہے۔ اس نے کہا کہ ''میں سوچتا ہوں'' دنیا کی سب سے ٹھوس حقیقت ہے۔

عمانوئیل کانٹ جب ہوم کے تشکک اور لادینی نظریات سے بیدار ہوا جس نے عقلی استدلال (Logical reason) کو بے تصرف اور بیکار قرار دے دیا تھا۔

کانٹ نے عقلی استدلال اور مذہب دونوں کا دفاع کیا۔ اس نے کہا، ذہن انسانی منتشر حواس کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذہن ایک فعال قوت ہے جو حسی عناصر پر آزادانہ عمل کر کے انہیں علم میں منتقل کرتی رہتی ہے۔ بعض قواعد تجربہ اور مشاہدے سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ مثلاً دو اور دو چار ایسی اٹل حقیقت ہے جو شخصی مشاہدے سے بے نیاز اور بالاتر ہے۔ کانٹ نے چار تضادات کا ذکر کیا ہے جس میں سے ہر ایک مثبت اور منفی پر مشتمل ہے۔ ان تضادات

سے ہیگل متاثر ہوا تھا۔اس کی جدلیات(Dialectic) انہی اصولوں پر وضع کی گئی ہے۔

پروفیسر زبیر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا" دلاور صاحب ہیگل میرا پسندیدہ جرمن فلاسفر ہے۔اس کے بارے میں ذرا بتایئے۔"

" زبیر صاحب! اوائل عمر میں ہیگل تصوف کی طرف مائل تھا جس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وجود مطلق(Absolute Reality) سے کسی شے کے علیحدہ ہونے کا تصور غیر حقیقی ہے اور ماسوائے "کل" کے کوئی شے حقیقی نہیں ہو سکتی۔ ہیگل کے نزدیک کل یا عین مطلق (Absoulate Power) ہی حقیقی ہے۔تنوع، کثرت اور انفرادیت سب غیر حقیقی ہیں۔ہیگل کے خیال میں نیچر، ذہن یا عقل ایک ہیں۔ہیگل کے خیال میں فلسفے کا منصب بھی یہی ہے کہ نیچر کو سمجھا جائے اور اس میں عقلی استدلال(Logical reason) کا سراغ لگایا جائے۔ عالم جامد نہیں بلکہ حرکت میں ہے۔اسی طرح فکر اور عقل بھی حرکی ہیں۔ہیگل کہتا ہے کہ کائنات ذہن کا ارتقا ہے۔نیچر سے عین مطلق یا "خدا" کی طرف عالم طبعی کا اور ذہن انسانی میں ہر جگہ تدریجی انکشاف کا عمل جاری ہے جسے اس نے جدلیاتی(Dialetical) یا تضاد کا نام دیا ہے۔(1)Thesis۔ (2)Anti Thesis اور Synthesis کا نام دیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ ہر شے اپنی ضد کی طرف مائل ہو رہی ہے۔اس "کل" میں جو ارتقا ہو رہا ہے۔وہ جدلیاتی عمل سے ہو رہا ہے۔ پہلے ہم ایک شے کا انکشاف کرتے ہیں جسے مثبت(Thesis) کہا جائے گا۔پھر ہم اس کی ضد معلوم کرتے ہیں یعنی نفی(Anti thesis) ان دونوں کا اتحاد عمل میں آتا ہے جو Synthesis بن جاتا ہے۔یہ اتحاد synthesis جب کچھ دیر قائم رہتا ہے تو Thesis بن جاتا ہے۔یہ عمل اسی طرح جاری رہتا ہے۔ جدلیات کا یہ عمل فکری ہے کیونکہ کائنات فکر ہے اور فکر ہی کے قوانین کے تابع ہے۔جس طرح ہم فکر کرتے ہیں اسی طرح کائنات کا ارتقا ہوا ہے۔ یہ تمام عمل ایک "فکری کل" (Absolueo Thought) ہے جس میں نیچر اور انسان ایک ہیں۔جو عمل انسانی ذہن میں ہوتا ہے، وہ نیچر میں بھی پایا جاتا ہے۔نیچر میں یہ عمل لاشعوری ہوتا ہے۔جیسا کہ پودے کا پھول لانا۔ انسان میں یہ عمل شعوری ہوتا ہے اور انسان جانتا ہے کہ وہ ارتقا پذیر ہے۔یہی عمل ارتقاء ہر کہیں جاری ہے۔ہیگل کے ہاں کائنات "کل" ہے جو ایک فکری عمل ہے اور ایسے ہی ارتقا پذیر ہے جیسے کہ فکر کا ارتقا ہوتا ہے یعنی Thesis، Anti Thesis اور Synthesis یعنی مثبت، منفی اور اتحاد۔ یہ اس کی مثالیت(Idealism) ہے جو اپنی انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ہیگل کی فلاسفی کا نچوڑ یہ ہے:

-1 صرف ذہن ہی موجود ہے۔
-2 صرف ذہن ہی حقیقی ہے۔
-3 ذہن مادی کائنات کا خالق ہے۔
-4 جیسا ذہن انسانی ہے، ویسی ہی کائنات بھی ہے۔
-5 ذہن کسی نہ کسی صورت میں فطری مظاہر میں جاری وساری ہے۔
-6 کائنات ایک عظیم ذات ہے۔
-7 کائنات بامعنی (Meaningful) ہے۔ اس میں ایسے معانی ہیں جو معروضی ہیں اور جن کا انکشاف ہم کر سکتے ہیں۔ اگر کائنات میں معروضی معانی ہیں تو حقیقت کی تہہ میں کسی نہ کسی نوع کی ذہنی حیات کو ماننا پڑے گا۔

جرمن مثالیت پسندوں (Idealism) کا یہی نقطۂ انتہا ہے۔ ہیگل زور دے کر کہتا تھا: "That the real is rational and the rational is real." یہ نقطۂ نظر اس بات پر لے جاتا ہے کہ "What ever is, is right." ہیگل کے نظریات کے خلاف شدید ردعمل ہوا جس نے مستقل فکری تحریکوں کی صورت اختیار کر لی۔ کیرک گرد، فوئر باخ، ہربارٹ، ولیم جیمز اور کارل مارکس کے فلسفے اس ردعمل کی مختلف صورتیں ہیں۔''

ساجد صاحب جو انتہائی سنجیدہ گفتگو سے بور ہونے لگے تھے، اچانک بولے:

''پروفیسر صاحب! اگرچہ آپ کا مغربی فلاسفی کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور آپ عقل و خرد کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔ فلاسفروں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دھاگے کی ایسی گتھی کو سلجھا رہے ہیں جس کا کوئی دوسرا سرا ہی نہیں ہے۔ ہم فلسفے کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے ہیں۔''

''نہیں ساجد صاحب، کچھ فلاسفروں نے انسانی فکر کے دھارے کو تبدیل کر دیا۔ روسو کی تعلیمات انقلاب فرانس کا باعث بنیں۔ ہٹلر نے ہیگل کے فلسفے سے بنیاد نکالی اور نازی ازم کا پودا لگایا۔ کارل مارکس اور اینجل (Eagel) ہیگل کی تعلیمات نے روسی انقلاب کو جنم دیا۔ جے ایس مل نے برطانیہ میں اظہار آزادی کی بنیاد رکھی۔ فلسفیوں ہی کے زورِ فکر (Magna Carta) سے نیا معاہدہ عمرانی ہوا۔ برٹرینڈ رسل نے عقل پرستی کی بنیاد رکھی اور اپنی کتاب "Why I am not Christian" میں عقلی بنیادوں پر مذہب کی دھجیاں اڑا دیں۔''

''انکل کارل مارکس کے بارے میں بتایئے۔'' رابعہ نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''رابعہ بیٹا۔ کارل مارکس نے 1848ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو (Communist manifesto) لکھ کر ایک انقلابی تحریک کی بنیاد رکھی۔ تاریخ انسانی کا جدلیاتی تصور پیش کیا۔ اس نے انسانی تاریخ کو معاشی تناظر میں دیکھا اور نیا نظریہ پیش کیا جسے Materialist Intrepretation of history کہتے ہیں یعنی تاریخ کی مادی تشریح۔ اس نے اپنی معرکتہ الآ را کتاب "Das Capita" میں سرمایہ داری نظام کی دھجیاں اڑا دیں جو اس زمانے کا بدترین استحصالی نظام تھا اور آج بھی جدید شکل میں موجود ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا۔ کارل مارکس نے "Theory of surplus value" کا نظریہ پیش کیا۔ آجر اور آجیر (مزدور اور کارخانہ دار) کے رشتے میں نئی جہت نکالی۔ خام مال کو Finished good میں تبدیل کرنے میں جو قدر اضافہ پیدا ہوتا ہے وہ مالی قدر یا اضافہ سرمایہ دار ہڑپ کر جاتا ہے اور مزدور کو صرف زندہ رہنے کے لیے اُجرت دیتا ہے تاکہ وہ زندہ رہے اور اس کے منافع کی چکی کے پارٹ کو چلاتا رہے اور اس کا استحصالی نظام چلتا رہے اور اس کا پہیہ جام نہ ہو جائے۔ کارل مارکس نے Dialectic پر بہت زور دیا جو بنیادی طور پر ہیگل کا نظریہ تھا۔ اس نے سرمایہ داری کے نظام کے متبادل کے طور پر کمیونسٹ نظام (Commounism) کا نظریہ پیش کیا جو یورپ کے بجائے روس میں مقبول ہوا۔ اسے Eagel نے مزید سائنسی بنیادیں فراہم کیں اور ایک خونی انقلاب کے بعد جس میں RedArmy نے لاکھوں کسانوں کو قتل کیا۔ ذاتی زمین اور جائیداد کے تصور کو ختم کر دیا اور لینن نے جو ایک بے رحم لیکن انتہائی ذہین اور دنیا کا بہترین جابر ایڈمنسٹریٹر تھا، اس نظام کو کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ کے ذریعے نافذ کر دیا۔

کارل مارکس کے نظریہ Dictatorship of Protasiant مزدوروں کی جبریت اور مکمل اختیار کا نظریہ کمیونسٹ پارٹی کے بے پناہ اختیارات میں بدل گیا class less & state less society ریاست اور طبقات کے بغیر ایک معاشرے کی تخلیق محض ایک (utopia) خیالی ثابت ہوا جو بنیادی طور پر ایک مبہم خیال تھا۔ کمیونسٹ نظام کی جبریت نے اختلاف رائے اور آزادیٔ اظہار جسے جے ایس مل نے اپنی کتاب "Mill on liberty" میں بنیادی انسانی حق کہا تھا، اختلاف کو سزائے موت کا حقدار جانا گیا۔ ایک دفعہ سٹالن جو جبر، بے رحمی اور قتل و غارت کا مجسمہ تھا، روسی پولٹ بیورو (پارلیمنٹ) سے خطاب کر رہا تھا۔ اس نے لینن کے زمانے کے مظالم بیان کرنا شروع کیے کہ کس طرح اس نے مخالفین کو چن چن کر بے رحمی سے ہلاک کیا۔ اتنے میں

اسے ایک کاغذ کا رقعہ وصول ہوا جس پر لکھا تھا" آپ اس وقت پولٹ بیورو کے ممبر تھے۔ آپ نے اعتراض کیوں نہیں کیا؟" سٹالن نے غراتی ہوئی اونچی آواز میں پوچھا۔" یہ رقعہ کس نے بھیجا ہے؟" تو ہر طرف ایک گہری خاموش چھاگئی اور کوئی بھی نہ بولا۔ اس پر سٹالن نے مسکراتے ہوئے کہا" اس وقت میرا بھی یہی حال تھا۔"

کارل مارکس کی" سرخ جنت" کا تصور صرف یوٹوپیا ثابت ہوا۔ انسانی فطرت کے صرف ایک پہلو" معاشی ضرورت کے نظریے" نے شکست کھائی۔ وہ نظام جو لینن کی بصیرت اور سٹالن کی درندگی سے قائم ہوا تھا، گورباچوف نے نظریات پیراسٹائے اور گلاسنوسٹ یعنی کھلی سوسائٹی اور آزادرائے کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ دنیا کی سب سے بڑی فوج، سب سے زیادہ ٹینکوں کا مالک، ایٹمی ہتھیاروں اور Inter continantal Ballestic missiles پر نازاں ملک معیشت کی زبوں حالی کی بدولت پھولوں کی پتیوں کی طرح بکھر گیا۔"

" واہ پروفیسر صاحب، آپ کا جواب نہیں۔ کمیونزم کو اس سے آسان مفہوم میں سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مسئلہ سارا اسی پاپی پیٹ کا ہے۔ کھانا لگ چکا ہے۔ پلیز ڈائننگ روم میں چلتے ہیں۔"

کھانے کی لمبی موٹے شیشے کی میز پر انواع و اقسام کے کھانے تھے۔ رابعہ اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے ڈائننگ روم پر نظر ڈالی تو خوبصورت وڈ ورک کی الماریوں میں مہنگی ترین کراکری بجی تھی۔

کھانے کی میز پر لذیذ ڈشیں پڑی تھیں۔ جب چکن بریانی کی ڈش آئی تو خالص باسمتی چاول اور گرم مصالحوں کی خوشبو نے کمرہ مہکا دیا۔ بادام والا مٹن قورمہ، فرائیڈ چانپیں، شامی کباب، چکن بروسٹ، چکن حلیم اور مغز نہاری، ساتھ ساتھ گرم چپاتی اور گرم نان۔

" واہ ساجد صاحب، آپ نے تو بہت تکلف سے کام لیا ہے۔"

" پروفیسر صاحب، سچ بات یہ ہے کہ امریکہ میں ہم برگر اور پیزا کھا کھا کر تنگ آجاتے ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پاکستانی کھانوں جیسی لذت اور غذائیت کسی اور کھانے میں نہیں۔ میں نے تھائی، جاپانی، لبنانی اور عربی کھانے بھی کھائے ہیں۔ ہر قسم کا سی فوڈ کھایا ہے لیکن پاکستانی کھانوں کا جواب نہیں۔"

رابعہ نے بریانی کی ڈش ندیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

" یہ لیجیے، بہت لذیذ ہے۔"

ندیم نے بریانی اور قورمے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے سوچا:

''جو خوشبو مشرق میں ہے، وہ مغرب میں نہیں۔''

کھانا بہت لذیذ تھا، سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔

سویٹ لیتے ہوئے پروفیسر زبیر نے کہا'' کسٹرڈ، فروٹ ٹرائفل اور سوفلے اپنی جگہ سہی لیکن کھیر سے بہتر کوئی ڈش نہیں۔ دودھ اور چاول کا ملاپ کھیر اور فرنی اپنی لذت، لطافت اور مٹھاس میں لاجواب ہیں۔''

''جی ہاں زبیر۔ واقعی ہم اپنی ڈشوں پر فخر کر سکتے ہیں۔''

ساجد بولے'' آپ نے تعریف زیادہ اور کھیر کم لی ہے۔ یہ نیز ھی کھیر نہیں۔ آپ اور لیں۔'' سب ہنس پڑے۔

اُدھر رابعہ نے کھیر کا چمچ منہ میں ڈالا تو اس کی نظر ندیم پر جا ٹکی۔ ندیم بھی کھانے میں مصروف تھا۔ رابعہ کو لگا جیسے کھیر بہت ہی میٹھی ہوگئی ہو۔ شہد کی مانند۔

''قہوہ، ڈرائنگ روم میں پئیں گے۔'' ساجد نے پیار سے کہا۔

صوفوں پر بیٹھتے ہی پروفیسر زبیر نے پوچھ لیا۔'' سر آپ نے مغربی فلاسفر پر جتنی بھی گفتگو کی، وہ قدیم تھے۔ انسانی فکر مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ کچھ نئے فلسفیانہ خیالات سے آگاہ کیجیے۔''

پروفیسر دلاور نے قہوے کی چسکی لیتے ہوئے کہا:

''جدید فلاسفر بہت ہیں جنہوں نے خیالات کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ سگمن فرائیڈ نے انسانی ذہن کی نئی تشریح کر کے اسے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے خانوں میں بانٹ دیا۔ جنسی جذبے کو ہر فعل کا محرک قرار دیا اور Libido کو دریافت کیا۔ ہمارے اعمال وافعال کی تحریک کا سبب ہے۔ اس نظریے نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے (Analysis of dreams) میں خواب کی نئی تعبیریں پیش کیں لیکن ہمیں اس کے پس پردہ ذہنی فکر کو کریدنا ہوگا۔ نطشے (Nietzsehe) اور واگنر نے شروع میں اسے شوپنہار (Schopenhauer) کی تعلیم کو پڑھا۔ ''ارادہ اور خیال'' سے توانائی حاصل کی۔ پھر اسے واگنر (Wagner) کی سوچ نے بہت متاثر کیا۔ واگنر کی واحد تصنیف'' روح موسیقی سے حزنیہ کا ظہور'' ہے۔ وہ دو دیوتاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ پہلا دائنوس (Dionysus) ہے۔ یہ شراب و شباب، عیش و عشرت، عروج حیات، مسرت،

احساسات، الہام، جبلت، مجامات، بے پروائی، الم پذیری (Tragedy) نغمہ، موسیقی، رقص اور تمثیل کا دیوتا تھا۔ دوسرا دیوتا ہے اپالو (Apollo) جو امن، فرحت، چین، جمالیاتی احساس، جبلی تدبیر، منطقی ترتیب، فلسفیانہ سکون، مصوری، مجسمہ سازی کا دیوتا ہے۔ یونانی فکر رجائیت سے بھرپور نہیں تھی۔ یونانی آلام حیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب یونانی دیوتا میڈاس نے سائلنوس سے پوچھا کہ "انسان کی ارفع اور اعلیٰ ترین تقدیر کیا ہے بالفاظ دیگر حیات کی سب سے بڑی سعادت اور نعمت کیا ہے؟" تو اس نے جواب دیا "انسان ایک دن زندہ رہنے والی قابل رحم نسل، حوادث و آلام کا فرزند ہے۔ اس کے متعلق کیا پوچھتے ہو۔ بہتر تو یہی تھا کہ میری بات نہ سنتے۔ کائنات کی بہترین نعمتیں وہ ہیں جو حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ ہے، ابدی نہ ہونا یعنی عدم اور اس سے کم تر سعادت یہ ہے کہ انسان جلد مر جائے۔"

غالب نے اسی فلسفے کو الہامی طور پر اس شعر میں سمویا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یعنی عدم سے وجود میں آنا غم والم کی وادی میں اترنا ہے اور ہونے کا غم ہی سب سے بڑا غم ہے۔ ہستی ایک فریب دام خیال ہے۔ غالب نے ہی کمال مہارت سے اسی نظریہ کو یوں شعر کے قلب میں ڈھالا ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یونانیوں نے تمثیل کی بنیاد آلام حیات پر رکھی اور یہ حقیقت دریافت کر لی کہ "حیات و کائنات کے وجود کا جواز فقط یہ ہے۔ ہم اسے جمالیاتی مظہر تصور کریں۔" تمثیل کے اسی ذوق نے اوپیرا کو جنم دیا۔ نطشے لکھتا ہے "کتنے افسوس کا مقام ہے کہ رومانیت، تصوری Romantism & immagmation دروغ گوئی انسانی ضمیر کی کمزوری میں جو نسوانیت اور غیر منظم نغمہ گری موجود ہوتی ہے اس نے ایک نہایت شجاع انسان کو مسخر کر لیا ہے۔ میری بیزاری کی وجہ یہی ہے۔"

1879ء میں نطشے پر شباب کا عالم تھا۔ پھر ذہنی توازن بگڑ گیا۔ وہ اتنا زیادہ بیمار ہوا کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ اس نے مرنے کی تیاری بھی عجیب گستاخانہ انداز میں کی اور اپنی بہن سے کہا:

"وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بعد صرف میرے دوستوں کو تابوت کے قریب آنے

کی اجازت نہ دوگی اور عوام کو میری لاش سے دور رکھوگی کیونکہ وہ خوامخواہ ہر بات کی کرید کرتے ہیں اور دیکھنا کوئی پادری یا کوئی اور شخص میری قبر پر کھڑا ہو کر جھک نہ مارے کہ میں اس وقت مدافعت نہ کرسکوں گا۔ میں کافر اور مشرک ہوں اور مجھے اسی حیثیت سے قبر میں اتار دینا۔''

بیماری کے بعد وہ صحت مند ہو گیا۔ اس نے طلوع صبح (The dawn of day) اور بصیرت سرور (The joyful wisdom) کتابیں لکھیں۔ وہ تشکر کا اظہار تھا۔ اگرچہ نطشے مغرور اور متکبر تھا مگر انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہ تھا کیونکہ ایک دن سالومی کے عشق میں گرفتار ہو گیا جو خوبصورت تو تھی لیکن اسے نطشے سے ذرا بھر بھی پیار نہیں تھا۔ نطشے مایوس ہوا۔ گہرا زخم کھایا۔

اب اسے تنہائی کی جستجو تھی مگر وہ عنقا تھی، بہت محال تھی۔ ''آدمیوں کے ساتھ مل کر رہنا دشوار ہے کیونکہ چپ رہنا دشوار ہے۔''

وہ کوہ ایلپس کی تنہا بلندیوں میں اسیر ہو گیا۔ اس پر یہ نظم القا ہوئی:

''میں منتظر بیٹھا تھا۔ انتظار کسی کا نہ تھا
خیر و شر سے بلند ہو چکا تھا اور مجھے کبھی
نور دیکھ کر مسرت ہوتی تھی، کبھی ظلمت اور میں کیا دیکھتا تھا
کہ دن روشن ہے، جھیل کا پانی ہلکورے لے رہا ہے
دوپہر کا وقت ہے۔ وقت کا سیلاب بہا جا رہا ہے
(منزل ابد کی طرف) پھر اس سے میرے ہمدم ناگہاں
میری تنہائی ختم ہو گئی
اور زرتشت میرے قریب سے گزرا۔''

نطشے کی تعلیمات میں بار بار یہ کلمات ملتے ہیں کہ ''میں دکھ سہہ رہا ہوں۔'' وہ اپنے متعلق کہتا ہے کہ ''میں صوفی ہوں اور بادہ گسار بھی۔''

نطشے کے تعارف کے لیے بہترین تصنیف "Beyond good & evil" ہے۔

نطشے نے محبت کا ذکر اس پیرائے میں کیا ہے ''کوئی مرد کسی عورت کو دیکھ کر فریفتہ کیوں ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محض جنس کارفرما نہیں ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ عورت میں کمزوری، دوسروں کی دست نگری اور ساتھ ہی کھلنڈرا پن جمع ہو گیا ہے تو اس کی روح میں جیسے لہریں اٹھتی ہیں۔ وہ متاثر بھی کرتا ہے اور بکھرتا بھی۔ یہیں سے محبت کی عظمت جنم لیتی ہے۔'' وہ یہ مقولہ بھی درج کرتا ہے

کہ "یہی محبت میں جسم روح سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔"

پروفیسر زبیر نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا "بس کریں دلاور بھائی۔ نئے دور میں آ ئیے۔ آج کے دور کی فکر پہ بات کریں۔ فلسفہ آج کہاں ہے؟"

پروفیسر دلاور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "انسانی سوچ اور فکر کا ارتقا مسلسل حرکت پذیر ہے۔ وہ کبھی رکتا نہیں۔ جدید دور میں بھی زندگی کے معانی تلاش کیے گئے ہیں۔ جدید فلسفہ طبیعات اور نفسیات کے مابین ایک جنگ کی کہانی بھی ہے۔

ڈیکارٹ نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ فلسفہ کا نقطۂ آغاز ذات ہونا چاہیے جس کے بعد وہ خارج کی طرف متوجہ ہو لیکن یورپ کی صنعت کاری (Industrialisation) نے فکر کو خود فکر سے جدا کر کے مادی اشیاء میں منہمک (Absorb) کر دیا اور ہر قسم کے مابعد الطبیعیات (Mataphysics) سے ناطہ توڑ لیا۔

فرانسیسیوں نے تشکک (Scepticism) کے نظریہ کو فروغ دیا تھا۔ ہربرٹ سپنسر سے نئی سوچ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کا نظام فلسفہ اس میکانکی نقطۂ نظر کا مقام عروج تھا۔ انسانی فکر نے مابعد الطبیعاتی بھول بھلیوں (metaphysical Abdia choas) کا سفر طے کر کے اس عقدہ کو وا کر دیا کہ مثبت سائنسی سوچ جو (Positive Science) مشاہدہ پر قائم ہے معروضہ (Hypothesis) اور تجربہ (Experiment) اس سوچ کی بنیاد ہیں جو بالآخر نظریہ علت اور معلول (Cause and effor dogmatic intelletualism) پر ختم ہوا، کو رد کر دیا گیا۔

جدید مفکروں کا خیال ہے کہ حقائق خواہ کتنے ہی بسیط اور سوفسطائیوں تجرد (Singural) کیوں نہ ہو، بہر صورت انسانی تجربے ہی سے لیے جاتے ہیں۔ اس لیے صداقت طرف انسانی تجربے سے حاصل ہو سکتی ہے اور انسانی مشاہدے اور تجربہ سے ماورا (Beyond) صداقت یا حقیقت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ سوفسطائیوں نے صداقت کے ساتھ خیر کو بھی ازلی قدر (eternal value) ماننے سے انکار کر دیا۔ غورجیاس سوفسطائی کہتا ہے:

"ہر زمانے اور ہر معاشرے میں اس قسم کی نیکی پائی جاتی ہے جو اس زمانے اور معاشرے سے مناسبت رکھتی ہو۔"

اس دور میں حقیقت پسندی (Realism) کو فروغ حاصل ہوا۔ سائنسی طرز فکر (Emprricism) کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ سائنس میں گلیلو اور فلسفے میں فرانسس بیکن نے اس

نئے رجحان کی بنیاد رکھی۔ بیکن کہتا ہے کہ اس عالم کی جملہ اشیاء حقیقی ہیں اور ان پر غیر متغیر قوانین (Unchangeable Laws) نافذ ہیں جن کی مدد سے کائنات کے رازوں کا انکشاف کیا جا سکتا ہے۔ بیکن کے بعد جان لاک (John Lock) نے اس نظریہ کو آگے بڑھایا کہ "حس (Sense) ہمارے علم کا ماخذ ہے اور ازلی اور ابدی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کے نزدیک ادراک (Perception) ہی حصول علم کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ خیال ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ صدیوں سے فلاسفہ علم کا ماخذ حسیات سے ماوراء عالم امثال میں تلاش کرتے آئے تھے۔

جان لاک نے انسانی حقوق کی بات کی جن میں تین سب سے اہم ہیں (1) زندہ رہنے کا حق (2) آزاد رہنے کا حق (3) حصول املاک (Property) کا حق۔ لاک جائیداد کا حق دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ناانصافی ہوگی، اس کی تہہ میں املاک ہوگی۔

اس کے اپنے الفاظ میں:

"جہاں املاک نہیں ہوگی، وہاں ناانصافی نہیں ہوگی۔ یہ بات اتنی ہی قطعی ہے جتنا کہ اقلیدس کا کوئی مسئلہ۔"

لاک کے نظریہ کا اثر بہت دوررس ہوا۔ شیلر نے کسی شخص کے بارے میں کہا تھا "اس کی ہڈیوں میں اتنا گودا ہے کہ صدیوں تک ختم نہیں ہوگا۔" یہ بات لاک پر صادق آتی ہے۔

ہیوم (hume) نے جو اٹھارہویں صدی کے تشکک (Scepticism) کا امام ہے۔ لاک اور بارکلے کے فلسفہ تجربیت (Experimentism) کو منطقی غایت (Logical conculsion) تک پہنچا دیا کہ صرف انہی اشیاء کا وجود ہے جن کا ادراک کیا جائے۔ مثلاً جب میں کمرے میں موجود ہوں تو میز بھی موجود ہے کیونکہ میں اس کا ادراک کرتا ہوں۔ کمرے سے باہر چلا جاؤں گا تو میز موجود نہیں ہوگی۔ ہم تو صرف ذہنی کوائف کے بہاؤ جان سکتے ہیں جو یکے بعد دیگرے وارد ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا خدا اور عالم طبعی کے وجود کی کوئی شہادت (Evidence) ہمارے پاس نہیں ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ذات (Self) کا کوئی تاثر نہیں ہوتا۔ اس لیے ذات کا کوئی تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے جب میں اپنے بطون (Inner self) میں جھانکتا ہوں تو مجھے کہیں بھی ذات کا کھوج نہیں ملتا۔ صرف کسی نہ کسی شے کے ادراک کا سامنا ہوتا ہے۔

ہیوم کے اثرات دور رس ہوئے۔ انیسویں صدی میں کانٹ اور بنتھم (Benthum) جس نے نظریہ (Pain & Pleasure) پیش کیا۔ ولیم جیمز اور ہمارے زمانے میں برٹرینڈر رسل، ڈیوی اور لیوس نے اس سے استفادہ کیا ہے۔"

پروفیسر زبیر بولے "ہم نے ابھی تک یہی سمجھا ہے کہ فلسفہ تجربیت جدید سائنسی نقطۂ نظر کا آئینہ دار ہے۔ اس کا اصل اصول وہی ہے جو سائنس کا ہے یعنی حواس خمسہ سے ماورا (beyond sensory perpective) کسی حقیقت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس میں انسانی مشاہدے اور تجربے پر کامل اعتماد کیا جاتا ہے۔

عقلیت پسندوں (rationalist) کو شروع ہی سے یہ دقت پیش آتی رہی ہے کہ وہ فکر کے لیے مواد کہاں سے لیں۔ آخر کچھ مواد تو ہوگا جس پر ذہن اپنا عمل کر سکے اور تجربہ انسانی کے بغیر اسے یہ مواد کہاں سے مل سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کے دو پہلو ہیں۔ ہیئت اور موضوع (Shape and subject) خالص عقل پرستی صرف موضوع (subject) کو ہی توجہ کا مرکز سمجھتی ہے، ہیئت کے بغیر موضوع کھوکھلا رہتا ہے اور موضوع کے بغیر ہیئت انتشار بن جاتی ہے۔ علم ان دونوں کے باہمی ربط و تعلق ہی کا دوسرا نام ہے۔ جدید دور کی فکر میں عملیت پسندی (Pragmatism) ایجابیت (Positivism) منطقی تحلیل (Logical Analysis) عقلی یا منطقی اثبات (Logical positivism) اور اصالت عمل (Behaviourism) تجربیت (Experimentision) ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ فرانس کا ایک مفکر کونت کہتا ہے کہ: "بنی نوع انسان سائنس کی بدولت ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ قدیم مذہبی روایات کو ترقی کے راستے میں حائل رکاوٹیں خیال کرتا ہے اور کہتا ہے:

"مُردے زندوں پر حکومت کر رہے ہیں۔"

کونت اور جیری بنتھم دونوں مابعدالطبیعات کے مخالف ہیں۔ جان سٹوارٹ مل نے بھی اسی نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایجابیت (Positivisim) انسانی علوم کی تربیت اور تنظیم کو اہم سمجھتی ہے اور سٹوارٹ مل کی تجربیت میں نفسیات (Psychology) اور منطق (Logic) پر زور دیا گیا ہے۔ عمرانیات (Sociology) اور ملک ایثار (Altruism) بھی انہیں کی ترکیبیں ہیں۔ سٹوارٹ مل نے اپنی مشہور کتاب "منطق" (Logic) میں ذہنی واردات کے ربط اور تعلق کو واضح کیا ہے۔ مثلاً بچہ جانتا ہے کہ آگ جلاتی ہے کیونکہ اس کے تجربے

میں جلنے اور جلانے کا عمل بیک وقت ظہور میں آتے ہیں۔

امریکی فلاسفر ولیم جیمز نتائجیت (Pragmatisim) کا مبلغ ہے جو کہ لاک ہیوم، کانٹ اور کونت کے افکار کا مجموعہ ہے۔ ولیم جیمز کسی "صداقت مطلق" (Absolute truth) کا قائل نہیں ہے۔ وہ "وجود مطلق" (Absolute Power) یا Almigthy کے تصور کو مابعد الطبیعیاتی عفریت سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں صداقت (Truth) ان احوال کے ساتھ اضافی ہے جن سے وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جب یہ احوال بدل جاتے ہیں تو صداقت بھی بدل جاتی ہے۔ صداقت کو بدلتے ہوئے احوال کے ساتھ بدلنا ہی پڑتا ہے۔

جیمز کے نزدیک انسانی تجربے اور طرز عمل میں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آیا "وجود مطلق" ہے یا نہیں۔ حقیقی عالم تجربات انسانی کا عالم ہے جس میں انسانی قدریں اور سائنس دونوں شامل ہیں۔ اس عالم سے ماورا فکر کی پرواز ممکن نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس سے ماورا کوئی عالم اور بھی ہو لیکن انسان اسے جاننے سے قاصر ہے۔ اس کے خیال میں انسانی تجربہ ہی حقیقت ہے۔ بنتھم نے کہا تھا: "افادیت ہی ہر شے کا معیار ہے۔" بیکن کا قول ہے: "وہ قاعدہ جو عملاً سب سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ نظریے میں بھی سب سے زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔"

جیمز مذہب کو بھی نتائج کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اپنے ایک مقالے "عقیدہ رکھنے کا آلہ" ہے جسے سائنسی طریقوں سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب میں کسی "صداقت مطلق" کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا خدا حیات بعد از موت اور قدر و قضا پر عقیدہ رکھنے سے ہمیں کوئی عملی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اگر ان عقائد میں کوئی قدر موجود ہے، اگر جواب اثبات میں ہے تو ان عقائد کے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ مذہبی عقائد صحیح اس لیے ہیں کہ انسان کو نیک بنانے، اسے مسرت (Bliss) بخشنے میں مدد دیتے ہیں۔

جان ڈیوی ایک اور جدید امریکی فلاسفر تھا۔ اس نے کہا کہ انسان اپنے مشاہدے یا تجربے سے ماورا نہیں ہو سکتا۔ یہ کوشش احمقانہ ہوگی۔ اس کے خیال میں کائنات ایک بدلتی ہوئی، نشوونما پاتی ہوئی، ترقی پذیر شے ہے جس کے مشاہدے سے انسانی تجربے میں ہر دم اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ڈیوی کہتا ہے کہ فکر کا عمل مسائل اور عقیدوں کی تحلیل کا عمل ہے کیونکہ انسان سوچ ہی نہیں سکتا جب تک اس کے سامنے کوئی حل طلب عقدہ یا مسئلہ نہ ہو۔ جان ڈیوی کے (نتائجیت)

Pragmatism کے بارے میں ایک اطالوی مورخ ڈیگرو کہتا ہے نتائجیت کے نظریے نے امریکہ میں جنم لیا جو ایک کاروباری ملک ہے اور یہ خالصتاً ایک کاروباری ملک ہی کا فلسفہ ہے۔ برٹرینڈ رسل نے نتائجیت کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس امریکی فلسفہ کا آغاز آزادی کے تصور سے ہوا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ فلسفہ اقتدار پر ختم ہوا۔"

ساجد صاحب نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا" آپ نے تو فلسفے کی ساری تاریخ ہی مختصراً بیان کر دی۔"

زبیر صاحب بولے" ویسے میں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ اتنا ثقیل اور مشکل فلسفہ اتنے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دیا۔" ندیم نے بھی آہ بھر کر کہا" ہم نے زندگی کی حقیقتیں کبھی تلاش ہی نہیں کیں۔ انسانی فکر کے ارتقا اور عملی سائنس کی بتدریج ترقی اور ٹیکنالوجی کے عروج کی کہانی کتنی دلچسپ ہے۔"

رابعہ جو گہری سوچ میں گم تھی، اچانک بول پڑی:

" انکل دلاور۔ میں نے انگریزی کے کورس میں برٹرینڈ رسل کو پڑھا ہے لیکن وہ بہت مشکل فلاسفر ہے۔ جس طرح مجھے آج تک ژاں پال سارتر کے فلسفۂ وجودیت (Existantialism) کی سمجھ نہیں آئی اسی طرح رسل کو بھی نہیں سمجھ سکی۔ پلیز ان دونوں کے بارے میں مختصر کچھ بتائیے۔"

پھر دلاور نے شرط لگاتے ہوئے کہا:

" پہلے ایک گرم گرم بلیک کافی۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

تھوڑی دیر میں کافی آ گئی۔

پروفیسر دلاور بولے" جدید فلاسفر میں برگساں (Berson) اور وائٹ ہیڈ (whitehead) کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ برگساں وحدت الوجود کا قائل ہے۔ خرد دشمنی میں وہ جرمن رومانیت (romanticism) سے متاثر ہوا ہے۔ برگساں خرد دشمنی کا ہر دلعزیز مفکر ہے۔ اس کے بقول سائنس اور منطق (Logic) ادراک حق سے قاصر ہیں۔ زندگی اور حرکت و تغیر کے مقابلے میں عقلی استدلال بے کار ہیں۔ سائنس صرف میکانکی ہے۔ بے حس اور جامد اشیاء کا جائزہ لے سکتی ہے۔ وجدان زندگی ہے، حقیقی زندگی ہے۔ وجدان اپنے اوصاف سے آگاہ ہے اور انسان کی نجات روحانی اقدار پر ہے۔ روحانیت پر ہے۔

برگساں کے ارتقائے حقیقی میں ترمیم کر کے بعض اہل فکر نے ارتقا بروزی کا نظریہ پیش کیا۔

Theory of emergent revolution ان میں لائڈ مارگن اور الیگزینڈر قابل ذکر ہیں۔ الیگزینڈر نے برگساں کے نظریات میں ترمیم کر کے طبعی ارتقا اور تخلیقی ارتقا میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر الیگزینڈر نے کہا:

''یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ یہ ارتقا عمل ذہن پر آ کر رک گیا ہے۔ ذہن سے آگے بھی ایک صنعت کا نقش ملتا ہے، جس کا ذہن سے وہی تعلق ہے جو ذہن کا حیات سے اور حیات کا مادے سے ہے۔ اس صنعت کو وہ یزدانیت کہتا ہے اور جس شے میں وہ پائی جاتی ہے، وہ خدا ہے۔ ارتقائے بزوری (emergent evolution) کے پیروکار اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ خدا نے کائنات کو خلق نہیں کیا بلکہ کائنات خدا کو خلق کر رہی ہے۔ روایتی مذہب کے خدا کے ساتھ اس خدا کا تعلق برائے نام ہی رہ گیا ہے۔

وحدت الوجود کے ماننے والوں، ارتقائے بزوری (Emergent Evolution) کا خدا ظاہری طور پر مذہب کا خدا نہیں ہے جو کائنات سے ماورا ہے۔ خالق ہے، قادر مطلق ہے۔ عدم سے وجود میں لا سکتا ہے بلکہ سریانی خدا ہے جو کائنات میں طاری و ساری ہے اور کائنات سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں اہل مذہب نے نظریات ارتقا (Creative evalution) سے متاثر ہو کر ماورائی خدا سے قطع تعلق کر لیا ہے اور سریانی خدا کے بارے میں تاویلیں پیش کر رہے ہیں۔

ارتقائیت کا ایک اور نامور ترجمان وائٹ ہیڈ نے برٹرینڈ رسل کے ساتھ مل کر منطق کو جدید ریاضیات کی بنیاد پر از سر نو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وائٹ ہیڈ کا نظریہ جدید سائنس کے دو عقائد کی نفی سے پیدا ہوا ہے۔ نیوٹن کا نظریہ حرکت اشیاء اور ڈیکارٹ کا نظریہ جس کی رو سے جسم اور ذہن ایک دوسرے سے قطعی جداگانہ ہیں۔

وائٹ ہیڈ کائنات کو عضویاتی وحدت خیال کرتا ہے۔ (Organic unity) اپنی مشہور کتاب ''سائنس اور عالم جدید'' (Science and Modern Knowledge) میں کہتا ہے کہ سائنس کی دنیا میں خواہ کتنا انقلاب اور انکشاف کیا جائے، اسے فتح و نصرت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وائٹ ہیڈ کا نظریہ بھی سریانی (Immanontist) ہے۔''

پروفیسر دلاور نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے:

''میرے نزدیک شوپن ہاؤر (Schopen hauer) رسل سے بڑا فلاسفر ہے۔ میں اس کی چند مشہور باتیں بتاتا ہوں جس میں گہری نفسیاتی بصیرت ہے اور عملی دانش مندی کا ثبوت ملتا ہے۔

(1) ایک صحت مند گداگر ایک مریض بادشاہ سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔

(2) ہر شخص اپنے شعور کی حدود میں گھرا ہوا ہے اور ان حدود کو پار نہیں کر سکتا جیسے وہ اپنی جلد سے باہر نہیں آ سکتا۔

(3) آدمی جتنا زیادہ دولت مند ہوتا ہے، اتنا ہی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

(4) ایک عالم خواہ کتنی ہی کسرِ نفسی کا اظہار کرے، لوگ اسے ذہنی لحاظ سے اپنے سے برتر ہونے کے باعث کبھی معاف نہیں کریں گے۔

(5) جو لوگ تم سے ملنے آئیں انہیں اپنے ہی متعلق باتیں کر کے بیزار نہ کرو بلکہ انہیں اپنی ذات کے متعلق باتیں کرنے دو کہ وہ اسی لیے ہمارے پاس آتے ہیں۔

(6) زندگی سے محبت دراصل موت کا خوف ہے۔

(7) جو شخص بڑھاپے میں بھی مجلس آرائی کا شوق رکھتا ہے وہ بالکل مغز کے بغیر ہے۔

(8) عقل تجربے سے آتی ہے۔ دانش و خرد کے مقولے حفظ کرنے سے نہیں آتی۔

(9) اکثر امراء امیر لوگ ناخوش رہتے ہیں کیونکہ وہ تہذیب نفس کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔ دولت ضروریات زندگی کو پورا کرتی ہے لیکن اس سے حقیقی محبت خریدی نہیں جا سکتی۔ دولت پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے باوجود لوگ مال و زر حاصل کرنے کے لیے بھاگتے پھرتے ہیں اور صرف گنتی کے چند اشخاص تہذیب نفس کے حصول کو اہم سمجھتے ہیں۔

(10) جس شخص کے بارے میں کہا جائے کہ وہ تنہائی پسند ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ غیر معمولی ذہن و کردار کا مالک ہے۔

(11) غیر معمولی ذہن رکھنے والے کا کوئی دوست نہیں ہوتا کیونکہ اس کی باریک بین نگاہیں دوستی کے فریب کو فوراً بھانپ لیتی ہیں۔

(12) انسان اپنی بے پناہ انانیت کو شائستگی اور حسنِ اخلاق کے پردوں میں چھپانے کی کوشش

کر رہا ہوتا ہے۔

(13) تم کسی دوست کو قرض دو گے یا اس پر احسان کرو گے تو وہ تمہارا دشمن بن جائے گا۔ اگر تم کسی دوست کو مالی امداد دینے یا اس کا کام کرنے سے معذوری کا اظہار کرو گے تو وہ کبھی تم سے ناراض نہیں ہوگا۔

(14) جس شخص کی ذات میں کوئی جوہر یا غیر معمولی صلاحیت ہو، اس کا شہرت حاصل کرنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا کہ جسم کا سایہ ہونا۔

(15) خودنما لوگ باتونی ہوتے ہیں اور مغرور خاموش رہتے ہیں۔

(16) جو لوگ دوسروں کے سامنے اپنے دکھ اور مصائب کا رونا روتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ لوگ ظاہری طور پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن باطنی طور پر اندر ہی اندر دوسروں کی تکلیفوں پر خوش ہوتے ہیں۔

(17) بڑھاپے میں انسان کا مشاہدہ اس شخص جیسا ہوتا ہے جو رات کی رنگینی میں ناچتی ہوئی خوبصورت رقاصہ کو اپنا بناوٹی چہرہ اتارتے ہوئے دیکھتا ہے جس کی نگاہوں کے سامنے اس کے اصلی خدوخال آجاتے ہیں۔

(18) ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی ایک بدصورت لڑکی سے نہایت تپاک سے ملے گی۔ مردوں میں احمق اور کند ذہن اور عورتوں میں بدصورت ہمیشہ ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ ایک خوبصورت حسین عورت کو کوئی عورت پسند نہیں کرتی، سب اُس سے دور بھاگتی ہیں کہ ان کے سامنے لوگ انہیں بدصورت نہ خیال کریں۔ اسی طرح جو مرد غیر معمولی ذہن ودماغ رکھتا ہے، لوگ اس کے قریب نہیں پھٹکتے کہ کہیں ان کی اپنی حماقت اور جہالت کا راز فاش نہ ہو جائے۔ اس طرح وہ بیچارہ اکیلا رہ جاتا ہے۔

(19) مال وزر سمندر کا شور بہ ہیں کہ جتنا پیو گے اتنی ہی پیاس بھڑکے گی۔

(20) بھلا دینے یا معاف کر دینے کا مطلب تو یہ ہوا کہ بڑی مشکل سے حاصل کیا ہوا تجربہ ضائع کر دیا جائے۔

(21) مرد آزاد وہ ہے جو تنہا رہتا ہے اور اپنی رفاقت پر قناعت کرتا ہے۔

(22) تمہارے دوست تمہیں خلوص ومحبت کا یقین دلائیں گے اور یہ محض دکھاوا ہے۔ تمہارے دشمن البتہ تم سے ضرور خلوص رکھتے ہیں اور یہ ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں

نہیں بھلاتے۔

(23) کسی عمارت پر کام کرنے والے معمار اور مزدور اس کے مکمل نقشے کا علم نہیں رکھتے۔ انسان کی بھی یہی حالت ہے۔ وہ لیل ونہار کے چکر میں پڑ کر زندگی کے جامع تصور سے غافل ہو جاتا ہے۔

(24) ڈاکٹر انسان کی کمزوریوں کو، وکیل اس کی خباثت کو، مذہبی پیشوا اس کی حماقت کو خوب جانتا ہے۔

(25) وہی لوگ دوستوں کی محفلوں کی خواہش کرتے ہیں جن کا اندرون کھوکھلا ہوتا ہے۔ وہ اپنی داخلی ویرانی سے گھبرا کر دوستوں کی مجالس میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔

(26) غریبوں میں جہالت اس قدر عبرتناک نہیں ہوتی جتنی کہ امیروں میں ہوتی ہے۔

(27) بہت سے الفاظ میں کم خیالات کا اظہار جہالت ہے۔ تھوڑے الفاظ میں زیادہ خیالات کا اظہار علمیت ہے۔"

"پروفیسر دلاور صاحب نطشے (Friedrich Nietzsche) کے اقوال بھی بہت مشہور ہیں۔ کچھ اقوال سنائیے۔" پروفیسر زبیر نے درخواست کرتے ہوئے کہا:

"تو پھر سنیے زبیر صاحب! نطشے اپنے آپ کو ایسے کا فلسفی کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

(1) میرے اندر وہ یسی (جسے ہم رومانوی کہتے ہیں) فطرت ہے جو تباہی اور بربادی پر خوش ہوتی ہے۔

(2) نئے تمدن میں آرٹ مذہب کا نعم البدل ہوگا۔

(3) عورت مرد سے زیادہ چالاک اور خبیث ہے۔

(4) کیا تم عورت کے پاس جا رہے ہو۔ اپنا چابک نہ بھول جانا۔

(5) جب کوئی شخص کسی عورت پر عاشق ہو جائے تو اسے شادی کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے کہ حالتِ دیوانگی میں کوئی شخص اپنے مستقبل سے متعلق صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔

(6) جو عورت علمی و عقلی مسائل میں دلچسپی لیتی ہے، اس کے جنسیاتی نظام میں لازماً خلل ہوتا ہے۔

(7) عورت ایک معمہ ہے اور حمل اس معمہ کا حل ہے۔

(8) مرد عورت کے لیے محض ایک وسیلہ ہے لیکن عورت مرد کے لیے کیا ہے؟

(9) حقیقی مرد دو چیزوں کا خواہش مند ہوتا ہے۔ خطرہ اور تفریح۔ اسی لیے وہ عورت کی خواہش کرتا ہے کیونکہ عورت تفریح کا سب سے خطرناک سامان ہے۔

(10) ایشیائی دانش مند ہیں کہ عورت کو پردے میں بند رکھتے ہیں۔

(11) انتقام اور محبت میں عورت مرد کی نسبت زیادہ سفاک ہوتی ہے۔

(12) جرمن لوگ عورتوں کی طرح ہیں۔ تم کبھی بھی ان کی گہرائی کو نہ پا سکو گے کہ اس گہرائی کا کوئی وجود نہیں ہے۔

رہی برٹرینڈ رسل کی بات تو رسل بنیادی طور پر ایک ریاضی دان تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ دنیا کے زیادہ تر مسائل و مصائب فکر کے الجھاؤ کے باعث ہیں۔ اخلاق کا پہلا اصول یہ ہونا چاہیے کہ انسان سیدھے سادھے انداز میں سوچے۔ رسل نے کہا "میرے یا کسی اور شخص کے کسی جھوٹ پر ایمان لانے سے بہتر ہے کہ دنیا برباد ہو جائے۔"

یہی مذہب فکر ہے اور اسی حقیقت کی تلاش میں وہ ریاضیات کی گہرائیوں تک جا پہنچا۔ اس عالی مرتبہ سائنسدان کا پرسکون اختصار اسے وجد میں لے آتا ہے۔ وہ جدید ریاضیات کا ماہر تھا۔ وہ کہتا ہے "آزاد انسان اپنے آپ کو طفلانہ امیدوں اور انسان نما دیوتاؤں کی مدد سے نہیں بہلا سکتا۔" رسل منطق، عملیات اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ ایک مصلح (Reformer) کے طور پر سامنے آیا۔ اس نے جنگ کی بیماری کے اسباب کا پتہ لگایا جس کا سبب نجی ملکیت تھا اور علاج اشتراکیت۔ اس نے کہا، ہر قسم کی ملکیت کا آغاز تشدد اور چوری سے ہوتا ہے۔ ریاست نجی ملکیت کی حفاظت کرتی ہے اور وہ ڈکیتیاں جن سے ملکیت وجود میں آتی ہے، قانون جائز قرار دیتا ہے اور اس کا نفاذ اسلحہ اور جنگ کی مدد سے کرتا ہے۔ اس لیے ریاست ایک لعنت (Curse) ہے۔ آزادی ہی بہترین چیز ہے۔ تعلیم میں سائنس اور سائنسی طریقے کا استعمال ہمیں اس عقلی شعور کا معیار عطا کرے گا جو صرف موجود شہادت (Available Evidence) کو قبول کرتا ہے اور ہر لمحے اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار رہتا ہے کہ وہ غلط ہو سکتا ہے۔ وہ روس میں اشتراکیت کے نفاذ کے بعد اس کی ہولناکیوں کی وجہ سے بدظن ہو گیا۔ جہاں جمہوریت اور آزادیٔ اظہار کو بری طرح کچل دیا گیا تھا۔ مختصراً رسل بنی نوع انسان کے لیے بے پناہ محبت رکھتا ہے۔ آخر میں وہ اعتدال پسند ہو گیا تھا۔ ایسا انسان جو قابل محبت ہے اور بڑی دقیق مابعد الطبیعیات اور ٹھوس ریاضیات کا عالم ہے لیکن خیالات کو سادہ پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اس

کا دل رحم کے چراغوں سے منور ہے اور اس کے ہاں بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ مسرت کی حدود کو چھوتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے بہتر عیسائی ہے جو اس لفظ کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ وہ عظیم ریاضی دان اور فلسفی تھا۔"

رابعہ نے بے ساختہ کہا:

"اور انکل آپ سارتر کو بھول گئے ہیں۔"

پروفیسر زبیر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "دلاور صاحب بہت مختصر۔ آدھی رات ہونے والی ہے۔"

"موجودیت پسندی (Existentialism) عام طور پر کیرک گرد کو موجودیت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ہیگل کے نظام فکر میں جرمن مثالیت پسندی (Idealism) جب بام عروج پر پہنچا تو اس کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ کارل مارکس اور کیرک گرد نے اسی فلسفہ کی بنیاد پر دو مختلف نظریات کی بنیاد رکھی۔ کارل مارکس جدلیات (Dialectic) کی معاشی تعریف کر کے ایک اور طرح کا مفکر بن گیا جبکہ کیرک گرد نے موجودیت کی بنیاد رکھی۔ کیرک گرد ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن میں پیدا ہوا۔ کیرک گرد کو مردہ دلی اور افسردگی کے دورے پڑتے تھے۔ کیرک گرد کے باپ مائیکل گرد نے اسے بستر پر بتایا تھا کہ لڑکپن میں اس نے بکریاں چرواتے ہوئے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر خدا پر لعن طعن کی تھی۔ سورین کیرک گرد کو اس بات کا جذباتی صدمہ پہنچا۔ کیرک گرد کی دیوانگی، یاسیت کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ جسمانی طور پر ایک نہایت بدصورت آدمی تھا۔ قدرت نے اس کمی کی تلافی کے لیے اسے غیر معمولی ذہانت دی تھی لیکن یہی غیر معمولی ذہانت اس کے لیے جان کا عذاب بن گئی۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف سمجھتا تھا۔

گوئٹے کے الفاظ میں اس کی حالت اس شخص جیسی تھی جس نے ننگے بدن پر ذرہ بکتر پہن رکھی ہو اور ساری کڑیاں اس کے بدن میں پیوست ہو گئی ہوں۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "میں آدھا آدمی ہوں۔" وہ اپنی منگیتر سے جدا ہو گیا کیونکہ اسے اپنے اندر سے آواز آئی۔ "اس لڑکی سے دست کش ہو جاؤ کہ یہی تمہارے گناہوں کی سزا ہے۔" پھر ایک دن کسی لڑکی نے کہا کہ میں نے تمہیں قبول کر لیا کیونکہ مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ کیرک گرد لکھتا ہے:

"ایک شریف اور غیور آدمی سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن ایک بات ناقابل

برداشت ہے اور وہ ہے...... رحم۔"

کیرک گرد میں مرنے کی خواہش تھی۔ (wish of death) اس کو یقین تھا کہ وہ چالیس برس میں مر جائے گا۔ زندگی میں اس پر طنز اور ملامت کی گئی۔ وہ کہتا تھا: "میں ایک ایسا شہید ہوں جسے طعن وطنز سے قتل کیا گیا۔" اسے بے پناہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس پر فالج ہوا۔ اس نے 42 برس کی عمر میں دم توڑ دیا۔ مرنے سے پہلے اس نے کہا "لوگ ایک زندہ آدمی کی نسبت ایک مردے کی باتیں غور سے سنیں گے۔"

کیرک گرد کی ایک کتاب دہشت کا تصور (The concept of dread) ہے جس میں اس نے دہشت کا نفسیاتی اور مذہبی تجزیہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خوف تو کسی نہ کسی شے یا فرد کا ہوتا ہے لیکن دہشت کسی خاص شے یا شخص سے وابستہ نہیں ہوتی بلکہ آزادی عمل کی پیداوار ہے یعنی جو انسان آزادانہ عمل کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے وہ دہشت کا شکار ہو جاتا ہے۔ دہشت شروع سے ہی قدر و اختیار کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر گناہ کے ارتکاب سے قبل دہشت لازماً موجود ہوتی ہے۔ اپنی تھیوری کو ثابت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جب حضرت آدم سے کہا گیا کہ یہ پھل مت کھاؤ تو اس امتناع (warning) سے آدمی کے دل میں اس کو توڑنے اور کھانے کی دہشت پیدا ہوگئی اور دہشت زدگی کے عالم میں انہوں نے یہ پھل کھا لیا۔ یہ موروثی گناہ اور دہشت بنی نوع انسان کے مقدر میں شامل ہیں اور انسان اسی دہشت کے تحت بار بار گناہ کرتا ہے اور گناہ کے ارتکاب کے ساتھ آزادی عمل سے ہمکنار ہوتا ہے۔ چنانچہ دہشت میں آزادی کا امکان ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ کیرک گرد دہشت کے دو پہلو بتاتا ہے۔ (1) شخصی دہشت اور موروثی گناہ کی دہشت۔ موروثی گناہ کی دہشت میں اس نے جنسیت (Sexuality) پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن آدم میں جنسیت کے ساتھ دہشت وابستہ ہوتی ہے۔ انسان دہشت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور اس کی قوت ارادی سلب ہو جاتی ہے۔ ایسی بے بسی کی حالت میں وہ بے اختیار گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ جیسے پروانہ شمع کے شعلے میں گھس جاتا ہے۔

کیرک گرد کے خیال میں مرد کی نسبت عورت میں دہشت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس کا جنسی جذبہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس کے بقول اسی وجہ سے مرد زیادہ روحانی ہوتا ہے۔"

رابعہ نے غصے سے مداخلت کی۔ "یہ مرد کا تاریخی تعصب ہے۔ یہ (Male Chauvinism) ہے جو عورت کو جذباتی، کمزور اور بے وقوف ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس

کے بالکل برعکس ہے۔"

پروفیسر دلاور نے کہا" رابعہ بیٹا! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیرک گرد تو پرانا آدمی تھا۔ آج بھی بہت سے لوگ انہیں نظریات پر قائم ہیں۔

کیرک گرد کی دوسری کتابوں کے عنوان مثلاً "خوف اور لغزش"، "مرت الموت" وغیرہ میں اسی طرح کے جملے ملتے ہیں۔ مثلاً (1) "میں کبھی بھی بچہ نہیں تھا۔ میں کبھی بھی جوان نہیں ہوا۔ میں کبھی بھی زندہ نہیں رہا۔ میں کبھی کسی انسان سے محبت نہیں کر سکتا۔"

(2) "زندگی کس قدر کھوکھلی اور لغو ہے۔ کوئی کسی کو دفن کرتا ہے۔ کوئی میت کے ساتھ جاتا ہے۔ کوئی قبر میں تین بیلچے مٹی کے پھینکتا ہے۔ آخر ستر برس کی عمر کب تک ساتھ دے گی۔ کیوں نہ اس زندگی کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے۔ کیوں نہ آدمی قبرستان ہی میں ڈیرا ڈال دے۔ کیوں نہ آدمی قبر میں گھس جائے؟"

ڈیکارٹ کے فلسفے کا آغاز اس فقرے سے ہوا تھا۔

"میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں۔"

کیرک گرد کہتا ہے:

"میں ہوں کیوں کہ میں موجود ہوں۔"

آیئے اب ژاں پال سارتر کی طرف جو 1905ء میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھا۔ وہ کہتا ہے:

"میری ماں کہتی ہے کہ میں دس ماہہ بچہ ہوں۔ میں مادر رحم میں زیادہ مدت تک پک کر دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ خستہ اور چمکیلا ہو گیا تھا۔"

سارتر بہت چھوٹی عمر میں ایسے مابعد الطبیعیاتی اور نفسیاتی مسائل پر غور کرنے لگا جو اکثر بالغ لوگوں کو ساری عمر پریشان نہیں کرتے۔ مثلاً وہ گیارہ برس کا تھا جب اس نے خدا کے وجود سے انکار کر دیا۔ یہ محض اتفاق ہی نہیں ہے کہ اسی سال اس کی ماں نے دوبارہ ایک بحری انجینئر سے نکاح کر لیا تھا۔ سارتر جیسے حساس مزاج لڑکے کو اس نکاح سے اتنا ہی شدید صدمہ ہوا ہوگا جتنا کہ شیکسپیئر کے مشہور المیہ کردار ہیملٹ کو اپنی ماں کی شادی پر ہوا تھا۔

سارتر کو شروع ہی سے فلسفہ کا شوق تھا۔ کچھ عرصہ وہ سمعی اور بصری واہموں (Hallucination) کا شکار رہا۔ وہ اس وہم میں مبتلا تھا کہ ایک مچھلی اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں فرانس کی شکست اور جرمنی کی غلامی، تسلط اور استبداد نے سارتر کو کربناک عذاب کی تلخی سے دوچار کیا۔ اس نے انفرادی حیثیت سے فلسفہ موجودیت (Existantialism) کی بنیاد رکھی۔ اسے انفرادی طور پر ہی ذاتی وابستگی (Engagement) سے ہی اپنی راہ عمل کا انتخاب کرتا تھا۔ اس لیے موضوعیت (Subjectivity) اور فردیت (Individualism) ہی وجودیت کے بنیادی تصور قرار پائے۔

جرمنوں نے فرانس کی آزادروی اور عزت نفس کو کچلنے کے لیے بے پناہ مظالم کیے۔ بے گناہ لوگوں کو قتل کیا گیا۔ اس جبر کے دور میں بقول سارتر: ہر لمحے بھرپور مفہوم میں ہمیں اس چھوٹے سے فقرے کا احساس ہوتا رہا کہ "انسان فانی ہے۔"

سارتر فرانسیسیوں پر ڈھائے ظلم وستم سے شدید متاثر ہوا۔ سارتر کے نزدیک انسان کی سب سے خوبصورت تمنا آزادی ہے اور سب سے مضبوط خوبی اس کی موت اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنے کی اہلیت۔ وہ مزاحمت کار تھے۔ وہ چھپے ہوئے تھے اور تنہائی کا شکار تھے۔ سارتر اسے آزادی کی تعریف کا نام دیتا ہے۔ سارتر آزادی کے دو پہلوؤں پر زور دیتا ہے۔ "منفی طور پر ظلم و ستم کا مقابلہ کرنے کی سکت اور مثبت طور پر انتخاب کی ذمہ داری۔"

آزادی کے اس منفی تصور نے سارتر کے سارے فلسفے کو منفی رنگ دے دیا ہے۔ اس لیے سارتر کو منفیت (Negativity) کا فلسفی بھی کہا گیا ہے۔

سارتر نے کیوبا کے بحران پر کھل کر امریکہ کی مذمت کی۔ شدید مخالفت کے باوجود اس نے الجزائر کی تحریک آزادی اور حریت پسندوں کی کھل کر حمایت کی۔ وہ ویت نام کے جدت پسندوں میں بہت سرگرم رہا۔ اسے ادبیات کا نوبل انعام پیش کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا:

"میں ژاں پال سارتر کے بجائے یہ دستخط کرنا پسند نہیں کرتا۔" ژاں پال سارتر نوبل انعام کا پانے والا۔

سارتر ایک نامور فلسفی ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ تمثیل نگار، ناول نویس اور سیاسی مبصر بھی تھا۔ اس کا پہلا ناول "ناسیا" (Nauasia) تھا۔ جس میں اس نے لغویت (Absurdity) کی بات کی۔ وہ کہتا ہے "میں جان گیا کہ مجھے اپنی موجودگی، اپنی ہستی کا سراغ اپنی ہی زندگی میں مل گیا تھا اور اس وقت سے جو بات میں ابھی تک سمجھ پایا ہوں کہ اس کی جڑ بھی لغویت ہے۔"

"آزادی کی راہیں" کو سارتر کا شاہکار ناول سمجھا جاتا ہے۔ سارتر کے مختصر افسانوں میں "دیوار" اس کی بہترین کہانی ہے۔ سارتر کی فلسفیانہ کتابوں میں "وجود و عدم" سب سے زیادہ اہم ہے۔ (Being and nothingness) میں اس نے اپنے فلسفے کو بڑے مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"عدم وجود سے خارج میں نہیں ہے بلکہ اس کے اندرون میں مخفی ہے۔ اس کے بطن میں موجود ہے جیسے ایک کیڑا پھول کے اندر کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے۔" سارتر وجود کی دو قسموں سے بحث کرتا ہے۔ (1) شعور (2) وہ شے جس پر شعوری عمل ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر شے کو چھوا جا سکتا ہے۔ دیکھا جا سکتا ہے لیکن یہی بات ہم شعور کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ اس کا ادراک بلاواسطہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوصف اس کا وجود ہے۔ ادراک کرنے والی "میں" ہے لیکن اس مفہوم میں موجود نہیں ہے جیسا کہ مثلاً ایک میز موجود ہے۔ ان دونوں کو جو شے ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے وہی "عدم" (Nothingness) ہے۔ اس سے سارتر نے یہ تضاد آمیز نتیجہ اخذ کیا ہے کہ: "میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں اور میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں۔"

سارتر کہتا ہے "انسان وہ نہیں ہے جو وہ ہے کیونکہ وہ حال میں موجود ہونے کے باعث ماضی سے ماورا ہو جاتا ہے اور انسان ہے جو وہ نہیں ہے کیونکہ اس کے سامنے مستقبل کے قوی امکانات ہیں جو کہ حال میں نہیں ہیں۔ اس طرح خالص موجودگی (Pure Existance) کا عدم ہو جائے گی اور صرف ماضی اور مستقبل کے حوالے ہی سے اس میں معنی پیدا ہوں گے۔" سارتر کے بقول شعور (Awareness) ہی وہ شے ہے جس سے "انسان وہ وجود ہے جس کے ساتھ عدم اس دنیا میں آیا ہے۔" وہ کہتا ہے کہ انسان کی وجودگی ایک ایسی کائنات میں لغو اور بے معنی ہے جو اس سے قطعی بے خبر ہے۔ سارتر کے نزدیک اپنے آپ کو معنویت عطا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ عدم سے کامل آزادی کا اقدام کیا جائے۔ چنانچہ انسان کی آزادی جسے انسان سے چھینا نہیں جا سکتا "نہ" کہنے کی آزادی ہے اور یہی سارتر کے نظریہ قدر و اختیار کا سنگ بنیاد ہے۔ آزادی کا یہ تصور ظاہراً منفی ہے اور "نہ" کہنے سے معرض وجود میں آتا ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ انسان کی آزادی یہ ہے کہ وہ نہ کہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ہی ایسا وجود ہے جس میں عدم موجود ہے۔ سارتر کے خیال میں عدم ہی وجود مطلق (Asbolute Existance) ہے۔ یہ عدم انسانی حقیقت ہے اور وہ منفیت ہے۔ اس طرح سارتر کے مابعد الطبعیات میں منفی

رنگ پیدا ہو گیا ہے۔
سارتر کی منفی سوچ نے اس میں قنوطیت (Passimism) پیدا کر دیا۔ وہ انتہائی قنوطیت اور حقارت سے کہتا ہے:
"زندگی چپکنے والی غلاظت ہے جو بہتے بہتے جم گئی ہے۔" سارتر کی سوچ بدلتی ہے۔ سارتر کے خیال میں انسان دوستی (Humanism) کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ انسان مقصد بالذات ہے اور سب سے بڑی قدر بھی خود وہی ہے۔ اس مفہوم کو وہ غلط قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمیں اس انسان پسندی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے انسانی کائنات کے اور کوئی کائنات نہیں ہے اور یہی ہمارا (Humanism) ہے جس سے ہم انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ سوائے انسان کے کوئی اس کے لیے قانون نہیں بنا سکتا۔ ہم نے مذہب کو کھو دیا ہے لیکن انسانیت (Humanism) کو اپنا لیا ہے۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو آزاد کرایا جائے۔ اسے قادر مطلق سمجھا جائے۔ ہم نے خود کے وجود سے انکار کر دیا ہے تاکہ انسان خود انسان کے لیے وجود مطلق بن جائے۔ سارتر نے نئے مفہوم کی رو سے اس Humanism کا ترجمہ "انسان پسندی" ہوگا، "انسان دوستی" نہیں ہوگا۔"

پروفیسر زبیر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "دلاور صاحب سارتر بہت مشکل اور پیچیدہ خیالات کا مالک ہے۔ مجھے آج تک اس کے نظریات کی سمجھ نہیں آئی۔ آج آپ نے بڑے ہی سلیس اور عام فہم طریقے سے ان گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ بہت شکریہ۔"

"ساجد صاحب اس دعوت اور پرتکلف کھانے کا بھی بہت بہت شکریہ۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔" سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ندیم نے رابعہ کی طرف دیکھا تو جیسے آنکھوں میں تشکر کے جذبات ہوں اور کہہ رہی ہوں "ان نوازات کا بہت شکریہ" اور ندیم سراپا محبت بن کر اسے دیکھتا رہا۔

جاتے ہوئے پروفیسر دلاور نے کہا "اگلی نشست میرے غریب خانے پر ہوگی۔ ہفتے کی شام سب لوگ تشریف لائیں۔ میں منتظر رہوں گا۔"

رابعہ نے جھکتی آنکھوں سے ندیم کو خدا حافظ کہا اور دونوں جدا ہو گئے۔ یہ جدائی بھی عجیب چیز ہے۔ یہ شاید پیار سے بھرے دلوں کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ جدائی دل کو غمزدہ کر دیتی ہے تو جگر کو چیر دیتی ہے۔ یہ ہیجان کو جنم دیتی ہے، ہراس پیدا کرتی ہے۔ صدمے سے دوچار کرتی

ہے۔ جدائی پر شاعروں نے خوبصورت انداز سے تبصرہ کیا ہے۔ احمد فراز نے کہا:

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

یا پھر

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

کبھی کبھی جدائی اپنی ذات سے جدا ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

فراز اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

کسی ایسے کا بچھڑ جانا جو دل کے قریب ہو، جذبات کا محور ہو، محبت کا شناور ہو، توجہ کا مرکز ہو، تخیل کا مجسمہ ہو، تصور کا بگولا ہو، خوابوں کا مسافر ہو، خیالوں کا صحرا ہو۔ شبنم سے معطر ہو۔ قلب کی راحت ہو۔ روح کی چاہت ہو۔ جدائی کے بھی کئی رنگ ہیں، کئی پہلو ہیں۔ کبھی بیٹا بن کر ماں کو تڑپاتی ہے تو کہیں اولاد بن کر باپ کو رلاتی ہے۔ بہن کو بہن سے جدا کرتی ہے تو بھائی کو بھائی سے دور کرتی ہے۔ جدائی دکھ کا لمحہ ہے۔ غم کا ترانہ ہے۔ آنسو کی حقیقت ہے۔ سسکی کا فسانہ ہے۔ بچھڑنے کا سندیسہ ہے۔ جدائی کی راتیں طویل ہیں۔ دن لمبے اور اداس ہیں۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ دل لگائے نہیں لگتا۔ جدائی کی شام اداسی کا پیام بن جاتی ہے۔ بقول شاعر:

کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

کچھ ایسا ہی حال ندیم کا تھا۔ وہ اداسی کا پیکر بن کر جدائی کی شاموں میں کھو گیا تھا۔ اس کے اردگرد رابعہ کا ہیولا دھند بن کر چھا گیا تھا۔ یہ محبت بھی عجیب چیز ہے۔ ندیم سوچنے لگا۔ یہ محبت کیا ہے۔ اس نے ایسے تو پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ یہ محبت کیا ہے۔ ندیم سوچتا چلا گیا۔

محبت کیا ہے؟

یہ محبت کی پراسراریت کا نتیجہ ہے کہ آج تک کوئی بھی شخص محبت کی تسلی بخش تعریف نہیں کر پایا۔ ندیم کے ذہن نے خود ہی جواب دیا۔

''محبت خود اپنی یا کسی دوسرے شخص کی روحانی نشوونما کو فروغ دینے کی غرض سے اپنی روح میں وسعت پیدا کرنے کی خواہش کا نام ہے۔ محبت کا المیہ یہ ہے کہ بظاہر جو محبت نظر آتی ہے، محبت نہیں ہوتی۔ ہمارے بہت سے ایسے تجربات میں جن میں محبت کارفرما نظر آتی ہے اور کارفرما نظر نہیں آتی، دونوں باتوں کے درمیان ایک بنیادی وصف محبت کرنے والے اور محبت نہ کرنے والے کے ذہن میں شعوری اور غیر شعوری مقصد لگتا ہے۔

محبت عجیب وغریب انداز میں ایک چکر دار عمل ہے۔ اپنی ذات کو وسعت دینا ایک ارتقائی عمل ہے۔ کوئی شخص کامیابی کے ساتھ اپنی حدود کو وسعت دینے کے بعد وجود کی زیادہ بڑی منزل میں داخل ہوتا ہے، لہٰذا محبت کرنے کا عمل خود کو فروغ دینے کا عمل ہے۔ چاہے اس کا مقصد کسی اور کی نشوونما ہی کیوں نہ ہو۔ تشکیل نو کے ذریعے ہم ترقی پاتے ہیں۔

محبت کی اس تعریف میں دوسروں کے لیے محبت کے ساتھ اپنے آپ سے محبت لازم ہے۔ چونکہ میں اور آپ انسان ہیں۔ اس لیے انسان سے محبت کرنے کا مطلب خود اپنے ساتھ محبت کرنا بھی ہے۔ ہم درحقیقت خود سے محبت کیے بغیر دوسروں سے محبت کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنے آپ کی خود ضبطی (Self discipline) کے بغیر اپنے بچوں کو اس کی تربیت نہیں دے سکتے۔

خود سے محبت اور کسی دوسرے سے محبت ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اپنی حدود کی وسعت دینے کی کوشش اپنی حدود سے تجاوز کر کے ہی دی جا سکتی ہے۔ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو ہماری محبت صرف جدوجہد کے ذریعے ہی حقیقی بنتی ہے۔ اس حقیقت کے ذریعے کہ ہم کسی مخصوص شخص کی (یا اپنی) خاطر ایک میل فالتو چل سکتے ہیں۔

محبت کا خواہش سے گہرا تعلق ہے۔ ہر شخص کچھ حد تک چاہے جانے کی تمنا رکھتا ہے لیکن زیادہ تر لوگ محبت کرنے والے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ محبت کرنے کی خواہش بذات خود محبت نہیں۔

''محبت کا عمل ہی محبت ہے۔''

محبت، خواہش (Desire) کا ایک اقدام ہے یعنی ارادہ اور عمل دونوں۔ ہمیں محبت کرنی نہیں پڑتی بلکہ ہم محبت کرنے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اگر حقیقت میں ہم محبت کرنے والے نہیں تو خود کو چاہے کتنا ہی محبت کرنے والا خیال کریں، محبت نہیں کر سکتے۔ محبت میں گرفتار ہونا

ایک بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ محبت میں گرفتار ہونے والا شخص ایک نہایت طاقتور انداز میں محبت کا تجربہ کرتا ہے۔ جب کوئی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اسے یقیناً یہ محسوس ہوتا ہے کہ "میں اس سے محبت کرتا ہوں یا میں اس سے محبت کرتی ہوں۔" محبت میں گرفتار ہونے کا تجربہ جنس (Sex) سے مربوط ہیجانی تجربہ ہے۔ ہم اپنے بچوں کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ حالانکہ انہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔ ہم اپنے دوستوں اور سہیلیوں کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے، حالانکہ ہم انہیں شدت سے چاہتے ہیں۔ محبت میں گرفتار ہونے کا تجربہ عارضی ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی مرد یا عورت کی محبت میں گرفتار ہوں لیکن اگر یہ تعلق لمبے عرصے تک جاری رہے تو جلد یا بدیر اس گرفتاری سے باہر نکل آتے ہیں۔ محبت میں گرفتار ہونے والا زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتا کیونکہ جنسی اور ہیجانی محبت کا احساس ہمیشہ زوال پذیر ہوتا ہے۔ ہنی مون ہمیشہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ رومانس کا پھول ہمیشہ کملا جاتا ہے۔ ماہر نفسیات اسے "انا کی حدود" کہتے ہیں۔

ہم بچپن ہی سے جانتے ہیں، ہم کون ہیں اور کون نہیں۔ ہم کیا ہیں اور کیا نہیں۔ ہم اپنی انا کی سرحدوں کو وسیع کرتے رہتے ہیں۔ ان سرحدوں کے پیچھے بہت زیادہ تنہائی ہے لیکن ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنی تنہائی کو تکلیف دہ سمجھتے ہیں اور ایسی حالت سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔ محبت میں گرفتار ہونے کا احساس عارضی طور پر اس فرار کی اجازت دیتا ہے۔ ہم میں سے اکثر کو سرمستی اور وجد کا احساس ہوتا ہے۔ ہم اور ہمارا محبوب ایک ہیں۔ اب تنہائی باقی نہیں رہی۔

محبت میں گرفتار ہو جانا اپنی خواہش سے نہیں ہوتا۔ یہ ایک شعوری انتخاب نہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ اسیر محبت بننا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔ البتہ ہم ضبط کے ذریعے آگے قدم بڑھاتے وقت سوچ سکتے ہیں۔

محبت میں گرفتار ہونا اپنی حدود یا سرحدوں کی توسیع نہیں ہوتی۔ یہ ان کا عارضی طور پر ٹوٹ جانا ہوتا ہے۔ اپنی حدود کو وسعت دینے کے لیے جدوجہد درکار ہے۔ محبت میں گرفتار ہونے کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ محبت میں گرفتار ہونے کا نادر لمحہ ایک مرتبہ بیت جائے اور سرحدیں واپس اپنی جگہ پر سمٹ آئیں تو انسان اس فریب سے باہر آ سکتا ہے۔

کچھ ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ محبت محتاجی کو جنم دیتی ہے۔ جب محبوب سے کہا جاتا ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا یا زندہ نہیں رہنا چاہتا تو وہ اپنی معذوری اور طفلیت (Parasitism) کا اظہار کرتا ہے۔ جب زندہ رہنے کے لیے کسی اور فرد کی ضرورت ناگزیر ہو

جائے تو ہم اس کے طفیلیے (Dependent) بن جاتے ہیں۔ یہ محبت کے بجائے حاجت کا معاملہ بن جاتا ہے۔ دو افراد ایک دوسرے سے تبھی محبت کر سکتے ہیں جب وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنے کے قابل تو ہوں اور ایک ساتھ رہنے کی راہ منتخب کریں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ محبت ایثار ذات ہے لیکن حقیقی محبت ایثار ذات نہیں بلکہ توسیع ذات ہے۔ محبت خود کو لبریز کرنے، اپنے وجود کو سیراب کرنے کا نام ہے۔ درحقیقت یہ اس سے بڑھ کر ہے۔ یہ خودی کو کم کرنے کے بجائے بڑھاتی ہے اور آپ کی ذات کو خالی کرنے کے بجائے پُر کرتی ہے۔

محبت صرف ایک احساس کا نام نہیں، یہ ایک عمل ایک سرگرمی کا نام ہے۔ محبت کا جذبہ لگاؤ کے تجربے کے ہمراہ ہوتا ہے۔ لگاؤ یا موہ (Cathexis) وہ عمل ہے جو کسی چیز کو ہمارے لیے اہم بنا دیتا ہے۔ اپنی پسندیدگی کو ایک مرتبہ اس پر مرکوز کر دینے کے بعد وہ ہمارے لیے ''محبت کی چیز'' بن جائے گی۔ خود کو کسی چیز کی چاہت میں پوری طرح غرق کر لینا ہی لگاؤ ہے۔

ہمارے ''موہ'' کی شدت کا اکثر و بیشتر عقل یا خلوص دل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دو اجنبی کسی ہوٹل میں ایک دوسرے کو اس انداز میں موہ لیتے ہیں کہ کوئی بھی اور چیز اس لمحے کی جنسی غایت یا ضرورت سے اہم نہیں رہ جاتی۔ جنسی محبت کرنے کے فوراً بعد ہی ہوسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو غیر دلکش اور ناقابل خواہش پائیں۔ ہم کسی چیز یا انسان کے ''موہ'' کا شکار ہوتے ہی اس کے موہ کو توڑ بھی سکتے ہیں۔

جذبات و احساسات کی دنیا میں خود کو توسیع دینے یا کاہلی کے جمود کے خلاف حرکت کرنے کو ہم ''کام'' کہتے ہیں۔ محبت کا ''کام'' جو مرکزی صورت اختیار کرتا ہے، وہ ''توجہ'' ہے۔ کسی سے محبت کرنے پر ہم اسے اپنی توجہ دیتے ہیں۔ ہم اس شخص کی نشوونما کا دھیان رکھتے ہیں۔ خود سے محبت کرنے پر ہم اپنی نشوونما کا خیال رکھتے ہیں۔ جس اہم طریقے سے ہم اپنی توجہ کا استعمال کر سکتے ہیں، وہ سننا ہے۔

سننے کی صلاحیت بہت بڑی خوبی ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے تو میں محبوب کی باتوں کو بہت غور سے سنوں گا۔ سننے کی صلاحیت محبت کو جلا دیتی ہے۔ محبوب کی باتوں میں محو ہونا، اپنی سماعت کو اس کے سپرد کر دینا بہت ضروری ہے اور اس سماعت کو حاصل کرنا بھی بہت ضروری ہے اظہار محبت کے لیے گویا محبت ایک دو راستہ گلی ہے۔ ایک ایسا رشتہ جس میں لینے والا دیتا بھی ہے

اور دینے والا لیتا بھی ہے۔ حقیقی معنوں میں ''سننا'' دوسرے پر مکمل دھیان دینا، ہمیشہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اگرچہ ''موہ'' محبت سے ماورا ہے لیکن پھر بھی محبت کو شروع کرنے سے پہلے کچھ کھونے یا مسترد کیے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی کی طرف بڑھتے ہیں تو ہمیشہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ شخص آپ سے پرے چلا جائے گا اور آپ کو پہلے سے زیادہ تکلیف دہ حالت میں چھوڑ جائے گا۔

کسی پر اعتماد کرنے سے دلی تکلیف ہوگی۔ انسان پالتو جانور یا پودے سے پیار کریں اور وہ مر جائے۔ ہر مسرت کے ساتھ تکلیف، ہر خوشی کے ساتھ غم شامل ہوتا ہے۔

ہر محبت کرنے والے کو سپردگی کا خطرہ ہوتا ہے۔ سپردگی (Commitment) چاہے گہری یا سطحی ہو لیکن یہ بھی محبت کی بنیاد ہے۔ اسے طاقت و فرمانبرداری کے ساتھ استعمال کرنے کا خطرہ محبت کا آخری اور ممکن طور پر سب سے بڑا خطرہ ہے۔ حقیقی محبت رکھنے والا شخص محبوب کی انفرادیت کی قدر کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے گھبرائے گا کہ ''میں درست ہوں، تم غلط ہو۔ مجھے تم سے بہتر علم ہے کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے۔'' لیکن زندگی کی حقیقت ایسی ہے کہ کچھ موقعوں پر ایک شخص کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ محبت کی ایک سمت خود ضبطی یعنی خود پر ضبط کرنا بھی ہے۔ اس کی توانائی محبت سے ملتی ہے۔ حقیقی محبت کرنے والا شخص کبھی محبوب سے جھگڑا نہیں کرے گا۔ تکرار اور بحث سے گریز کرے گا۔ غصہ میں ہیجانی کیفیت پیدا نہیں کرے گا۔ اونچی آواز میں نہیں بولے گا۔ بدنظمی ظاہر نہیں کرے گا۔ بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہوگا۔ محبت انسان کے اندر ضبط اور نظم کو پیدا کرتی اور اس کی پرورش کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ محبت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے کئی رنگ (Shades) ہیں۔ کئی جہتیں ہیں۔ کئی پرت ہیں، کئی زاویے ہیں۔ یہ قوس قزاح کے رنگوں کی مانند ہے۔ دنیا کے سارے انسان اپنی ہی طرح کی محبت کرتے ہیں۔ یہ اندرونی کیفیت ہے جو نہایت پیچیدہ اور گمبھیر ہے۔

ندیم نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور سوچ کی دنیا سے واپس حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

خیالوں کا تانا بانا ٹوٹا تو ساجد صاحب بول رہے تھے:

''ندیم بیٹا، آج شام پروفیسر دلاور کے گھر جانا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔''

تھوڑی ہی دیر میں دونوں پروفیسر دلاور کے گھر میں تھے۔ پروفیسر دلاور نے گرم جوشی سے استقبال کیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ یہ سمن آباد لاہور کا پرانا علاقہ تھا۔ اگرچہ گھر ایک کینال

پر بنا ہوا تھا لیکن طرز تعمیر پرانی تھی۔ پینٹ بھی مدھم پڑ گیا تھا لیکن گھر کو پرانے انداز سے سجایا گیا تھا۔ اگرچہ ڈرائنگ روم میں مہنگے صوفے اور قیمتی کرسٹل پیس نہیں تھے لیکن پھر بھی نفاست سے آراستہ چیزیں خوبصورت لگ رہی تھیں۔ ساجد صاحب اور ندیم صوفے پر بیٹھ گئے۔ پروفیسر دوسرے کمرے میں فون سن رہے تھے۔

ندیم کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ لاشعوری طور پر رابعہ کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار بھی عجیب چیز ہے۔ ایک تکلیف دہ عمل، ایک ہیجان کا سایہ۔ ایک اضطراب کا کرب، ایک امید کا چراغ۔ ایک ناامیدی کی تاریکی۔ عربی میں کہاوت ہے، انتظار موت سے بھی بدتر ہے۔ انتظار کرب ہے، بلا ہے۔ دشت ہے، صحرا ہے۔ وحشت ہے، جنون ہے، بے چینی ہے۔ گھبراہٹ ہے۔ بے یقینی ہے۔ وسوسہ ہے، اندیشہ ہے۔ پچھتاوا ہے۔ کہیں چراغ منزل ہے تو کہیں دم توڑتی امید ہے۔ ندیم بھی ایسی ہی حالت میں تھا۔ رابعہ آئے گی، نہیں آئے گی۔ وسوسے، خدشے اور اندیشے سانپ بن کر رینگنے لگے تھے کہ پروفیسر زبیر اور رابعہ بھی آ گئے۔ پروفیسر دلاور بھی آ چکے تھے۔ سب نے مل کر استقبال کیا۔ جب سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو رابعہ نے ندیم کو دیکھا۔ عجیب اضطراب و انتظار چہرے سے عیاں، امید وبیم کے چراغ روشن تھے۔ رابعہ نے مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام کیا اور جوابی تیز نظروں سے گھبرا گئی۔ شرم نے چادر اوڑھ لی اور وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ ندیم کو کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ اتنے میں سوپ آ گیا، سب سوپ پینے لگے۔

پروفیسر زبیر نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا:

''دلاور صاحب! پچھلی نشست میں یونان کے فلاسفر کے بارے میں اور پھر جدید مفکروں کے خیالات سے آگاہی تو ہوگئی لیکن آج خدا اور انسان کے تعلق کی بات ہو جائے اور مختلف مذاہب میں تصوف پر بھی روشنی ڈالیے۔''

پروفیسر دلاور نے نشست سنبھالتے ہوئے کہا:

''یونان کے فلاسفر خدا کے شخصی تصور سے آشنا تھے۔ خدا کا شخصی تصور جو بعد میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں رائج ہوا۔ یہ تصور سب سے پہلے یہودیوں نے پیش کیا تھا۔ جب بابل کے حکمرانوں کے پے در پے حملوں نے ان کی سلطنت الٹ دی تو مصائب اور آلام کے اس دور میں انہوں نے ایک قبائلی دیوتا ''یہودا'' کو خداوند کائنات سمجھنا شروع کر دیا۔ یہودا کی جو

تصویر عہد نامہ قدیم (تورات) میں دکھائی دیتی ہے وہ ایک مکمل اور قوی خدا کا تصور ہے جو اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ بادل اور دخان (دھواں) میں ان کے خیموں میں اُترتا ہے اور دھویں کا ستون بن کران کے آگے آگے چلتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روح عصر تصوف وعرفان کی دعوت دے رہی تھی۔ شریعت موسوی دم توڑ رہی تھی۔ نوفلاطونیت (New Plotoism) نے عیسائیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت عیسیٰ کی خوبصورت تعلیمات کے سامنے بے بس ہوگئی۔

The New Testament عہد نامہ جدید یا مقدس بائبل عیسائی عقیدے کی بنیاد ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ بن مریم کی زندگی، ان کی تعلیمات، مستقبل کی امید، ذہنی سکون اور حیات بعد از موت کا پیغام دیتی ہے اور یقین دلاتی ہے۔

مقدس بائبل خدا اور انسان کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ تاریخ کی کتاب نہیں لیکن خدا کے انسانوں اور قوموں سے تعلقات کے واقعات بتاتی ہے۔

بائبل مقدس کے اپنے الفاظ کے بقول اس کی آیت نمبر 3:16 جون (John) نے لکھی جس کا ترجمہ دنیا کی 1600 زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ یہ ہے:

"For God so loved the world that he gave his only begotten son, that whoever believes in him shall not perish but have eternal life."

پروفیسر زبیر نے گفتگو کو توڑتے ہوئے کہا" یہ تو آپ عیسائی تعلیمات کا ذکر کر رہے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں۔"

پروفیسر دلاور نے اطمینان سے جواب دیا:" ہو سکتا ہے، آپ کو ان کے تصور خدا یعنی (Trinity) یعنی خدا، حضرت عیسیٰ اور روح القدس کی تثلیث سے اختلاف ہو اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ ہم مسلمان وحدہ لاشریک کہتے ہیں یعنی خدا کی خدائی میں کوئی شریک نہیں۔ وہ واحد ہے، نہ اس نے کسی کو پیدا کیا نہ کسی نے اسے پیدا کیا۔ توحید کا نظریہ One ness of God اسلام کی بنیادی اساس ہے۔"

"لیکن زبیر صاحب! میں تو عیسائی نظریے اور عقیدے کی بات کر رہا ہوں۔ ان کے ہاں تو مقدس کتابوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ عہد نامہ قدیم "The Old testament" میں پہلی 39 مقدس کتابیں ہیں اور عہد نامہ جدید (The new testament) میں آخری 27

کتابیں ہیں۔

عہد نامہ قدیم میں ذکر ہے کہ جب خدا نے آدم کو بنایا تو اسے وہ بہت اچھا لگا۔ آیت نمبر 27 درج ہے کہ اس لیے خدا نے انسان کو اپنے عکس پر بنایا So God created man in his own image, in the image of God.

عورت کی تخلیق کے بارے میں مقدس بائبل کہتی ہے:

"پھر خدا نے عورت کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا۔ جسے مرد سے لیا گیا۔ پھر اسے آدم کے سامنے لایا گیا۔ (23) آدم نے کہا:

This is now bone of my bones,

and flesh of my flest

She shall be called "Women"

for she was taken out of man.

حضرت آدم علیہ السلام کے اماں حوا (Adam & ave) سے دو بیٹے ہوئے جنہیں قابیل اور ہابیل (Cain and abel) کہا گیا ہے۔ جب ہابیل (abel) کی قربانی قبول ہوگئی اور قابیل (Cain) کی نہیں ہوئی تو قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ اس طرح انسانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔"

پروفیسر زبیر نے کہا "حضرت عیسیٰ کا دین تو محبت کا دین ہے۔ ساری تعلیمات محبت، ایثار، قربانی اور انکساری پر مشتمل ہیں۔"

پروفیسر دلاور بولے "زبیر صاحب، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ بن مریم نے اپنے حواریوں (Disciples) سے کہا:

"اگر آپ کا بھائی گناہ کرے تو اسے سرزنش (warning) کرو اور پچھتائے (repentance) تو معاف کر دو۔" جب شاگردوں نے کہا "ہمارے ایمان (Faith) کو بڑھا دیجیے تو حضرت عیسیٰ نے فرمایا، اگر تمہارا ایمان رائی کے دانے (mustard seed) کے برابر بھی ہوگا اور اگر تم اس درخت (mulberry tree) کو کہو گے کہ تم یہاں سے جڑیں نکال کر سمندر میں اُگ جاؤ تو وہ آپ کا حکم مانے گا۔ حضرت عیسیٰ کا قول (Go and sin no more) گنہگاروں کو توبہ اور نجات کا درس دیتا ہے۔ حقیقت کو تلاش کرو اور وہ تمہیں مل جائے گی۔" (Seek

(Love thy neighbour) اپنے ہمسائے سے پیار کرو (& though shall find) اور ان کی سب سے بڑی محبت کی فلاسفی "اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ رسید کرے تو اسے بایاں گال بھی پیش کر دو۔" امن، محبت اور انسانیت کی عظیم ترین منزل ہے۔"

"لیکن پروفیسر صاحب!" اچانک ساجد بول پڑے۔

"شوپنہار (Schopenhauer) ایک عظیم فلاسفر اور مفکر کے بقول عیسائی قنوطیت (Passivism) کا دقیق فلسفیانہ نظام ہے۔ گناہ اول کا مسلک (The original sin) ارادے کا اثبات اور نجات کا عقیدہ (ارادے کا انکار) وہ جلیل والقدر حقیقت ہے جو عیسائیت کا جوہر ہے۔ روزہ رکھنے میں غیر معمولی مصلحت ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان تمناؤں کو کمزور کیا جائے جن سے مسرت تو کبھی پیدا نہیں ہوتی البتہ الٹا آدمی کو یا تو فریب خوردگی کا احساس ہوتا ہے یا خواہشات اور بڑھتی ہیں۔ عیسائیت نے پہلے دین یہود پر اور پھر یونان/روم کے کفر آمیز مسالک پر فتح پائی ہے۔ عیسائیت اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ انسان گنہگار ہے اور انسان آرام پسند ہے۔ مذہب انسان کو دنیاوی مسرت کی بے ثمر جستجو سے روکتا ہے۔ عیسائیت نے دنیاوی عیش و عشرت کے ہنگاموں میں ولی (saint) کی زندگی کو معیار کے طور پر پیش کیا ہے۔ ولی وہ ہے جو جنگ وجدال سے گریز کرتا ہے اور ہر طریقے سے انفرادی ارادے کو مسخر کر لیتا ہے۔"

پروفیسر ولاور نے ساجد صاحب کو جواب دیا:

"ساجد صاحب! بدھ مت عیسائیت سے زیادہ دقیق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مذہب میں اصل اصول ہی یہ ہے کہ ارادے کو فنا کر دیا جائے۔ شخصی ارتقا کی منزل مقصود نروان ہے۔ ہندو فلسفیوں نے عالم کی جو تعبیر کی ہے وہ واردات باطنی اور وجدان پر مبنی ہے۔ عقل ہر چیز کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ وجدان وحدت کا ضامن ہے۔ ہندو کہتے ہیں "میں" فریب ہے، مایا ہے۔ فرد چھایا ہے، مظہر ہے۔ جو شخص اپنے جائے نفس اور اپنی بصیرت سے اس بات کا احساس کر لے کہ ہم سب ایک کل کا جزو ہیں اور ارادے کے ایک بہت بڑے سمندر کی لہریں، وہ افضل ہو گیا اور نجات کے راستے پر گامزن ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ بصریت کا نقطہ نظر نروان ہے۔"

ندیم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "ایسا لگتا ہے پروفیسر صاحب مہاتما بدھ (سدھارتھ گوتم) کی تعلیمات بتا رہے ہیں۔"

پروفیسر بولے "ندیم بیٹے! آپ نے ٹھیک کہا۔ مہاتما بدھ ایک عظیم مفکر اور بدھ مذہب

کا بانی تھا۔

سدھارتھ گوتم کی پیدائش 563 قبل مسیح میں ہوئی۔ وہ ایک شہزادہ تھا۔ وہ محل میں رہتا تھا۔ سدھارتھ کے باپ نے اس کی شادی یشودھرا سے کر دی جس کا ایک بیٹا راہول پیدا ہوا۔ گوتم کے لیے محل کی پرآسائش زندگی کافی نہ تھی۔ اس نے سیر کے دوران ایک بوڑھا آدمی، ایک مریض اور جنازہ دیکھا۔ اس نے دیکھا بڑھاپے کی ناتوانی، بیماری کی تکلیف اور موت حیات انسانی کے ناگزیر دکھ کی جھلکیاں ہیں۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ کوئی ایسا انداز حیات اور طرز زندگی ہے جو دکھ پر فتح اور ذہن کو شانتی دے سکے۔ ایسے راستے کی تلاش اس کی زندگی کا مرکز بن گئی جو انسانی حیات کے موروثی دکھوں پر مکمل غلبہ حاصل کرے۔ اس نے اپنی سلطنت اور گھر بار چھوڑ دیا اور سنیاسی بن گیا۔ پہلے اس نے یوگا کی مشق کا راستہ اپنایا۔ پھر مراقبے (Meditation) کی بلند ترین منازل تک پہنچنے میں کامیاب ہوا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔ پھر اس نے کٹھن ریاضت کی راہ اختیار کی جس میں سانس نہ لینا اور طویل عرصے تک بھوکا رہنا بھی شامل تھا۔

گوتم کی ریاضتیں اس قدر شدید تھیں کہ وہ قریب المرگ ہو گیا لیکن اس طریقے میں بھی اس کی جستجو جواب ڈھونڈتی رہی۔

انجام کار اس نے مشرق کی جانب منہ کر کے بودھی درخت کے نیچے بیٹھنے اور آگہی حاصل ہونے تک نہ اٹھنے کا عزم کیا۔ اماوس کی رات کو گوتم "دھیان" کی چار منزلوں سے گزرا۔ یہ تمام منازل یکسوئی اور کامل معرفت کی حامل تھیں۔ رات کے آخری پہر میں گوتم نے آگہی (Awareness) حاصل کی اور بدھا (جاگا ہوا) (The enlightned one) بن گیا۔"

ندیم نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "یہ تو بڑی خوبصورت بات ہے۔ آگہی کا شعور (Conscienness of awareness) ایک عظیم روحانی تجربہ ہے۔ پروفیسر انکل! گوتم کو کونسا سچ ملا؟"

"جی ندیم بیٹے، بدھ نے وہ راستہ دیکھ لیا تھا جو تمام دکھوں کی فنا اور ان کی نجات کی طرف لے جاتا تھا۔ (نروان کی طرف لے جاتا ہے) اس نے اپنے بھکشوں (شاگردوں) سے کہا، ایک خواہش کے پیچھے دوڑنا اور دوسری نفسانی لذات میں کھو جانا۔

بدھ نے چار اعلیٰ سچائیوں کو بیان کیا ہے۔ (Four Pains) (1) پیدائش بھی دکھ، بڑھاپا بھی دکھ، بیماری بھی دکھ، موت بھی دکھ، رنج (sorrow) بھی دکھ، آہ و فغاں (Hew a

(cry) افسردگی (Melancholy) اور مایوسی (despondancy) بھی دکھ ہیں۔ ناخوشگوار چیزوں کے ساتھ تعلق (Relation with unpleasant things) بھی دکھ ہیں اور خواہش نہ مکمل ہونے کا دکھ (pain of unfinished ambitions) یہ ہے دکھ (Pain) کی وجہ کا اعلیٰ سچ (sublime truth) دوبارہ جنم لینے والی خواہش اور اس کے ساتھ لذت کی حرص (greed for lust) اِدھر اُدھر لذت کی تلاش یعنی لذت کی طلب۔

اے شاگردو! اب یہی ہے دکھ کو روکنے کا اعلیٰ سچ۔ طلب کو چھوڑنا، دستبرداری (Surrendur) لاتعلقی (detachment) اور بے لگاوٹ (disconcern) اے شاگردو! اب یہ ہے دکھ روکنے کی تدبیر کا اعلیٰ سچ۔ اس لیے آٹھ نکاتی راستہ ہے۔

(1) سچے خیالات (Pure thinking)

(2) سچا ارادہ (Pure determination)

(3) سچی بولی (Truthful statement)

(4) سچا برتاؤ (Pure dealing) زندگی گزارنے کی سچی تدبیری، سچی کوشش، سچا خیال اور سچا دھیان (Pure meditation)

اس نے ایک اچھے روحانی معالج کی طرح Spiritualist کی طرح روگ کی تشخیص کی۔ اس کی وجہ ڈھونڈی اور علاج بتایا۔

انتہائی سادہ نظر آنے والے اس تشخص، مرض اور نسخے کے پیچھے انتہائی گہری فلسفیانہ دریافت پوشیدہ ہے۔ اس دریافت کا پہلا حصہ وہ ہے جسے بدھ نے وجود کی تین خصوصیات (Three characterists of being) وجود (being) کے تمام عناصر عارضی ہیں۔ ہر شے ناپائیدار (mortal) ہے۔ وجود آتا، ہوتا اور چلا جاتا ہے۔ جن چیزوں اور لوگوں کی پائیداری پر ہم یقین رکھتے ہیں وہ عارضی واقعات کے سوا کچھ نہیں۔ ہماری خواہشات اور ضرورتیں ہی ان کی پائیداری کا سراب (Mirage) یا (Illusion) پیدا کرتی ہیں۔

ہم چیزوں اور لوگوں کو سمجھنے اور قبضہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ (Sense of Possession) رکھتے ہیں یا ان سے نفرت کھاتے ہیں۔ یہ سب کچھ پائیدار چیزوں سے کنارہ (avoid) کرتا ہے۔

وجود (Being) کے تمام عنصر ذات میں کمی ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا فریب نظر یہ ہے

کہ ہم خود ہی ایک پائیدار ذات ہیں جو ساری زندگی کے دوران قائم رہتی ہے۔ حتیٰ کہ دوبارہ جنم لیتی ہے۔ آواگون میں ''میں'' (Me) اور میرا (Mine) کی وابستگیوں کی وجہ یہی فریب نظر (Illusion) ہے۔

''میں'' پائیدار ذات، لذت حاصل کرنا، جائیداد اکٹھی کرنا اور دوسرے کی محبت چاہنا یا خوفزدہ ہونا لیکن بدھا کہتا ہے، کوئی پائیدار ''میں'' موجود نہیں۔ ''میں'' تو محض باہم واقعات کے سلسلے کا نام ہے۔

وجود کے تمام عناصر دکھ دیتے ہیں۔ بدھا کے مطابق واقعات کا ناپائیدار اور عارضی بہاؤ کبھی بھی اصلی مسرت اور طمانیت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہماری پائیدار فطرت کی وجہ سے دکھ پیدا کرتا ہے۔ عارضی پن ہماری فطرت کو ہرگز تسکین نہیں دے سکتا۔

بدھ کے فلسفیانہ دریافت کا دوسرا حصہ اس کے نظریہ ناپائیداری (Theory of mortality) سے آگے جاتا ہے۔ یہ نظریہ ''شبہ'' (Nothingness) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سب نظر آنے والی چیزوں میں روح (جوہر) ہے نہ سچائی۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ وہ پیدا ہوتی ہے اور نہ فنا۔ اس کا ظہور ہوتا ہے نہ عدم۔ وہ صرف وہم (Illusion) اور وجود بے وجود (None existance) ہے۔ پیدائش جھوٹ ہے کیونکہ نہ تو کوئی چیز اپنے آپ پیدا ہو سکتی ہے نہ دونوں کے ملنے سے اور نہ کسی سبب کے بنا۔ اگر کوئی چیز ہے تو پیدائش کیسی؟ دوسری چیز سے پیدا ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ پہلے سے موجود چیز کا ظہور ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک چیز کے سہارے سے دوسری چیز ہوتی ہے تو کسی چیز کے سہارے کوئی چیز ہو جانی چاہیے۔ کوئی چیز نہ تو اپنے آپ پیدا ہو سکتی ہے اور نہ دونوں کے میل سے۔ اس نظریہ وسیلہ میں بدھ نے ابدیت اور فنائیت (Eternity and Mortality) کے بائیں راستے پر عمل کیا۔

ہندو ویدک تعلیمات کو ماننے والے، ابدیت پرست یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انسان کا جوہر ذات (آتما) ابدی اور لافانی ہے۔ بدھ نے اس نظریے کے خلاف دلیل پیش کی۔ ایک تو اس لیے کہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا اور دوسرا اس لیے کہ اس نے انسانی طلب وخواہشات کے حصول کو ہوا دی اور دکھ پیدا کیا۔ دوسری طرف فنائیت پرستوں نے نہ صرف ہر شے عارضی ہونے کا دعویٰ کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ واقعات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں اور ہر چیز اتفاقاً واقع ہوئی۔ بدھ نے اسے غلط نظریہ خیال کیا۔ ایک تو اس لیے کہ یہ کسی طور پر غلط تھا۔ دوسرا اس لیے کہ اگر اس

خیال کو درست مان لیا جائے تو نہ کسی بیماری کا کوئی علاج ہوتا اور نہ ہی ''مکتی'' کا کوئی یقینی راستہ۔
بدھ کے بقول ہر واقعہ کسی وجہ سے اور دوسرے واقعات کی وجہ سے ہے۔ بدھ نے ہر انسان کے
پانچ چیزوں پر مشتمل ہونے کا تصور پیش کیا۔
(1) جسمانی روپ (2) جذبات (3) فہم (4) ہیجان (5) شعور۔ کسی بھی مخصوص لمحے میں
انسان ان پانچوں عناصر میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ بعد کی حالت پہلے والی حالت کا ہی علتی نتیجہ ہے۔
علتی عمل میں اخلاقی عمل طاقتور ہے۔ یہی کرم کا قانون ہے۔ اخلاق و اطوار کے متعلق بدھ کی
تعلیمات پانچ اصولوں پر مبنی ہیں اس عمل میں پانچ باتوں سے احتراز کرنا یا تعلق نہ رکھنا بہت ضروری
ہے۔ (1) جاندار کو مارنا (2) جو چیز نہ دی گئی ہو اسے لینا (3) عیش و عشرت میں نڈر رویہ (4) بڑا بول
بولنا۔ نشہ آور چیز پینا۔ سچ بولنا۔ سچ بولنے سے مراد یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولنا۔ غیبت کرنے، تہمت
لگانے، رقابت اور فتنہ انگیز گفتگو کرنا۔ کرخت اور غلط زبان استعمال کرنے اور فضول گپ بازی سے
پرہیز کرنا ہے۔ زندگی گزارنے کی سچی تدبیروں کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسے مشاغل اختیار
کر کے زندگی گزارنے سے گریز کرنا چاہیے جس سے دوسروں کا نقصان ہوتا ہو۔''

رابعہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

''انکل! یہ نروان کیا ہوتا ہے اور کیسے حاصل ہوتا ہے؟''

ندیم نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اسے رابعہ کے منہ سے یہ سوال اچھا نہیں لگا کہ ایک
خوبصورت لڑکی جو ابھی زندگی کی لطافت سے بھرپور ہے۔ جو ابھی مجسم نزاکت اور پھول کی مانند
شگفتہ اور خوبصورت احساس کی طرح امنگوں کو جگاتی لمس کو بیدار کرتی، بدن میں تحریک پیدا کرتی
ہو، رنگ برنگ خواہشوں کی تتلیوں کی طرح دل کو لبھاتی ہو، جس کی موجودگی ایک خوبصورت
احساس اور سراپا خوشبو بن کر جسم میں اتر جاتی ہو، جس کے تبسم سے شبنم کی ٹھنڈک، ندی کی روانی اور
آبشاروں کی ترنم سنائی دیتی ہو، لہجے میں جلترنگ اور ستار بجتے ہوں۔ راگ انگڑائی لے کر بیدار
ہوتے ہوں، جو بزم میں رونق، جلوت میں توجہ اور خلوت میں سرگوشی بن جاتی ہو جس کا کتابی چہرہ
محبت کا دیباچہ ہو۔ رخساروں میں شفق کے رنگ دمکتے ہوں۔ وہ سراپا قوس قزاح کی کمان بن جاتی
ہو۔ جس کا تصور دھنک میں رنگ ہو۔ گلاب میں پنکھڑی ہو۔ کلیوں کی جوانی ہو، خوشبو کی روانی ہو،
فطرت کی مناعی ہو۔ قدرت کی نمائی ہو۔ جو دل کی دھڑکن ہو۔ جذبات کا بندھن ہو۔ ارمانوں کی
مالا ہو۔ وجدان کی تسبیح ہو۔ مستی کا ترانہ ہو۔ کیف کا نغمہ ہو۔ دنیا کی حقیقت ہو۔ حقیقت کا فسانہ ہو۔

محبوب کے آنگن میں تلسی کا شگوفہ ہو۔ پیار کے مندر میں بھگوان کی دیوی ہو۔ پلکوں کے دریچے میں ایک خواب کا منظر ہو۔ تصویر کے رنگوں میں تحریر کا پیکر ہو۔ ندیم کے دل و دماغ نے رابعہ کا یہ روپ ماننے سے انکار کر دیا۔ ایک شوخ حسینہ ہزاروں سال پہلے کے فلسفے کی بھول بھلیوں میں گم ہو اور نروان تلاش کر رہی ہو۔

پروفیسر دلاور بول رہے تھے:

''ٹھہریئے دلاور صاحب۔ ہندوؤں کے روحانی پہلوؤں کے بارے میں کچھ بتایئے۔''

ساجد صاحب بولے ''پہلے یہ تو بتایئے کہ یہ تصوف کیا ہے۔ مجھے آج تک اس فلسفے کی سمجھ نہیں آئی۔'' رابعہ اور ندیم نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

پروفیسر دلاور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا:

''ہاں تو آپ نے پوچھا ہے، تصوف کیا ہے؟ آسان الفاظ میں تصوف خدا سے ملنے، اسے دریافت کرنے اور اسے دیکھنے کی شدید ترین خواہش کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں روح انسانی کا اپنی اصل (خدا) سے واصل ہو جانے کا اشتیاق۔''

''لیکن یہ جذبہ انسان کے اندر کیسے پیدا ہوا؟'' ندیم نے اشتیاق سے پوچھا۔ اسے یہ گفتگو دلچسپ محسوس ہونے لگی تھی۔

''شاید انا کا بت ٹوٹنے سے۔ دیکھو بیٹا۔ جب انسان نے خدا کی طرف سے یہ نوید سنی کہ اگر تم مجھ سے محبت کرو گے تو میں بھی تم سے محبت کروں گا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ شے جسے روح یا آتما کہتے ہیں، فی الحقیقت خدا سے جدا نہیں ہے بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس سے متصل ہے، جڑی ہوئی ہے۔ صوفی کہتا ہے کہ اگر خدا اور میری روح میں بااعتبار حقیقت کوئی شے ناموافق ہوتی تو خدا مجھے اپنی ذات سے محبت کا حکم نہ دیتا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ روح اس کے پاس سے آتی ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائے گی۔ تصوف ایک وجدانی کیفیت ہے۔''

''لیکن پروفیسر صاحب!'' ساجد نے مداخلت کی۔ ''اللہ نے جو سب سے قیمتی چیز انسان کو عطا کی ہے، وہ تو عقل ہے۔''

''ہاں ساجد صاحب۔'' پروفیسر دلاور نے وضاحت کی۔

''دراصل عقل اور وجدان کی بحث لاحاصل ہے۔ عقل کی عظمت سے انکار نہیں۔ عقل

تو متاعِ حیات ہے۔ عقل تو ودیعتِ خداوندی ہے۔ یہ تو ہمارے اندر کا میزان ہے۔ سود و زیاں کا پیمانہ۔ عقل تو زندہ رہنے کا سلیقہ سکھلاتی ہے۔ عقل کی عظمت سے تو انکار ممکن ہی نہیں۔ وجدان عقل سے جدا نہیں۔ اسی سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں عقل اپنے حدِ کمال کو پہنچ کر تھک جاتی ہے، عقل کی آنکھیں دھندلانے لگتی ہیں، عقل حیرت کے صحرا میں بھٹک جاتی ہے تو وجدان چپکے سے اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور اسے عشق کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ جہاں عقل ختم ہوتی ہے، وہاں سے عشق شروع ہوتا ہے۔ تصوف ایک عشق ہے۔ بے پناہ اور شدید عشق۔ اپنے خالق اور مالک سے۔ اپنے پیدا کرنے والے اور مار دینے والے سے۔ بے غرض، بے لوث، نہ صلہ کا مطالبہ نہ جنت کی طلب۔ بس عشق اور صرف عشق۔ بقول اقبال:

عقل سے عشق بہت آگے کی منزل ہے
بے خبر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

جہاں عقل متزلزل ہو، لرزاں و حیراں ہو، وہاں عشق مضبوط سہارا بن جاتا ہے۔ عشق ہی نے پہچان کی چاہت میں چھوٹے سے پرندے کو دیوانہ بنایا ہے۔ عشق کبھی بھنورے کو شعلہ میں ضم کر دیتا ہے۔ عشق کی دیوانگی میں پروانہ شمع کے گرد مستانہ وار جھومتا ہے۔ اسے معلوم ہے شعلہ جلا دے گا۔ آگ ہے فنا کر دیتی ہے لیکن وہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس کی جبلت میں فنا ہونا ہے۔ وہ موت کا رقص کرتا ہوا شعلے میں فنا نہیں ہوتا، ابدی حیات پا جاتا ہے۔ اسی فنا میں اس کی بقا ہے۔ اسی موت میں اس کی زندگی ہے۔ اسی محبت میں اس کی قربانی ہے۔ اس کی دیوانگی میں مردانگی ہے۔ وہ حیات بعد از موت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ شعلے میں جل کر جلتا نہیں خود شعلہ بن جاتا ہے۔ محبوب میں فنا ہو کر محبوب کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے۔ کسی نے عشق سیکھنا ہو تو پروانے سے سیکھے جسے جینے اور مرنے کا قرینہ آتا ہے۔" پروفیسر زبیر نے روایتی انداز میں کہا۔

"لیکن اصل حقیقت تو مذہب کو حاصل ہے۔ مذہب جو شریعت ہے، قانون ہے۔ زندگی گزارنے کا ایک مکمل ضابطہ۔"

پروفیسر دلاور بولے: "مذہب کی بنیاد وحی پر ہے جس میں انسانی عقل کو دخل نہیں ہوتا۔ خدا خود اپنا پیغام اور احکامات اپنے کسی منتخب بندے (The Choosen one) پر نازل کرتا ہے۔ عبادات اور معاملات کا حکم دیتا ہے۔ Dos اور Donts بتاتا ہے۔ نیکی کی تلقین اور اس کے صلے کی بات کرتا ہے۔ برائی سے ڈراتا اور عذاب کی سزا بتاتا ہے۔ جنت اور دوزخ کا تصور اسی

بنیاد پر ہے۔ مذہب اور تصوف میں کوئی تصادم نہیں۔ سارے مذاہب میں تصوف کا تصور موجود ہے۔ خدا خالق کائنات ہے اور انسان اس سے رابطہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس رابطے کی بنیاد یہ ہے کہ خدا خود بندوں کو حکم دیتا ہے کہ اگر تم مجھے پکارو گے تو میں تمھیں جواب دوں گا۔ رابطہ پیدا کروں گا۔ اطاعت کرو گے تو جزا اور نافرمانی پر سزا اور اگر اطاعت کے بعد مجھ سے محبت کرو گے تو میں تم سے محبت کروں گا۔ اس محبت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری شخصیت میں میری صفات منعکس ہو جائیں گی۔''

ساجد صاحب بولے'' آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ مذہب اور تصوف دو جدا راہیں ہیں۔ شریعت اور طریقت میں کیا فرق ہے؟''

''نہیں ساجد، ایسا نہیں ہے۔'' پروفیسر ولاور نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' جن پر عقل کا غلبہ تھا، انہوں نے اطاعت کو کافی سمجھا۔ شریعت کی پیروی کی اور جنت کو مقصود بنالیا۔ جن لوگوں پر عشق کا غلبہ تھا۔ انہوں نے محبت کو ضروری سمجھا اور دیدار الٰہی کو مقصود بنالیا۔ ایسے سرمست لوگوں کو عرف عام میں صوفی کہتے ہیں۔''

پروفیسر زبیر پہلو بدل کر بولے:

''صوفی تو دنیا تیاگ دیتے ہیں۔ خلوت نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ حقیقی دنیا سے فرار حاصل کرتے ہیں۔ ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں۔ جنگلوں اور ویرانوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ انسانوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ مفرور ہو جاتے ہیں حقیقی دنیا سے۔ تلخ حقائق سے خود اپنی ذات سے۔''

پروفیسر ولاور بولے:''نہیں یہ حقیقت نہیں ہے۔ تصوف کے بارے میں کئی غلط فہمیوں نے جنم لیا ہے۔ تصوف کا وجود انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ مختلف زمانوں سے گزرا ہے۔ یہودیوں کے کاہن ترک دنیا کرتے تھے اور ان کا مقصد خدا سے رابطہ نہیں تھا بلکہ کچھ روحانی قوتیں یا مافوق فطرت صلاحیتیں حاصل کر کے دنیا کی لذتیں اٹھانا، ان کی زندگی کی طلب تھی۔ اس لیے ہر ترک دنیا کرنے والا ضروری نہیں صوفی بھی ہو۔ وہ شعبدہ باز بھی ہو سکتا ہے اور ہمارے ہاں تو ''ملامتی صوفی'' کا تصور بھی ملتا ہے۔ ملامتی صوفی ایک دیوانی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے اور اپنی مخصوص عادات اور اطوار سے پہچانا جاتا ہے۔ بابا بلھے شاہ ملامتی صوفی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

حقیقی دنیا میں انسان خدا کے دیدار اور اس کی محبت میں دیوانہ وار زہد و عبادت میں مشغول رہتا ہے جبکہ عام انسان خدا کے بجائے دنیا کو محبوب بنالیتا ہے۔ اس زمین سے پیوست ہو جاتا ہے۔ مال و دولت، دنیا اور رشتہ و پیوند میں جکڑا جاتا ہے جو حقیقی نہیں بتان وہم و گماں ہیں۔ جب وہ زن، زر اور زمین کا اسیر ہو جاتا ہے، ہوس و حرص کا بندہ بن جاتا ہے، خواہشوں کا غلام ہو جاتا ہے۔ لذت پسندی اور تساہل اس کے بدن کے تقاضے بن جاتے ہیں۔ خود غرضی اس کے اندر ڈیرے ڈال دیتی ہے۔ نفس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ ارتکاز زر اس کا مطمع نظر بن جاتا ہے۔ آدرشوں کی گود میں پلنے لگتا ہے۔ ضرورتوں کی تکمیل کے حصول میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں طمع و لالچ کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ اپنی انا کا بت تراش لیتا ہے۔ اپنی ذات میں محصور ہو جاتا ہے۔"

رابعہ نے جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں تو ندیم اسے دیکھ رہا تھا۔ Eye-contact ہوا تو جیسے جسم میں لہری دوڑ گئی۔ آنکھیں بولتی ہیں بلکہ دل کی زبان ہی آنکھیں ہوتی ہیں۔ سارے جذبے آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں۔ ایک محبت بھری نظر دل کی کائنات پلٹ دیتی ہے۔ ندیم کو بھی ایسا لگا جیسے رابعہ کی آنکھوں میں حسرتوں کے جگنو ہوں۔ نئی آرزوؤں نے روشنی کے چراغوں کی لو تیز کر دی ہو۔ امنگیں رقص کر رہی ہوں اور خواہشوں کے آبگینے جگمگا رہے ہوں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں جذبوں کا تبادلہ ہوا۔

پروفیسر ولا ور بول رہے تھے۔ "میں کوئی نئی بات نہیں بتا رہا اور نہ ہی کوئی نئی بات بتانے کو رہ گئی ہے۔

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا تھا

There is nothing new to be said.

یعنی دنیا میں کوئی چیز کہنے کو نئی نہیں۔

سقراط نے کہا "علم بہت ہیں اور عمر کم۔ وہ سیکھ جس سے سب علم آجائیں۔ ایک تو ظاہری علم ہے، اشیا کا علم سائنس، دوسرا باطنی علم (Knowledge of self) انسان ہی کائنات کا مرکز ہے۔

انسان ہی سب کچھ ہے۔ کائنات کو مسخر کرنے والا، ایٹم کے ذرے کو توانائی میں بدلنے والا۔ انسان ہی ایٹم بم گرا کر لاکھوں لوگوں کو لمحوں میں نابود کر دیتا ہے اور یہی انسان ہے جو

دکھی انسانیت کے لیے جان لڑا دیتا ہے۔ دوسروں کے لیے جان جیسی قیمتی چیز قربان کر دیتا ہے۔ اس لیے ذات کی پہچان بہت ضروری ہے۔ حدیث مبارک ہے:

''جس نے خود کو پہچان لیا۔ اس نے رب کو جان لیا۔ (Know than thyself) خود کو پہچانو۔ انسان کے اندر ایک کائنات پوشیدہ ہے۔''

پروفیسر زبیر اور ساجد غور سے سن رہے تھے۔ ندیم کی توجہ بھی مرکوز ہو گئی تھی۔ رابعہ کو شیکسپیئر کے وہ جملے یاد آ رہے تھے۔ جس میں ذات کے حوالے سے بات تھی۔ ہملٹ کے ہیرو نے کہا "To be or not to be that's the question"

''میں رہوں یا نہ رہوں۔ یہی تو سوال ہے۔'' اگلی لائنوں میں وہ کہتا ہے'' میں ہوں لیکن دکھوں کے تیر میرے سینے میں چبھ رہے ہیں۔ ذلت اور رسوائی دامن تھامے ہوئے ہے۔ وہ جو میں چاہتا ہوں، کر نہیں کرسکتا۔ جو سوچتا ہوں، وہ ہو نہیں پاتا۔ بس اس تضاد میں دکھ ہے۔ غم ہے، خود کلامی ہے۔ انتقام ہے۔'' ہیملٹ کا ہیرو بے عملی کے تضاد کا شکار ہو کر ذات کے اندر کی تلاش میں عقل و دانش کے موتی بکھیرتا ہے۔'' پروفیسر دلاور صاحب بول رہے تھے۔

''ذات کی تلاش ہی حقیقت کی تلاش ہے۔ مہاتما بدھ کو نروان ملنے کے بعد پوچھا گیا کہ آپ کو کیا ملا؟ تو وہ مسکرائے اور کہنے لگے'' یہ سب کچھ تو میرے پاس تھا مگر مجھے اس کی خبر نہیں تھی۔'' چوتھی صدی عیسوی کے سینٹ آ گسٹائن نے کہا:'' میں خدا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ خدا قریب ہے۔ یہیں کہیں پر ہے۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ خدا تو میرے اندر ہے۔'' خدا کی تلاش کا سفر خود سے شروع ہو کر خودی پر اور خدا تک جا کر پھر خودی پر ختم ہو جاتا ہے۔''

''لیکن پروفیسر انکل!'' ندیم نے ادب سے پوچھا'' اگر خدا کی ذات اندر ہی پوشیدہ ہے تو اتنی بڑی کائنات کو چلانے والا، پالنے والا اور مارنے والا، ستاروں، سیاروں اور نظام شمسی کو گردش میں رکھنے والا، ایک بلند و بالا، ایک طاقتور، قہار اور جبار کی خوبیاں رکھنے والا خدا کہاں ہے۔ ساتوں آسمان پر، کسی اور سیارے پر، آخر ہے کہاں؟''

پروفیسر دلاور بولے'' شاباش ندیم بیٹے، یہ سوالات ذہن انسانی میں پیدا ہوتے ہیں لیکن انہیں عقلی اور استدلالی اصول پر پرکھو گے اور ریاضی کے اعداد اور دلیل کی طاقت سے تلاش کرو گے تو مشکلات کا شکار ہو جاؤ گے۔ برٹرینڈ رسل جیسے ذہین انسان نے why I am not a Christian میں cause and effect علت و معلوم کی بحث کو یہاں تک لے گیا کہ اگر

Ultimate آخری (effect) علت خدا ہے تو اس کا (Cause) کیا ہے۔ خدا نے سب کچھ پیدا کیا تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔ یہیں سے وہ گمراہ ہو گیا کیونکہ خدا کوئی Mathematic Puzzle نہیں ہے۔ عقل گمراہ کر دیتی ہے۔ اگر اس کا دامن یقین سے خالی ہو۔ اعتقاد سے محروم ہو۔"

پروفیسر وا اور بولتے گئے۔ قرآن مجید میں ہے "اللہ تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ عرش اور فرش پر موجود ہے۔ ہر جگہ ہے۔" کسی فلاسفر نے کہا ہے:

"خدا کے بارے میں کبھی نہ پوچھو۔ اگر آپ اسے دیکھ نہیں سکتے تو آپ کے پاس دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے۔ اگر آپ اسے سن نہیں سکتے تو آپ کے پاس قوتِ سماعت نہیں ہے۔ آپ بہرے ہیں۔ اگر آپ اسے محسوس نہیں کر سکتے تو آپ کے پاس حساسیت نہیں ہے۔ محسوس کرنے والی صلاحیت نہیں ہے۔ خدا کو سمجھنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ خدا کہیں دور نہیں ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ یہاں اس وقت اس کمرے میں موجود ہے بلکہ اس خالی کرسی پر براجمان ہے۔ ہماری باتیں سن رہا ہے۔ جو کچھ بھی ہے، وہ خدا میں ہے، اور وہ خدا ہے۔" پروفیسر زبیر بولے:

"لیکن اس نے ہمیں تخلیق کیا۔ وہ ہمارا خالق ہے۔ خالق، خلق کرتا ہے۔ خالق اور مخلوق میں فرق ہے۔ خالق خالق ہوتا ہے۔ مخلوق، مخلوق ہوتی ہے۔ خدا اور بندہ دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ خدا لافانی ہے۔ انسان فانی ہے۔ خدا ازل سے لے کر ابد تک رہے گا، بندے کی عمر تو مختصر ہے۔ میں نظریہ حلول کو نہیں مانتا۔ کچھ بھی ہو جائے، انسان روحانیت کی ساری منزلیں طے کر جائے۔ سلوک کے سارے مرحلے عبور کر جائے، خدا خدا ہے اور بندہ بندہ ہے۔" پروفیسر زبیر صاحب لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"بہت سے راز ہیں۔ راز ہی رہنے چاہئیں۔

جناب شیخ عبدالقادر جیلانی سے سوال کیا گیا کہ منصور الحاج کے انا الحق کہنے اور حضرت بایزید بسطامی کے سبحانی اعظم شانی کہنے میں کیا راز ہے؟ تو انہوں نے جواب نہ دیا۔ لوگوں نے زیادہ اصرار کیا تو کہنے لگے، میں کسی کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ یہ راز بتاؤں۔ بہت سے راز ہیں جو بتائے نہیں جا سکتے، سمجھائے نہیں جا سکتے۔ تمام مذاہب میں خدا کا تصور ایک جیسا ہی ہے۔ بھگوت گیتا میں شری کرشن مہاراج نے ارجن کو جو تعلیمات دیں، بھگوت گیتا میں لوگ شاستر یعنی تصوف موجود ہے۔ شری کرشن نے ارجن سے کہا:

"اس فانی دنیا کی لذتوں سے قطع نظر کر کے برم آتما (خدا) سے دل لگاؤ اور صرف اسی

کو اپنا محبوب بناؤ۔ عمل صالح ضرور کرو مگر نیت یہ رکھو کہ دوسروں کو فائدہ پہنچانا میرا پرم دھرم ہے۔ کسی شخص سے اپنی نیکو کاری کے صلے یا معاوضے کی توقع نہ رکھو۔ اسے نشکام کرم (عمل بے غرض) کہتے ہیں۔

خدا تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں، لہٰذا کسی کو دوسروں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اصل چیز محبت الٰہی ہے۔ جو شخص خدا کا طالب ہے، وہ کسی کو برا نہیں کہہ سکتا۔ سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو محبت کے دائرے کے اندر لاتا ہے۔ دائرے سے باہر نہیں نکالتا۔ مذاہب کی تقسیم اور فرقوں کو اختراع Exclude کرتی ہے یا سچائی کے دائرہ سے باہر نکالتی ہے جبکہ Include کرنے سے حق اور سچائی کا دائرہ پھیلتا ہے۔ فکری تصادم جنم نہیں لیتا، کروسیڈ نہیں ہوتے۔ خوفناک جنگیں نہیں ہوتیں۔ پوری انسانیت ایک دائرے میں سمٹ آتی ہے۔

خدا کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہر اس انسان کا فرض ہے جو اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے ہندی اصطلاح میں شرنا گتی کہتے ہیں۔ خدا ہر شے میں پوشیدہ ہے اور ہر شے سے ظاہر ہے۔ پرم اتما، گیتا میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس کائنات میں کوئی شے حقیقی معنوں میں موجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے یہ سب ایک خدا کی جلوہ گری ہے۔ گیتا میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کی چند مثالیں سناتا ہوں۔" پروفیسر دلاور روانی سے بول رہے تھے۔

"اے ارجن سورج کی چمک دمک میرا ہی نور ہے۔ چاند میں چاندنی بھی میں ہی ہوں۔ آگ کی گرمی اور روشنی میرے ہی دم سے ہے۔" (12-15)

"میں سب کے دلوں میں پوشیدہ ہوں۔ انسانوں میں قوتِ حافظہ اور قوتِ ادراک مجھ سے ہی ہے۔" (15-16)

"میں ہی وشنو ہوں۔ میں ہی سورج میں ہوں، میں ہی اندر میں ہوں، میں ہی من میں ہوں، میں انسانوں میں شعور ہوں، میں ہی سام وید ہوں، شنکر میں ہوں، اگنی میں ہوں، میرو پربت میں ہوں، سمندر میں میں ہوں۔ میں اوم ہوں، ہمالیہ میں ہوں، میں آغاز ہوں، میں انجام ہوں۔ میں زمان و مکاں ہوں۔ میں پھولوں کی بہار ہوں۔ میں صداقت ہوں۔ میں دانائی ہوں۔ میں قوت و جلال ہوں۔ مجھ سے سارا جہاں معمور ہے۔ میرے ظہور کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں قیوم کائنات ہوں۔" (10-21 تا 43)

"اتما (روح) قائم و دائم ہے۔ لازوال ہے۔ حوادث سے متغیر نہیں ہوتی اور نہ اسے

موت آتی ہے۔"(23-18-17)

"انسان جس چیز کو اپنا مقصود بنائے گا، وہ اسے ضرور پائے گا۔"(25-9)

پروفیسر ولاور نے بات سمیٹتے ہوئے کہا:

"ویدانتی تصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(1) دنیائے فانی سے دل مت لگاؤ۔

(2) خدا کو اپنا مقصود بنالو۔

(3) اس سے محبت کرو تا کہ اسے حاصل کرسکو۔

(4) خدا اپنے عاشقوں کے دلوں میں رہتا ہے۔

(5) جو اسے چاہتا ہے۔ وہ اسے ضرور اپنے درشن دیتا ہے۔

(6) ساری زندگی اس کے لیے بسر کرو۔

(7) نیک اعمال بجالاؤ مگر نیت یہ ہو کہ خدا مجھ سے خوش ہو۔

(8) سب انسانوں سے محبت کرو۔

(9) یہ دنیا خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر شے مظہر خدا ہے۔

(10) عارف کو ابدی مسرت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی تصوف کی روح ہے۔ یہی گیتا کا اُبدیش ہے۔"

پروفیسر ولاور نے گفتگو تمام کردی۔ سب لوگ ایسے خاموش تھے جیسے کسی نے اُن پر سحر کر دیا ہو۔ مبہوت، مجسموں کی طرح۔

پروفیسر نے کہا" کھانا لگ گیا ہے۔ آیئے ڈائننگ ٹیبل پر باقی باتیں ہوں گی۔"

ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا ڈائننگ روم تھا۔ ایک لکڑی کا ڈائننگ میز اور چھ کرسیاں۔

کھانا لذیذ تھا لیکن زیادہ پرتکلف نہیں تھا۔

پروفیسر ولاور نے مٹن پلاؤ کی ڈش بڑھاتے ہوئے کہا:

"مسلمانوں کی یہ ڈش پلاؤ اپنی مثال آپ ہے۔ بکرے کے گوشت کی یخنی میں بنے ہوئے چاول توانائی کا خزانہ ہیں۔ یہ اعلیٰ درجے کی خوراک ہے جس کا مغرب میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ہمارے شہر پشاور میں جو افغانی پلاؤ بنایا جاتا ہے جس میں گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں، بادام، پستہ، گری اور کشمش ہوتے ہیں اور جو زعفرانی رنگ دیا جاتا ہے، یہ ایک لذیذ اور توانائی سے

بھرپور ڈش ہے۔"

چپل کبابوں کی پلیٹ ساجد صاحب کو پکڑاتے ہوئے کہا: "لیجیے یہ چپل کباب میں نے خصوصی طور پر سرحد ہوٹل سے منگوائے ہیں۔ ایک اور ڈش جو پٹھانوں کی پسندیدہ خوراک ہے۔ وہ "دم پخت" قبائلی علاقوں میں دم پخت کھانے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ سالم بکرے کے پیٹ میں چاول، پنیر اور ہلکے مصالحے ڈال کر اسے بند کر دیا جاتا ہے اور زمین میں منکوں پر دبا کر پخت کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک نایاب ڈش ہے اور دنیا کی بہترین خوراک۔ سجی جو بلوچی ڈش تھی، اب لاہور میں عام مل جاتی ہے۔ چکن اور لیمب لیگ بھی مزیدار ہیں۔"

سب نے چپل کبابوں کی تعریف کی۔

پروفیسر نے ڈونگا رابعہ کو پکڑاتے ہوئے کہا "یہ سرسوں کا ساگ ہے جس میں سفید سفید چیز مکھن ہے اور بیٹا یہ مکئی کے آٹے کی روٹیاں خاص طور پر بنائی گئی ہیں جو بہت محنت طلب کام ہے۔"

ندیم اور ساجد تو جیسے ترسے ہوئے تھے، خوب جی بھر کر کھا رہے تھے۔

ندیم نے پوچھا "دلاور انکل، یہ سرسوں کا ساگ کھیتوں میں اُگتا ہے۔" سب ہنس پڑے۔ دلاور صاحب نے وضاحت کی۔

"بیٹا یہ پنجاب کی خاص ڈش ہے اور پالک گوشت اور سرسوں کا ساگ پنجاب کے دیہات میں بہت زیادہ کھایا جاتا ہے۔ گاؤں میں ہر گھر میں ایک چھوٹا سا تندور ہوتا ہے جس میں گندم، مکئی کی روٹی کی ایک خاص مہک ایک سوندھی سوندھی خوشبو ہوتی ہے جو بھوک کو بھڑکا دیتی ہے (Appettizer) کی طرح۔"

رابعہ بولی "انکل قیمہ بھرے کریلے بھی بہت پسند کیے جاتے ہیں اور میں بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں کھیر بھی بہت اچھی بناتی ہوں۔"

ندیم تڑپ کر بولا "تو پھر کسی دن آپ کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھائیں گے۔"

پروفیسر زبیر نے کہا "کیوں نہیں، پرسوں آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ سب کو دعوت ہے۔ رابعہ بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔"

پروفیسر دلاور نے ہنستے ہوئے کہا "کھیر کے بارے میں پنجابی بہت جذباتی ہیں۔ پنجابی ادب ہیر وارث شاہ ہے۔ میاں محمد کے کلام میں خوبصورت چیز کے طور پر کھیر کا ذکر ملتا ہے۔

یہ خالص دودھ اور چاولوں کا مرکب ہے جس کی اپنی ملائمت اور مٹھاس ہے لیکن چینی کے امتزاج سے یہ ایک انتہائی مزیدار سویٹ ڈش بن جاتی ہے۔"

پروفیسر زبیر نے مداخلت کی:

"پروفیسر دلاور صاحب! آپ بھگوت گیتا میں تصوف کے تصور کا ذکر کر رہے تھے جو انتہائی خوبصورت بیان ہے۔ حقیقت اعلیٰ تک پہنچنے کے سارے رستے ہی انتہائی خوبصورت ہیں۔"

ساجد نے پوچھا: "کیا یہودی، عیسائی اور مسلمان تصوف پر یقین نہیں رکھتے؟ کچھ بتائیے۔"

"جی ساجد صاحب، بات ذرا طویل ہے۔ صبر سے سننی پڑے گی۔ پہلے میں نے آپ کو قبل مسیح کے ہندو رشیوں کے اپنشدوں سے روشناس کرواتا ہوں "برہم سوتر" ان کا خلاصہ ہے۔

اب یونان کے مشہور مفکر اور صوفی حکیم فلوطین (Plitoteen) کی بات کرتے ہیں۔

اس کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ فلوطین ہمیں عقلی استدلال کی تنگ گلی سے نکال کر روحانی دنیا کی وسعت سے روشناس کرواتا ہے۔ یہ دنیا پاکیزہ افکار کی دنیا ہے۔ روحانی سرور اور اطمینان قلب کی دنیا ہے۔ اس روحانی دنیا میں داخل ہونے کے لیے فلوطین ہمیں مشورہ دیتا ہے کہ ظاہری آنکھوں کو بند کر دو تا کہ باطنی آنکھیں کھل سکیں۔

فلوطین بھی شری شنکر کی طرح نظریہ حلول یا اتحاد کا شدید مخالف ہے۔ اس کا فلسفہ حلول (Pantheism) نہیں ہے بلکہ وحدت الوجود ہے۔ الواحد کائنات میں تبدیل نہیں ہوتا، تحلیل نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ کائنات سے ماورا یا بلند رہتا ہے۔ اس کے تین نکات ہیں:

(1) حقیقت کی طلب اور اس تک پہنچنے کے لیے مجاہدہ کرنا۔

(2) محبت ایک "حال" ہے جو مشاہدہ حقیقت سے سالک پر طاری ہو جاتا ہے۔

(3) معرفت (Gnosis) حقیقتِ کاملہ (Ultimate reality) تک پہنچ جانے کا نام ہے۔ یہاں پہنچ کر عارف انسانِ کامل ہو جاتا ہے۔

اب آتے ہیں یہودی تصوف کی طرف۔ یہودی تصوف کا نظریہ یہودی شخص یہودی آئزک لیوریا (72-1543) نے متعارف کروایا۔ ان کے نزدیک آئزک لیوریا کے روپ میں مسیحا کو پا چکے ہیں۔ وہ سفیڈ (Safed) میں آباد تھا۔ اس نے نئی اسطورہ پیش کی تھی۔ اس نے قبالہ جو یہودی تصور تصوف تھا، اسے ایک نئے روپ میں متعارف کروایا جو آج کل بھی اس کے نام سے منسوب ہے۔ لیوریا کے نظریات ساری دنیا کے یہودیوں کے لیے راحت اور امید کی روشنی

بن گئے۔ لیوریا کے پیروکار یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس نے اسطورہ کو بنایا تھا بلکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اسطورہ نے خود کو اس پر منکشف کیا تھا۔ لیوریا کی بیان کردہ رسومات اور مراقباتی مشقیں اور ریاضتیں جلاوطنی کے طویل عرصے کے بعد صدمے سے دوچار یہودیوں کے لیے یہ متھوس (Mathos) مکمل طور پر بامعنی تھی۔ سفیڈ کے قبالائی (Kablalist) نے یہودیوں کی تاریک زندگی کو روشن کر دیا اور زندگی کو نہ صرف قابل برداشت بلکہ پر مسرت بنا دیا۔ کسی واقعے کے متعلق کہا جاتا تھا کہ تاریخی طور پر وہ بار بار رونما ہوگا کیونکہ تمام ارضی واقعات ہستی کے بنیادی قوانین ہی کا اظہار کرتے ہیں مثلاً بائبل میں درج ہے کہ اسرائیلیوں کے لیے دو مرتبہ دریا معجزانہ طور پر تقسیم ہو گیا۔ قرآن مجید میں ایک واقعہ کا تذکرہ ہے۔ جب حضرت موسیٰ یہودیوں کو فرعون مصر کے ظلم وستم سے بچانے کے لیے دریائے نیل عبور کرنے لگے تو دریا تقسیم ہو گیا اور حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل اس میں سے بآسانی گزر گئے۔ (Exodus) لگتا ہے۔ سپین کے المیے کے بعد جب عیسائی بادشاہ فرڈینڈس اور اس کی خونخوار ملکہ ازابیل (Fernandus & Azabale) نے ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے تھے اور یہودیوں کو زبردستی عیسائی بنایا اور بقایا کو گیٹوز (Gatoos) میں رکھا۔ یہودیوں کی ہستی کی عین بنیاد کو ہی غیر متوازن کر دیا تھا۔ لیوریائی قبالہ دوبارہ آغاز کی طرف لوٹنے کی بات کرتا ہے۔

اس کا آغاز اس سوال سے ہوتا ہے کہ اگر خداوند ہر جگہ موجود ہے تو پھر دنیا کس طرح وجود رکھ سکتی ہے۔ اس کا جواب زم زم (Zim-zum) یعنی پسپائی کا نظریہ ہے۔ ان کے مطابق خداوند جیسے قبالائی آئن سوف (Ein Sof) یعنی لامحدود کہتے ہیں جو لامحدود اور ناقابل رسائی ہے۔ خود کو اپنے اندر محدود کر لیا تاکہ دنیا کو جگہ مل جائے۔ چنانچہ تاریخ ایک الوہی بے رحمی سے شروع ہوئی تھی۔ آئن سوف نے خود کو اپنی مخلوق میں اور مخلوق کے لیے معلوم بنانے کے لیے اپنے ایک حصے پر جلاوطنی نافذ کر لی۔

جب ایڈم (Adam) تخلیق ہوگا تو وہ اس صورتحال کو درست کر پائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ الوہی جلاوطنی پہلی سبت کو ختم ہوئی۔ یہودیوں میں جلاوطنی ہستی کا ایک بنیادی قانون تھی۔ ہولوکاسٹ (Holocaust) کے المیے کے بعد کچھ لوگوں نے سمجھا کہ وہ خدا کو صرف ابتلا زم زم کی کمزور الوہیت جو کہ تخلیق کے قابو میں نہیں ہے، باطنی حیثیت سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ سیفڈ میں قبالائیوں نے لیوریا کی الٰہیات کے لیے خصوصی رسومات وضع کیں۔ انہوں نے شخینا سے ہم آہنگی

کے لیے خصوصی رسومات وضع کیں۔ وہ شخینا کو ایک عورت تصور کرتے تھے جو اپنے الوہی سرچشمے سے دوبارہ ملنے کے لیے دنیا میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ یہودی آدمی رات کو جاگتے، ننگے پاؤں روتے اور منہ پر خاک ملتے تھے۔ ان رسومات سے ان کے اپنے رنج وغم کا اظہار ہو جاتا۔

وہ ساری ساری رات جاگتے رہتے اور عاشقوں کی طرح خدا کو یاد کرتے رہتے اور اس درد کی وجہ سے گریہ اور زاری کرتے۔ تکون (Tikkum) کے عمل کے طور پر فاقے کیے جاتے، کوڑے جھیلے جاتے، برف پر لیٹا جاتا تھا۔

مراقبے کے حوالے سے قبالائیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ تصور کریں کہ ان کا ہر عضو الوہی ہستی کا ارضی معبد ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب تلقین کرتے ہیں کہ جب تک روحانیت عملی رحم دلی میں رونما نہیں ہوتی، وہ بیکار ہے اور لیوریائی قبالہ بھی اسی بصیرت کو پیش کرتا تھا۔ دوسروں کو نقصان پہنچانے والی غلطیوں کا سخت کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ جنسی استحصال پر، بہتان طراز پر، اپنے روفقا کی تحقیر پر اور والدین کی نافرمانی پر۔"

پروفیسر زبیر نے کہا "یہودی تصوف نہایت پیچیدہ تصور ہے جس کے خدوخال بالکل واضح نہیں ہیں۔"

پروفیسر رفیق ایک اسلامی سکالر نے کہا کہ "تصوف کی بڑی سادہ سی تعریف ہے اور وہ یہ ہے کہ جس شخص نے مناسب عمر میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں فلسفہ ترجیحات پر غور کروں گا اور میری زندگی کی اولین ترجیح میرا رب ہے تو وہ صوفی ہے۔"

ندیم جو اب تک دلچسپی سے ساری بات سن رہا تھا، وہ ان خیالات و تصورات سے بالکل نابلد تھا۔ اسے پہلی مرتبہ مذہب کی روح اور اس کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ اس نے کہا:

"پروفیسر انکل، اب اسلامی تصوف کے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"ندیم بیٹے، تصوف کے لغوی معنی تو ہیں صدف کا لباس پہننا لیکن اصطلاحی معنی میں نفس کا تزکیہ اور تجلیا کرنا تاکہ آئینۂ قلب میں عکس رخ یار منعکس ہو سکے۔ مسلمانوں میں تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ اسلامی تصوف جو قرآن و حدیث اور اتباع صحابہ سے ماخوذ ہے اور غیر اسلامی تصوف جسے اس بوتل سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے لیبل پر شربت گلاب لکھا ہو مگر اندر انگور کی وائن ہو۔ اسلامی تصوف کی اصل بنیاد دیدار رب کی آرزو ہے۔ اس کی بنیاد اس قرآنی آیت پر ہے۔"

دل سے مکمل طور پر خارج کر دیتا ہے اور اللہ کو اپنا محبوب بنالیتا ہے اور صرف صوفی ہی ایسا کر سکتا ہے اور جب ایک شخص ایسا کرتا ہے تو وہ خود بخود صوفی بن جاتا ہے۔ تصوف قرب الٰہی کی تلقین کرتا ہے اور صوفی قرب الٰہی کا خواہاں ہوتا ہے۔ آیت قرآنی ہے:

"بے شک اللہ ساتھ ہے ان لوگوں کے جو متقی بھی ہیں اور محسن بھی ہیں۔" (128:16)

ہمارے صوفیائے اکرام نے سلوک کے تمام بنیادی اصول انہی آیات مقدسہ سے حاصل کیے ہیں۔

ذکر و فکر، مراقبہ، مجاہدہ۔ یہ سب لوازم سلوک ہیں۔ مقصود صرف یہی ہے کہ نفسِ امارہ مغلوب ہو جائے۔ شیخ سالک کو ذکر اسم ذات کی تلقین کرتا ہے۔ یہ تلقین اس آیت سے ماخوذ ہے۔

"واذکر اسم ربو کا" (یعنی اپنے رب کے نام کو یاد کر)

تصوف یہی ہے کہ لذات دنیا سے قطع کرنا یا دنیا کو مقصود نہ بنانا بلکہ دنیا میں رہ کر اس سے دل نہ لگانا۔"

"لیکن دلاور صاحب، اسلام میں ترک دنیا مقصود نہیں ہے۔ اسلام ایک طرز زندگی ہے۔ راہ حیات ہے۔ ایک معاش ہے، ایک معاشرت ہے۔" پروفیسر زبیر نے جذبے سے بولتے ہوئے کہا: "شادیاں کرنا، گھر بسانا، نسل انسانی پیدا کرنا۔ کائنات کو تسخیر کرنا۔ یہ غیر اسلامی کیسے ہو گئے؟ اسلام تو عین دین فطرت ہے۔ خلاف فطرت تو نہیں ہے۔"

پروفیسر دلاور دھیمے لہجے میں بولے "میں ترک دنیا کی بات نہیں کر رہا۔ میں دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے دل نہ لگانے کی بات کر رہا ہوں۔ دنیا سے دل لگانا، ہوس، لالچ، غلبہ، انا پرستی، تکبر اور رعونت کو جنم دیتا ہے۔ کینہ، حسد، دشمنی اور انتقام کی آبیاری کرتا ہے۔ ایسا انسان جو حب دنیا اور عیش و عشرت میں مشغول ہو جائے، انا کا بت بنا لے۔ دولت کا پجاری بن جائے۔ ہوس کا غلام ہو جائے۔ حرص کی پیروی کرنے لگے۔ نفس کو ترجیح دینے لگے۔ وہ بدتر انسان بن کر رہ جاتا ہے۔ خدا ایسے انسان کو اپنا دوست نہیں رکھتا۔"

"مگر پروفیسر انکل!" ندیم نے چپکے سے کہا۔

"آج کی دنیا تو مادہ پرست ہے۔ مغرب تو حصول دولت ہی کو زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ آج کی دنیا میں ڈالر کو سب سے طاقتور (Almighty) کہا جاتا ہے۔ ڈالر میں ایک قوت

بن گئے۔ لیوریا کے پیروکار یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس نے اسطورہ کو بنایا تھا بلکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اسطورہ نے خود کو اس پر منکشف کیا تھا۔ لیورا کی بیان کردہ رسومات اور مراقباتی مشقیں اور ریاضتیں جلاوطنی کے طویل عرصے کے بعد صدمے سے دوچار یہودیوں کے لیے یہ متھوس (Mathos) مکمل طور پر بامعنی تھی۔ سفیڈ کے قبالائی (Kablalist) نے یہودیوں کی تاریک زندگی کو روشن کر دیا اور زندگی کو نہ صرف قابل برداشت بلکہ پر مسرت بنا دیا۔ کسی واقعے کے متعلق کہا جاتا تھا کہ تاریخی طور پر وہ بار بار رونما ہوگا کیونکہ تمام ارضی واقعات ہستی کے بنیادی قوانین ہی کا اظہار کرتے ہیں مثلاً بائبل میں درج ہے کہ اسرائیلیوں کے لیے دو مرتبہ دریا معجزانہ طور پر تقسیم ہو گیا۔ قرآن مجید میں ایک واقعہ کا تذکرہ ہے۔ جب حضرت موسیٰ یہودیوں کو فرعون مصر کے ظلم وستم سے بچانے کے لیے دریائے نیل عبور کرنے لگے تو دریا تقسیم ہو گیا اور حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل اس میں سے بآسانی گزر گئے۔ (Exodus) لگتا ہے۔ سپین کے المیے کے بعد جب عیسائی بادشاہ فرریندس اور اس کی خونخوار ملکہ ازابیل (Fernandus & Azabale) نے ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے تھے اور یہودیوں کو زبردستی عیسائی بنایا اور بقایا کو گیٹوز (Gatoos) میں رکھا۔ یہودیوں کی ہستی کی بین بنیاد کو ہی غیر متوازن کر دیا تھا۔ لیوریائی قبالہ دوبارہ آغاز کی طرف لوٹنے کی بات کرتا ہے۔

اس کا آغاز اس سوال سے ہوتا ہے کہ اگر خداوند ہر جگہ موجود ہے تو پھر دنیا کس طرح وجود رکھ سکتی ہے۔ اس کا جواب زم زم (Zim-zum) یعنی پسپائی کا نظریہ ہے۔ ان کے مطابق خداوند جیسے قبالائی آئن سوف (Ein Sof) یعنی لامحدود کہتے ہیں جو لامحدود اور ناقابل رسائی ہے۔ خود کو اپنے اندر محدود کر لیا تاکہ دنیا کو جگہ مل جائے۔ چنانچہ تاریخ ایک الوہی بے رحمی سے شروع ہوئی تھی۔ آئن سوف نے خود کو اپنی مخلوق میں اور مخلوق کے لیے معلوم بنانے کے لیے اپنے ایک حصے پر جلاوطنی نافذ کر لی۔

جب ایڈم (Adam) تخلیق ہوگا تو وہ اس صورتحال کو درست کر پائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ الوہی جلاوطنی پہلی سبت کو ختم ہوئی۔ یہودیوں میں جلاوطنی ہستی کا ایک بنیادی قانون تھی۔ ہولوکاسٹ (Holocaust) کے المیے کے بعد کچھ لوگوں نے سمجھا کہ وہ خدا کو صرف ابتلا زم زم کی کمزور الوہیت جو کہ تخلیق کے قابو میں نہیں ہے، باطنی حیثیت سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ سیفد میں قبالائیوں نے لیوریا کی الہیات کے لیے خصوصی رسومات وضع کیں۔ انہوں نے شخینا سے ہم آہنگی

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

دنیا ہر لمحہ تغیر پذیر ہے۔ ایک تغیر پذیر لمحے میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔"

رابعہ نے اچانک بھرپور نظروں سے ندیم کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں چاہت تھی۔ ایک لمحہ کی نظر التفات۔ ایک محبت بھری نگاہ، لمحہ بھر میں دل میں شگوفے کھلا دیتی ہے۔ امنگوں کے چراغ روشن کر دیتی ہے۔ لمحہ بھر کی مسکراہٹ خوشی اور شادمانی کی شہنائیاں بجا دیتی ہے۔ دل کی نازک رگوں کو چھیڑ دیتی ہے۔ روح میں وجدان اور جسم میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے اور اسی ایک لمحے میں نفرت کا ایک لفظ، ایک گالی، گولی بن کر جسم کے آر پار ہو جاتی ہے۔ دل کو چیر دیتی ہے۔ روح کو مضمحل کر دیتی ہے۔ زندگی کو بوجھل بنا دیتی ہے۔ دنیا میں وہی ایک ساعت، وہی ایک گھڑی، ہی ایک لمحہ ہزاروں زندگیوں کو جنم دیتا ہے اور ہزاروں لوگوں کو موت کی ابدی نیند سلا دیتا ہے۔ اسی ایک لمحے میں کتنے بے چین دل سکون آمادہ ہوتے ہیں۔ کتنے پیار کرنے والے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ اسی لمحے میں کتنے ہی پیار بھرے دل وصال کی راحت اور ملاپ کی لذت سے آشنا ہوتے ہیں اور اسی لمحے میں کتنے جاں بلب لوگ خاموشی سے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ وجود سے عدم میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ کتنے دل غم و اندوہ سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ ایک لمحہ وصال اور ایک لمحہ جدائی۔ اسی لمحے میں کتنی ماؤں کی گود بھری ہو جاتی ہے اور کتنی بدنصیب ماؤں کی کوکھ اجڑ جاتی ہے۔ لمحوں کی زندگی ہی داستان حیات ہے۔ لمحوں کی موت ہی مر مر کر جئے جانے کا نام ہے۔ فانی بدایونی نے خوب کہا:

ہر لمحہ عمر گشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

لیکن وقت تو ظالم ہے۔ کہیں توڑتا ہے تو کہیں جوڑتا ہے۔ کہیں آباد کرتا ہے تو کہیں اجاڑ دیتا ہے۔ وقت عبرت کا نشان بھی ہے۔ وقت تخت و تاج کو تاراج کرتا ہے۔ پامال کرتا ہے۔ بادشاہ کو گدا اور امیر کو فقیر بنا دیتا ہے۔ یہ چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو چھوٹا کر دیتا ہے۔ یہ کہیں ذرے کو آسمان بنا دیتا ہے تو کہیں غرور و تکبر کے بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ نامکمل کو مکمل اور نا تمام کو تمام کر دیتا ہے۔ یہ بھرے ہوئے کو خالی کرتا اور خالی کو بھر دیتا ہے۔ یہ کائنات کی تکمیل کر رہا ہے۔ تغیر ہی اصل حقیقت ہے۔ یہ جو لمحہ ظہور پذیر ہوتا ہے، کہیں رکتا نہیں۔ کائنات رکی ہوئی نہیں ہے۔ پیہم

پروفیسر دلاور نے ترجمہ سناتے ہوئے کہا:
"بس وہ شخص جو اپنے رب سے ملاقات کا آرزومند ہو، اسے لازم ہے کہ اعمال صالح بجالائے اور اپنے رب کی اطاعت میں کسی کو شریک نہ کرے۔" (آیت نمبر 18-17)
اسلامی تصوف کے عناصر ترکیبی تین ہیں: (1) کامل توحید (2) کامل تقویٰ (3) کامل محبت۔"
"لیکن دلاور صاحب، یہ تینوں خوبیاں جو آپ نے ابھی بیان کی ہیں یہ تو ایک اچھا انسان اور مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ پھر آپ انہیں تصوف سے کیوں جوڑ رہے ہیں؟ میں اسلامی یا غیر اسلامی تصوف کا قائل نہیں۔ تصوف بس تصوف ہوتا ہے۔"
"نہیں زبیر صاحب۔" پروفیسر دلاور نے خانساماں کو گرین ٹی بنانے کا کہتے ہوئے کہا
"میں تصوف کو اسلامی اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ اس کا ماخذ قرآن مجید ہے۔ آیتِ قرآنی ہے۔"
ترجمہ:
(1) "بس وہ ہر شے کا اول ہے اور ہر شے کا آخر ہے اور ہر شے کا ظاہر ہے اور ہر شے کا باطن ہے (یعنی وہی وہ ہے اور ہر شے کی ماہیت سے آگاہ ہے۔" (3:57)
یہ توحید کا نظریہ ہے کہ وہ ہر شے کی حقیقت یکتا ہے۔ خدا ایک ہے۔ خدا ہر چیز پر محیط ہے۔ لاشریک ہے، یکتا ہے، واحد ہے۔
قرآنی آیت ہے:
(2) "بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور محسن بھی ہیں۔" (128:16)
ایک اور مختصر آیت ہے:
"اور وہ لوگ جو مومن ہیں، وہ سب سے زیادہ محبت اللہ ہی سے کرتے ہیں۔" (165:2)
محبت کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس لیے تصوف جب انسان کو محبت کی تلقین کرتا ہے تو گویا اس کے فطری تقاضے کی تکمیل کا سامان مہیا کرتا ہے۔
مختصراً ایک سالک کی زندگی انہیں تین اجزا سے مرکب ہوتی ہے۔ وہ محبوب حقیقی سے جو واحد لاشریک ہے، محبت کرتا ہے اور ہر وقت یہ دیکھتا رہتا ہے (اسی کو مراقبہ اور محاسبہ کہتے ہیں) کہ کوئی قول یا فعل محبوب کی مرضی کے خلاف سرزد نہ ہو۔
اسی لیے صوفی دنیا (یعنی عورت، دولت، زمین، مکانات، تجارت) کی محبت کو اپنے

اور مسلسل حرکت میں ہے۔ تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے۔ وقت دریا کی طرح بہتا رہتا ہے، رکتا نہیں اور اس میں بہاؤ ہے۔ تیز بہاؤ۔ اس طرح کائنات بھی مسلسل پھیل رہی ہے۔ وقت بھی رواں دواں ہے۔ تغیر پذیر ہے۔ وقت بدلتا رہتا ہے۔ رواں دواں ہے۔ ایک لمحہ جو بیت گیا، واپس نہیں آ سکتا۔ غالب نے کہا تھا:

''میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ نہ سکوں''

گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ وہ لمحہ اپنی ذات میں ایک کائنات ہے۔ ساری کائنات دے کر بھی اس لمحہ کو پلٹا نہیں جا سکتا۔ ایک لمحے کی غلطی عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔ خوشی کا ایک لمحہ زندگی بخش دیتا ہے اور دکھ کی ایک ساعت، غم واندوہ کا ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔ خوشی اور شادمانی کے لمحے رقص کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور دکھ کی ایک رات، انتظار کے چند لمحے کاٹے نہیں کٹتے۔ شب غم طویل ہو جاتی ہے اور وصال کی رات مختصر۔ ایک لمحے میں حادثہ ہوتا ہے۔ ایک پل میں سانحہ ہو جاتا ہے۔ کیا ہوتا ہے اور کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ایک لمحے میں محبوب کی ایک نگاہ جنت نظیر ہوتی ہے تو دوسرے لمحے میں اذیت ناک تیوری میں بدل جاتی ہے۔''

پروفیسر بولے'' یہ وقت کیا ہے۔ زمانہ کسے کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی خدا نے کہا ''انسان خسارے میں ہے ماسوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک عمل کیے، حق کا ساتھ دیا اور حق کی خاطر صبر کیا۔'' یہ وقت کی پہیلی (Puzzle) سمجھ میں نہیں آتی۔ دلاور صاحب کچھ بتائیے۔''

'' زبیر صاحب وقت کی تعریف بہت مشکل ہے۔'' پروفیسر دلاور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا:

'' بلکہ وقت کی کوئی جامع اور مکمل تعریف ممکن ہی نہیں۔ ہر مفکر نے اپنے اپنے انداز سے اسے سمجھا ہے۔ وقت کے بارے میں جدید ترین نظریہ آئن سٹائن کا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات زمان و مکان کا مجموعہ نہیں بلکہ خود ایک حقیقت ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ ''وقت'' موجودات یا اشیاء کا چوتھا بعد (Four Dimention) ہے کیونکہ اشیاء وقت میں ہی موجود ہو سکتی ہیں۔ اس کے خیال میں اگر وقت کا پھیلاؤ نہ ہو تو اشیاء کا موجود ہونا ممکن نہ رہے۔ وقت کو آسان زبان میں دریا سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ وقت کا دریا بہہ رہا ہے۔''

'' لیکن یہ دریا کہاں سے آیا اور کس طرف رواں ہے؟'' پروفیسر زبیر نے بے ساختہ

پوچھ لیا۔

پروفیسر دلاور نے دلیل دیتے ہوئے کہا:

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ وقت کا دریا کہاں سے آیا اور کس سمت میں بہہ رہا ہے۔ اس کا رخ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف۔ یہ ازل سے ابد کی طرف جاتا ہے یا موجود سے عدم کی طرف۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت کا ہر لمحہ رواں دواں ہے اور ہر چیز میں سرایت کیے ہوئے ہے۔"

"لیکن کیا انسان نے وقت کا تعین کیا ہے؟" پروفیسر زبیر نے وضاحت چاہی۔

"ہاں زبیر صاحب۔ انسان نے مشاہدے سے وقت کا تعین کیا ہے۔ چاند، سورج اور سیاروں کی گردش، خود ہماری زمین کی گردش۔ دن اور رات کے پے در پے آنے سے وقت کا تعین ہوتا ہے۔ اگر چوبیس گھنٹوں میں دن اور رات کی گردش نہ ہو تو وقت کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اس طرح اگر کائنات میں حرکت نہ ہو حرکت میں تواتر نہ ہو تو ہمارے ذہن میں وقت کا تعین اور اس کا تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ وقت کا تعین ہم اہم واقعات کے ایسے سلسلے سے کرتے ہیں جو ایک لمحے سے شروع ہو کر کسی اور لمحے تک پھیلا ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ سلسلہ بھی کائنات کے لاکھوں سلسلہ ہائے واقعات کا حصہ ہوتا ہے اور ان کے ساتھ جڑا ہوتا ہے لیکن کسی خاص امتیاز یا خصوصیت کی بنیاد پر ہمیں نمایاں نظر آتا ہے۔ جیسے حضرت مسیح کی پیدائش سے مسیح کیلنڈر شروع ہوتا ہے۔ اسے قبل از مسیح سے وقت کا تعین ہوتا ہے۔ اسلامی کیلنڈر ہجرت کے واقعے سے منسوب ہے۔ اسی لیے سن ہجری کہلاتا ہے۔ مصری اور فاطمی کیلنڈر بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ یہ سب ناپنے کے پیمانے ہیں۔ وقت کی اصل حقیقت کیا ہے، شاید انسانی عقل اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ قرآن مجید میں اصحاب کہف کا ذکر آیا ہے۔ جب رب کائنات نے تین چیزوں پر مختلف وقت گزارے سو سال کا عرصہ ان لوگوں کو ایسا لگا جیسے ابھی نیند سے بیدار ہوئے ہوں۔ صرف ایک رات کا عرصہ۔ سو سال سمٹ کر چند گھنٹوں میں تبدیل ہو گئے۔ وہ اسی جسمانی حالت میں تھے جس حال میں سوئے تھے۔ کھانا ابھی تازہ تھا جبکہ گدھے کی ہڈیوں کے صرف نشان باقی تھے۔ یعنی وقت کو اللہ نے تین مختلف Time Scales میں گزارا۔ اسی طرح واقعہ معراج میں بھی وقت ٹھہر گیا تھا۔ ایک لمحے میں حضور (صلعم) آسمانوں کی سیر کر کے قاب قوسین تک ہو آئے لیکن بستر ابھی گرم تھا اور دروازے کی کنڈی بھی ہل رہی تھی۔ گویا وقت ٹھہر گیا تھا جس طرح دنیا میں مختلف Time zones ہیں۔ اسی

طرح مختلف Time Scales بھی ہیں۔ یہ پیچیدہ باتیں ہیں۔ وقت میں بڑے رموز و اسرار ہیں۔ جیسے ہم وقت کے لیے "مدت، عرصہ یا زمانہ" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس میں پھیلاؤ اور وسعت پذیری کا مفہوم خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ زمانے کا انسانی تصور کائنات کی حرکت انسانی شعور میں پیدا ہوتا ہے اور انسان کے سوا اس کائنات کا کسی اور چیز یا مخلوق کو وقت کا شعور اور آگاہی نہیں ہوتی۔ گویا وقت اور انسانی شعور میں کوئی گہرا اور پراسرار رشتہ ہے جو ابھی تک ہم نہیں سمجھ سکے۔ یہ رشتہ وجدانی اور روحانی ہے۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ روحانی صلاحیت وقت کی قید سے ماورا ہے۔" پروفیسر زبیر نے پوچھا۔

"ہاں زبیر صاحب، آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ روحانی صلاحیت اور قوت آپ کو زمان و مکاں کی قید سے آزاد کر کے بلند و بالا کر دیتی ہے۔ آپ کو لامتناہی کائنات کا حصہ بنا دیتی ہے۔ اس ہستی کی طرف لے جاتی ہے جو ارفع و اعلیٰ ہے۔ جو موجودات کا سبب ہے۔ جو غایت اولیٰ ہے۔ یہ جزو کا کل کی طرف سفر ہے۔"

پروفیسر زبیر بولے "یہ تو نظریۂ وحدت الوجود ہے۔"

"ہاں زبیر صاحب۔" پروفیسر دلاور بولے "صوفیا کے درمیان وجود باری تعالیٰ کے بارے میں دو نظریات وحدت الوجود اور وحدت الشہود ہیں۔ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ ہی موجود ہے جبکہ وحدت الشہود کے مطابق دنیا میں جو کچھ ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وحدت الوجود کے ماننے والے بڑے ناموں میں حضرت محی الدین ابن عربی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اکثر صوفیا ان کے قائل ہیں۔

ایک تیسرا نظریہ حلول بھی ہے جس میں بڑا نام حسین بن منصور حلاج کا ہے۔ حلول کا مطلب یہ عقیدہ ہے کہ اللہ انسان میں اتر آتا ہے۔ حلول میں قدیم عقیدہ ہندوؤں کا ہے جن کے مطابق پرانے زمانے میں اللہ اوتار کی صورت میں زمین پر آیا تھا۔ کہتے ہیں منصور حلاج نے یہ عقیدہ ہندوستان کے سفر کے دوران ہی اخذ کیا۔ اس لیے اس کے نظریہ حلول یعنی انا الحق پر صوفیا اور اہلِ علم کو اعتراض ہوا۔

صوفیا کی تاریخ میں منصور حلاج کی شخصیت سب سے ممتاز، عدہ اور بے حد پراسرار ہے۔ منصور حلاج نے سن شعور کو پہنچ کر پہلے حضرت سہیل تستریؒ کی شاگردی اختیار کی۔ بعد ازاں بغداد

میں عمرو ابن عثمان المکیؒ کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ کچھ عرصہ جب ان سے قطع تعلق کر کے حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا" آپ کی صحبت میں بیٹھ کر استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔" تو جنید بغدادیؒ نے کہا" میں مخبوط الحواس لوگوں کو اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ صحبت اور ملاقات کے لیے باہوش ہونا تو شرط اول ہے۔ اگر تم ہوش مند ہوتے تو سہیل تستریؒ اور عثمان مکیؒ کے ساتھ یہ طرز عمل نہ ہوتا۔"

پروفیسر نکسن نے حلاجؒ پر بہت مدلل تبصرہ کیا ہے:

"حلاج اپنے عقائد میں اس قدر مخلص تھا کہ اپنے ضمیر کے خلاف حق پر بات نہیں کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں لوگوں کو اس کے بارے میں قوی شبہات تھے کہ وہ قرامطہ سے روابط رکھتا ہے۔ اس نے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اپنے عقیدے کی تبلیغ کی۔ اس لیے علما نے اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیا۔ اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے رازِ الوہیت کو فاش کر دیا بلکہ اس نے ایسے عقیدے کی تبلیغ کی جس کا لازمی نتیجہ مذہبی، سیاسی اور عمرانی انتشار اور بد نظمی تھا۔"

"حلول کا کیا مطلب؟" رابعہ نے بے چینی نے سوال پوچھا۔

"رابعہ بیٹا! حلول سے مراد ہے خدا کا کسی انسان کے جسم عنصری یا جسدِ خاکی میں داخل ہو جانا۔ اسے انگریزی زبان میں Carnation کہتے ہیں۔" اتحاد" کا مطلب ہے خدا اور بندے کا متحد فی الذات ہو جانا۔ اسے (Fusion) کہتے ہیں۔ حلول میں خدا اور انسان دونوں مل کر ایک شے ہو جاتے ہیں جیسے پانی اور شکر مل کر ایک تیسری چیز شربت بن جاتی ہے۔" اتحاد" میں دونوں اپنی اپنی حالتِ ذاتی میں برقرار رہتے ہیں۔ اسلام میں حلول اور اتحاد دونوں نظریات کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں وحدۃ الوجود کا عقیدہ ان دونوں سے مختلف ہے اور اسلام کی رو سے قابلِ قبول ہے۔

حلاجؒ کے بارے میں صوفیا کی دو آرا ہیں۔ اکثر مشائخ نے اسے رد کر دیا مگر کشف المحجوب میں شیخ علی ہجویریؒ نے لکھا ہے۔ بہت سے جید صوفیا نے اسے قبول کیا ہے۔

پروفیسر براؤن نے اپنی مشہور کتاب" تاریخ ادبیاتِ ایران" میں لکھا ہے کہ وہ ایک شعبدہ باز شخص تھا۔ ہر علم میں مہارت کا دعویٰ کرتا تھا لیکن جملہ علوم سے بے بہرہ تھا۔ وہ کہتا تھا" خدا نے مجھ میں حلول کیا ہے۔ دراصل وہ شیعوں کے آٹھویں امام علی رضا کا مقرر کردہ ایک مبلغ تھا۔ چنانچہ کوہستان (ایران) سے اسے گرفتار کیا گیا اور درے لگائے گئے لیکن وہ انا الحق کہنے سے باز نہ آیا تو 912 عیسوی میں اسے گرفتار کیا گیا اور 922ء میں پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ پھر

قتل کر کے اس کی لاش کو آگ میں جلا دیا گیا۔

اگرچہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حلاج کو خلوت اور سکوت (Solitude & Silence) سے مرصع کیا۔ حلاج آپ کی تعلیمات سے مستفید ہوا لیکن ایک دن حضرت جنیدؒ سے نہ معلوم کس قسم کا سوال کیا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ تو بہت جلد لکڑی سرخ کرے گا یعنی سولی چڑھا دیا جائے گا۔"

حضرت منصور نے جواب دیا "جب مجھے سولی دی جائے گی تو آپ اہل ظاہر کا لباس اختیار کر لیں گے۔" چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت علما نے متفقہ طور پر حسین منصور حلاج کو قابل گردن زنی ہونے کا فتویٰ دیا تو خلیفہ وقت نے کہا کہ حضرت جنید جب تک فتویٰ پر دستخط نہیں کریں گے، منصور کو پھانسی نہیں دے سکتا اور جب یہ اطلاع حضرت جنید کو پہنچی تو آپ نے پہلے مدرسے میں جا کر علما ظاہر کا لباس زیب تن کیا اور اس کے بعد یہ فتویٰ دیا کہ ہم ظاہر کے اعتبار سے منصور کو سولی پر چڑھانے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔"

"منصور حلاج کے نظریات اور کرامات کے بارے میں کچھ بتایئے؟" پروفیسر زبیر نے اشتیاق سے پوچھا:

"ہاں، زبیر منصور حلاج سے وابستہ بہت سی حقیقتیں ہیں اور بہت سے افسانے ہیں۔ وہ تاریخ میں ایک عجیب و غریب صوفی ہے جو عجیب باتیں کرتا ہے۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار نے تذکرۃ اولیا میں لکھا ہے:

آپ نے پچاس سال کی عمر میں فرمایا کہ اب میرا کوئی مسلک نہیں لیکن تمام مذاہب میں جو مشکل ترین چیزیں ہیں، انہیں میں نے اختیار کر لیا ہے اور پچاس برس میں ایک ہزار سال کی نمازیں ادا کر چکا ہوں اور ہر نماز کے لیے غسل کو ضروری تصور کیا ہے۔

حلاجؒ کے کشف و کرامات کی کئی وارداتیں ہیں:

کسی شخص نے آپ کے قریب بچھو دیکھ کر مارنے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا، اس کو مت مارو کیونکہ بارہ برس سے یہ میرے ساتھ ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ بہت سے لوگ سفر حج میں ان کے ہمراہ تھے۔ راستے میں لوگوں نے بھوک کی شکایت کی اور بھنی ہوئی سری کھانے کی فرمائش کی تو آپ نے سب کو صف بندی کر کے بٹھا دیا اور جب اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ لے جاتے تو ایک بھنی ہوئی سری اور دو گرم گرم روٹیاں سب کے سامنے رکھتے جاتے۔ اس طرح چار سو افراد نے شکم

سیر ہو کر کھانا کھایا۔

آگے چل کر لوگوں نے کہا، ہماری طبیعت خرموں کو چاہتی ہے تو آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا، مجھے زور زور سے ہلاؤ اور جب لوگوں نے یہ عمل کیا تو آپ کے جسم میں سے اس قدر خرمے جھڑے کہ سب لوگ سیر ہو گئے۔

ایک دفعہ مریدوں نے جنگل میں آپ سے انجیر کی خواہش کا اظہار کیا۔ جیسے ہی فضا میں ہاتھ بلند کیا، انجیر سے بھرا ہوا ایک طباق آپ کے ہاتھ آ گیا اور آپ نے پوری جماعت کو کھلا دیا۔

سنا گیا ہے کہ اسی دن بغداد کے ایک بازار میں حلوائی کا حلوہ سے بھرا ہوا طباق غائب ہو گیا تھا۔ جب یہ جماعت بغداد پہنچی تو حلوائی نے اپنا طباق شناخت کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا اور جب لوگوں نے سارا واقعہ سنایا تو وہ حلوائی آپ کی کرامت سے متاثر ہو کر آپ کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔''

''اب ان کے ارشادات بتائیے؟'' ندیم نے تجسس سے پوچھا۔

''ندیم بیٹے! جب لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ حضرت موسیٰ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو جواب دیا کہ وہ خدا کے رسول اور نبی برحق تھے اور جب فرعون کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا، وہ بھی سچا تھا۔ خدا نے دو طرح کے لوگ پیدا کیے ہیں۔ ایک عام اور ایک خاص۔ دونوں قسم کے لوگ اپنے اپنے راستوں پر چلتے رہتے ہیں اور دونوں کو راستہ دکھانے والا خدا ہے۔ فرمایا، خدا کی یاد میں دنیا و آخرت کو فراموش کر دینے والا ہی واصل باللہ ہوتا ہے اور خدا کی ذات کے سوا ہر شے سے مستغنی ہو کر عبادات کرنا فکر ہے۔ فرمایا صوفی اپنی ذات میں اس لیے واحد ہوتا ہے کہ نہ تو کسی کو جانتا ہے اور نہ اس سے کوئی واقف ہوتا ہے۔ فرمایا نور ایمانی کے ذریعے خدا کی جستجو کرو۔ فرمایا حکمت ایک تیر ہے اور تیر انداز خدا تعالیٰ ہے اور مخلوق اس کا نشانہ۔ پھر فرمایا، مومن وہ ہے جو امارت اور دولت کو معیوب تصور کرتے ہوئے قناعت اختیار کرے۔ فرمایا سب سے بڑا اخلاق جفائے مخلوق پر صبر کرنا اور اللہ کو پہچاننا ہے۔ فرمایا عمل کو کدورت سے پاک رکھنے کا نام اخلاق ہے۔ فرمایا بندگی کی منازل طے کرنے والا آزاد ہو جاتا ہے۔ فرمایا جب تک مصائب پر صبر نہ کیا جائے، عنایت حاصل نہیں ہوتی۔ فرمایا صبر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھانسی پر لٹکا دیا جائے، جب بھی منہ سے اُف نہ نکلے۔ چنانچہ جب آپ کو سولی پر چڑھایا گیا تو اُف

تک نہیں کی۔

حضرت شبلیؒ کہتے ہیں کہ جب منصور کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو شیطان نے سامنے آ کر کہا، اے شیخ آپ نے انا الحق کہا اور میں نے انا الخیر لیکن آپ کے اوپر رحمت ہوئی اور میرے اوپر لعنت۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تو نے انا اپنے لیے استعمال کیا اور میں نے خودی کو دور کر کے انا الحق کہا۔ اسی وجہ سے مجھ پر رحمت اور تجھ پر لعنت نازل کی گئی۔ منصور حلاج ایک عجیب صوفی تھا۔''

پروفیسر زبیر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ''بہت رات ہو چکی۔ اب اجازت لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازے پر پروفیسر زبیر نے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا:

''منگل کو رات آٹھ بجے غریب خانے پر سب نے آنا ہے، یاد سے بھولنا نہیں۔ خدا حافظ۔''

جاتے ہوئے رابعہ نے ایک نگاہ ندیم پر ڈالی۔ اداس کر دینے والی الوداعی نگاہ۔ ندیم یاس کی تصویر بنے دیکھتا رہا۔ وہ خدا حافظ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز گم ہو گئی تھی۔ عجیب بات ہے جہاں ہم بولنا چاہیں بول نہیں سکتے اور بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی بولتے رہتے ہیں۔

گھر آ کر رابعہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ندیم کے بارے میں سوچنے لگی۔ ندیم اس کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اتنی دیر تک اس کے قریب رہنے سے قربت کا ایک باب کھل گیا تھا۔ وہ اب بھی ایک سایہ بن کر اس کے پاس صوفے پر براجمان تھا جس کے بارے میں ہم سوچتے ہیں، سوچ کی طاقت خود بخود بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دراصل سوچ کی اپنی وائبریشن (Viberation) ہوتی ہے جو خلا میں سفر کرتی چلی جاتی ہے۔ کمزور یا ختم نہیں ہوتی۔ مغربی دنیا کی روحانیت اسی بنیاد پر ہے کہ اپنی سوچ کی طاقت بڑھاؤ۔ عموماً دماغ کا طاقتور ہونے کا مطلب سوچ کی زیادہ طاقت ہوتا ہے۔ اسی لیے ارتکاز توجہ کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی میں بھی آپ کی سوچ کی طاقت ہی استعمال ہوتی ہے۔ رابعہ کی سوچ کی کشش ندیم کو اس کے سامنے لے آئی تھی۔ اس کی سوچ تصور میں ڈھل گئی۔ اس کا تصور اسے عجیب خواب دکھانے لگا۔ جاگتے میں خواب (Reverie) جاگتے میں خواب بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ ضائع نہیں ہوتا۔ ہمارے لاشعور میں چلا جاتا ہے۔ لاشعور میں خیالات سٹور ہو جاتے ہیں۔ یہ لاشعور ہی دراصل روحانی طاقت ہے۔ یہ تصور کو جنم دیتا ہے اور ہمارا Immagination ہمیں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ زمان و مکاں کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔

رابعہ بیٹھے بیٹھے نیو یارک پہنچ گئی۔ مین ہٹن کی سڑک پر ندیم کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چل رہی ہو۔ دونوں طرف آسمانوں کو چھوتی ہوئی بلند عمارتیں، خوبصورت مناظر، تیز دوڑتی ہوئی لمبی گاڑیاں، ایک سجا ہوا اپارٹمنٹ جس میں دنیا کی ہر سہولت موجود ہو۔

ندیم ہوا بن کر سامنے آ گیا اور بولا:

"میری دنیا دیکھو۔ اس جگہ سائنس کی ہر جدید ایجاد موجود ہے۔ ڈش واشر، ویکیوم کلینز، کچن کی آرائش، بیڈ روم کی ڈیکوریشن اور پھر نیو یارک کے شاپنگ مال، فوڈ کورٹس، انٹرٹینمنٹ فلورز، ڈانس کلب، رنگ و نور میں ڈوبی پلے لینڈ، ڈزنی لینڈ، رابعہ تم نے خواب میں بھی ایسی زندگی کا تصور نہیں کیا ہوگا۔ اتنی جدید اور تیز رفتار زندگی، خوشگوار، خواہشوں سے بھرپور، رقص کرتی، بدمست زندگی۔" رابعہ جیسے کھو گئی ہو۔ اس نے چپکے سے اپنا سر ندیم کے کاندھے پر رکھ دیا۔ اسے ایسا لگا کہ صدیوں کی پیاسی روح کو سیراب ہونے کا موقع ملا ہو۔ آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ اس پر طاری ہونے لگا اور وہ نیند کی پرسکون وادی میں اتر گئی۔ نیند بھی خدائے فیاض کی بہت بڑی نعمت ہے۔ نیند کی قدر ان لوگوں سے پوچھو جو بے خوابی (Insommia) کا شکار ہوتے ہیں۔ ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلنا، گہری نیند (Deep sleep) سے محروم رہنا۔ ایسی کربناک کیفیت ہے جو انسان کی سب سے زیادہ دشمن ہے۔ بے خوابی کے پیچھے نفسیاتی ہیجان، شدید محبت، نفرت، پچھتاوے اور بے مقصدیت کارفرما ہوتی ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ قاتل کو نیند نہیں آتی۔ مقتول اسے خواب میں ڈراتا ہے اور اس کی سزا کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ میڈیسن کے ماہرین نے بے پناہ نیند کی گولیاں ایجاد کی ہیں جن کے کھاتے ہی بے خوابی کا مریض مصنوعی نیند سو جاتا ہے اور پھر ان گولیوں کے بغیر نیند نہیں آتی۔ آج کے دور کا انسان بے خوابی کا شکار ہے۔ خدشات، وسوسے، خوف اور پچھتاوے اس کے لاشعور میں بیٹھ (Deeply seated) جاتے ہیں اور انسان کی نیند اڑ جاتی ہے لیکن جن کے دل پرسکون ہوتے ہیں، جو خواہشوں کی سولی پہ جھول نہیں رہے ہوتے، وہ ماضی کے جرائم کی صلیب نہیں اٹھاتے پھرتے۔ وہ میٹھی اور پرسکون نیند سوتے ہیں۔ "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" "صرف اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون ملتا ہے۔ وہ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، سکون کی نیند سوتے ہیں۔ رابعہ کی معصومیت نے اسے لوری سنائی اور وہ گہری نیند سو گئی۔

منگل کی رات آٹھ بجے سارے مہمان زبیر کے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما تھے۔

ندیم ڈیزائنر سوٹ پہن کر آیا اور بہت سمارٹ لگ رہا تھا۔ آج اس نے شوخ رنگ کی نکٹائی لگائی ہوئی تھی جو نہایت دیدہ زیب تھی۔ Joopi کی پرفیوم میں ڈوبا ہوا ندیم مردانہ وجاہت کا حسین مجسمہ لگ رہا تھا۔ جب رابعہ کمرے میں داخل ہوئی تو بقول میر تقی میر:

وہ آئے بزم میں اتنا تو ہم نے دیکھا میر
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

آج رابعہ واقعی ایک پری لگ رہی تھی۔ سفید قمیص پر خوبصورت کڑھائی کا کام اور اس پر بلیک پرنٹ کی ڈیزائننگ۔ رابعہ نے کسی بوتیک سے خوبصورت اور مہنگا سوٹ لیا تھا۔ ہلکے میک اپ نے اس کے حسن میں مزید نکھار بھر دیا تھا۔ وہ حسن کی دیوی لگ رہی تھی۔ جب سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو پروفیسر زبیر نے کہا:

"کچھ بات ہو جائے۔ کچھ سوالات ہیں، ان کے جوابات چاہئیں۔ بعض چیزوں کے بارے میں پروفیسر دلاور بہت کچھ جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے۔ یقین کیا ہے۔ اس کے بارے میں بتایئے۔" پروفیسر زبیر نے لمبی تقریر کر ڈالی۔

پروفیسر دلاور نے انکساری سے کہا "میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ بس ایک طالب علم ہوں۔ میں بھی سقراط کی طرح یہ کہتا ہوں" مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ میں تو فقط اتنا جانتا ہوں کہ جاننے کے حوالے سے دنیا میں چار قسم کے لوگ ہیں:

(1) وہ جو جانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔

(2) دوسرے وہ جو جانتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ جانتے ہیں۔

(3) تیسرے وہ جو نہیں جانتے اور جانتے ہیں کہ نہیں جانتے۔

(4) چوتھے وہ جو نہیں جانتے اور نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔

جہاں تک یقین کی بات ہے تو یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ یقین (Faith) انسان کے اندر ایسا اعتماد کا ہونا جو کبھی معطل نہیں ہوتا۔ کبھی ڈگمگاتا نہیں۔ کبھی تذبذب کا شکار نہیں ہوتا۔ پہلے یقین کی ضد بے یقینی کو سمجھنا ضروری ہے۔ بے یقینی ذہنی انتشار ہے۔ بکھرے ہوئے خیالات ہیں۔ اضطراب ہے، بے چینی ہے، گھبراہٹ ہے۔ شک ہے اور شک پر شک ہے۔ یہ کروں نہ کروں۔ آگے بڑھوں نہ بڑھوں۔ پیچھے ہٹوں نہ ہٹوں۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ مان لوں یا نہ

مانوں۔ گومگوں کی کیفیت ہے۔ خدا ہے یا نہیں ہے۔ سزا اور جزا ملے گی یا نہیں ملے گی۔ بخشش ہوگی یا نہیں ہوگی۔ جنت، دوزخ کا وجود ہے یا نہیں ہے۔ خدا سے ڈرنا چاہیے یا نہیں۔ عبادت سے کیا ہوگا۔ دعا قبول ہوگی یا نہیں۔ میری بیوی باوفا ہے یا بے وفا۔ بچے مجھ سے پیار کرتے ہیں یا میری دولت سے۔ دفتر میں میرا دوست کون ہے اور دشمن کون ہے۔ مصائب و آلام میرے اعمال کا نتیجہ ہیں یا خدا مجھ سے ناراض ہے۔ میں خوش ہوں یا بدنصیب۔ میں کون ہوں، میں کیا ہوں۔ میں کیوں ہوں۔ یہ وہ پریشان کن سوالات ہیں جو بے یقینی سے جنم لیتے ہیں۔ علم اور حقیقت کی تلاش شک (Scepticism) پر نہیں تجسس (Curiosity) پر ہے۔ بے یقینی تو ذہن کی پستی ہے۔ بیماری ہے، اگر یقین کے بغیر نماز ادا کی جائے تو اس سے کہیں بہتر ہے آدمی یقین کے ساتھ سو جائے۔ اقبال نے کیا خوب کہا:

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

غلامی انسان کی پست ترین سطح پر زندگی گزارنے کا عمل ہے۔ کسی انسان کو اپنا آقا مان لینا، اس کی اطاعت قبول کر لینا۔ اپنی خودی کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر دینا۔ اپنی ہستی کو انسان کے تکبر کے آگے سرنگوں کر دینا جس نے "The Roots" پڑھی ہے، اس سے پوچھیں غلامی کیا ہوتی ہے۔ گھٹن، مشکلیں، ہاتھ پاؤں میں ان دیکھی زنجیریں، مغلوبیت کی فضا، خوف و ہراس، نفرت اور حقارت، غلامی کا ہلکا سا اشارہ بتاؤں۔ انگریزوں کی ہندوستان پر حکومت کے دور میں کلبوں کے باہر لکھا ہوتا تھا "Indians and dogs not allowed" ''ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' غلامی کی ضد آزادی ہے۔ برطانوی سامراج کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے کروڑوں لوگوں نے مختلف ممالک میں اپنی جان کا نظرانہ پیش کر کے آزادی دی۔ روسو نے کہا ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ غلامی بدترین اذیت ہے۔ خوفناک کیفیت ہے۔'' لیکن علامہ اقبال کہتے ہیں کہ غلامی سے بھی بڑھ کر کوئی ذلت ہے تو وہ بے یقینی ہے۔

یقین بڑی دولت ہے۔ یقین (Faith) کے بارے میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا:

''یقین پہاڑ کو بھی ہٹا سکتا ہے۔'' Faith can move the mountain.

یقین ہے کیا؟ ذرا بات کی گہرائی تک جاتے ہیں۔ یقین دراصل اعتماد کا اونچا درجہ

ہے۔ یہ جذبہ یقین کامل کہلاتا ہے۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا اندرونی یقین ہی کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ قرآن میں سورۃ البقرہ اس آیت مقدس سے شروع ہوتی ہے "اس کتاب میں کوئی شک نہیں" اور آخری سورۃ الناس میں شک کے اور اس سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔ یقین کے تین درجے ہیں۔" پروفیسر دلاور کی بلاغت دیدنی تھی:

(1) علم الیقین (2) عین الیقین اور (3) حق الیقین۔

علم الیقین عام یقین کو۔ عین الیقین درمیانے درجے کے یقین کو اور حق الیقین۔ اونچے درجے کے یقین کو کہتے ہیں۔ یقین کامل کی بہترین تشریح یہ ہے کہ مثبت سوچنا اور ہر کام کرتے وقت کامیابی کو ذہن میں رکھنا۔ جب اعتمادی انسانی سوچ کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے۔ جب انسان اندرونی طور پر کسی بات پر یقین کر لیتا ہے، اسے سچ مان لیتا ہے تو اس کے اندر بے پناہ توانائی جنم لیتی ہے۔ ایک طاقتور قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اندر سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس کا ارادہ پکا ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن کی تمام صلاحیتیں اس بات پر متفق ہو جاتی ہیں کہ وہ سچ پر ہے۔ حق پر ہے۔ نظریہ جب یقین میں بدل جائے اور یقین عمل میں تبدیل ہو جائے تو سقراط، امام حسین اور صلاح الدین ایوبی پیدا ہوتے ہیں جو یقین کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ وہی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

دنیا میں بھی سب سے کامیاب ترین اور ناکام ترین انسان میں فرق صرف یقین کا ہے۔ چاہے اسے روحانی طریقے سے لیں یا دنیاوی طریقے سے۔ انسان کی جدوجہد، اس کی قوتِ ارادی، مستقل مزاجی اسی یقین ہی کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ خود اعتمادی (Self Confidence) اور استقامت (will power) بھی یقین ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ علی ہجویری لکھتے ہیں:

"جب بندہ از روئے یقین اس بات کو جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے تو وہ ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس سے اس کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔" اقبال نے کیا خوب کہا:

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پائی میں نے استغنا میں معراج سلمانی

آیت قرآنی کا ترجمہ ہے:

''اور جو شخص اللہ کی نافرمانی سے ڈرے گا تو اللہ اس کے لیے مصیبت سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا۔ اس کی پریشانی دور کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ پہنچ سکے گا اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو وہ ''اللہ'' اس کے لیے کافی ہوگا۔'' (3,2,65)

اسلیے صوفی کسی دولت مند کے دروازے پر نہیں جاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رازق اللہ ہے نہ کہ انسان۔ اکبر الہ آبادی کچھ یوں بیان کرتا ہے:

دل میں تو ضعف عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

کشف المحجوب میں حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے لکھا ہے:

''ایک بادشاہ نے کسی فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ، میں تیری خواہش پوری کروں گا۔''

فقیر نے زیر لب تبسم کیا اور کہا ''میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں۔''

بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا ''یہ کیا کہا؟'' فقیر نے جواب دیا:

''اے بادشاہ سن۔ تو حرص اور امید دونوں کا غلام ہے اور یہ دونوں میرے غلام ہیں۔ اس لیے تو میرے غلاموں کا غلام ہے۔''

مشہور یونانی صوفی دیوجانس کلبی سمندر کے کنارے ریت پر بیٹھ کر دھوپ سینک رہا تھا تو سکندر اعظم کا اُدھر سے گزر ہوا۔ سکندر اعظم نے بڑی تمکنت اور غرور سے کہا:

''اے جانس کلبی! میں سکندر اعظم ہوں۔ میں فاتح دنیا ہوں۔ میرے پاس سونے چاندی کے انبار ہیں۔ زرعی زمینیں ہیں۔ لاتعداد پھلوں کے باغات ہیں۔ اعلیٰ ترین نسل کے گھوڑے ہیں اور نایاب نسل کی گائیں ہیں۔ میرے پاس خوبصورت اور نرم و نازک مہ جبینوں کے غول ہیں۔ سُر یلے مغنی ہیں۔ لچکتی رقصائیں ہیں۔ مانگ، کیا مانگتا ہے؟ دینے میں میرا ہاتھ تنگ نہیں۔ میں عیش و عشرت سے لبریز اور دولت و حشمت سے مالا مال کر دوں گا۔''

دیوجانس کلبی نے ریت پر نظریں جھکائے رکھیں۔ نظریں اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ریت مٹھی میں دباتے ہوئے انتہائی بے نیازی سے کہا:

''میں دھوپ سینک رہا ہوں۔ تمہارے کھڑے ہونے سے سایہ ہو گیا ہے۔ میری ایک ہی خواہش پوری کر دو، دھوپ چھوڑ دو۔''

سکندر اعظم جو اپنی سلطنت اور شان و شوکت میں لاثانی تھا۔ فاتح دنیا تھا۔ انکار سننے کا عادی نہیں تھا۔ ایک لمحہ میں مفلس ہو گیا۔ اس کا سب کچھ بے معنی ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے حقیر انسان سمجھنے لگا۔ چپکے سے وہاں سے ہٹ گیا اور اپنی انا کے ٹوٹے ہوئے بت، اپنی سلطنت کی بے وقعتی اور اپنی امارات کے بے توقیری پر ماتم کرتا ہوا لشکر میں گم ہو گیا۔ اسی صوفی کی ضرب تھی جس نے اسے یہ نصیحت لکھنے پر مجبور کیا تھا کہ "جب مجھے دفنانے لگو تو میرے دونوں ہاتھ کفن سے باہر رکھنا تاکہ دیکھنے والوں کو یقین ہو جائے کہ فاتح عالم اس دیار فانی سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

سرکار دو عالم حضرت محمد (صلعم) نے ارشاد فرمایا ہے:

"میری بعثت کی غایت یہ ہے کہ میں بہترین اور خوب ترین اخلاق کی تکمیل کر دوں۔"

مشائخ کے نزدیک تصوف کا مقصد صرف یہ ہے کہ پہلے انسان خود اپنے اندر اخلاق حسنہ پیدا کرے۔ پھر بنی آدم کے اندر ان کی تخم ریزی کرے۔ چنانچہ کشف المحجوب میں شیخ ابوالحسن کا قول درج ہے:

"یعنی تصوف نہ چند رسوم مذہبی ادا کرنے کا نام ہے نہ بعض علوم حاصل کرنے کا بلکہ یہ تو سراسر اخلاق حسنہ کے مجموعے کا نام ہے۔"

پروفیسر زبیر بولے "تصوف کو روحانی عمل سے نکال کر آپ انسانوں کے درمیان اخلاق حسنہ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میں مزید وضاحت کرتا ہوں۔" پروفیسر داور بولے:

خدمت خلق کی سب قدروں پر صوفیا اکرام نے عمل کر کے دکھایا ہے۔ ان کی زندگیاں خدمت خلق کے لیے وقف ہوئی تھیں۔ انہوں نے لاکھوں انسانوں کو شیطان کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کیا یعنی ان کی زندگی کو با مقصد بنایا۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا فرمایا کرتے تھے "مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی جس میں لکھا ہوا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچا کیونکہ مومن کا دل اسرار الٰہی کا محل ہے۔ نیز فرمایا قیامت کے بازار میں کوئی اسباب اس قدر قیمتی نہ ہو گا جس قدر دلوں کو راحت پہنچانا۔" ساغر صدیقی زندگی کی حقیقت کو پا گیا تھا۔ اس نے کہا:

یہی ہے ذوق عبادت کی انتہا ساقی

غم حیات کے ماروں کا احترام کرو

حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی شخص تیری راہ میں کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے جواب میں اس کی راہ میں کانٹا رکھ دے تو ساری دنیا کانٹوں سے معمور ہو جائے گی۔''

عموماً لوگ ایسا ہی کرتے ہیں لیکن درویشوں کا یہ دستور نہیں ہے۔ انہیں نیک اور بد دونوں کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے۔ اس حدیث پاک میں حضور اقدس حضرت محمد (صلعم) سے پوچھا گیا ''یارسول اللہ! سب سے بڑی نیکی کون سی ہے؟'' تو حضورؐ نے فرمایا ''کسی غمزدہ اور دکھی دل کو راحت پہنچانا۔''

پروفیسر زبیر نے کہا ''آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔'' لیکن رابعہ نے کچن سے اشارہ کیا کہ کھانا لگ گیا ہے۔ آیئے پہلے کھانا کھاتے ہیں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ کھانے کی میز پر رابعہ کی کوکنگ کے کمالات تھے۔ زعفرانی پلاؤ، قیمہ بھرے فرائیڈ کریلے، ماش کی دال جو مکھن میں پکائی گئی تھی۔ قیمہ آلو، بینگن کا بھرتہ اور چانپ قورمہ شامل تھے۔ پروفیسر زبیر نے رابعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''رابعہ کی پسند کی ڈشیں ہیں۔ ہم زیادہ گوشت خور نہیں ہیں۔ کم گوشت کھاتے ہیں۔ وہ بھی سبزی کے ساتھ۔ مجھے ذاتی طور پر شب دیگ بہت پسند ہے۔ آج کل کٹہ گوشت بھی پسند کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کٹہ گوشت مٹی کی ہانڈی سے نکالتے ہوئے کہا: ''ساجد صاحب! یہ لیجیے۔ اس کی اپنی ایک لذت ہے۔''

رابعہ نے شامی کباب کی ڈش ندیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''میرے ہاتھ کے شامی کباب بہت لذیذ اور خستہ ہوتے ہیں۔ یہ میں نے خاص آپ کے لیے بنائے ہیں۔'' اس جملے پر سب چونک پڑے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں یہ خیال آیا کہ یہاں تو معاملہ کوئی اور ہے جس کی طرف اُن کا خیال ہی نہیں گیا۔ دو جوان دلوں کی دھڑکن سنائی نہیں دی۔ ندیم نے کباب کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''بہت لذیذ ہیں لیکن ذرا Hot ہیں یعنی مرچ تیز ہے۔''

رابعہ نے فوراً کہا ''ہم کبابوں میں ہری مرچ ڈالتے ہیں جس کا اپنا ایک ذائقہ ہے۔ آپ کو زیادہ مرچیں تو نہیں لگ رہی ہیں۔'' رابعہ کے اس جملے پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور رابعہ

شرمندہ سی ہوگئی۔ سب نے کھانا جی بھر کر کھایا۔ جب میٹھے میں گجریلا آیا جس پر بادام اور پستے کی ٹاپنگ تھی اور چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے جو پورا بڑا ڈونگا منٹوں میں صاف ہوگیا۔

سب نے دل کھول کر رابعہ کے ہاتھ کی لذت کی تعریف کی۔ یہ کھانے میں بھی عجیب بات ہے۔ ریسی پی (Resipi) تو سب کی ایک ہی ہوتی ہے لیکن خانسامے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کی بھی وہ لذت نہیں ہوتی جو عورت کے ہاتھ میں لذت ہوتی ہے۔ کھانے میں صرف اجزائے خوراک ہی نہیں ہوتے۔ پکانے والے ہاتھ کا خلوص اور پیار کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے محبت سے تیار کھانے میں لذت اور محبت دونوں ہوتے ہیں۔ اسی لیے اعلیٰ سے اعلیٰ ریسٹورنٹ کے کھانے میں مصالحے اور ذائقہ ہوسکتا ہے، پیار اور محبت نہیں ہوتا۔

کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں نشست جم گئی تو ساجد صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا:

"پروفیسر والا ور صاحب! آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔ سب آفاقی حقیقتیں ہیں، سچائیاں ہیں لیکن عہد حاضر کا کیا کریں۔ آج کے تقاضے ہی کچھ اور ہیں جنہوں نے اس دور کا نظام وضع کیا ہے۔ جدید زندگی کو ترتیب دیا ہے۔ اس کے رجحانات متعین کیے ہیں۔ اس جدید معاشرے کی قدروں کو نئی تعبیر دی ہے۔ انفرادیت کو زندگی کا محور بنادیا ہے۔ فرد کو اجتماع سے الگ کردیا ہے۔ موج کو دریا سے جدا کردیا ہے۔ اب معاشرہ باہمی ضرورتوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ ایک بے رحم جڑاؤ ہے۔ اس کی بنیاد محبت اور یگانگت نہیں گلہ کاٹنے والا مقابلہ اور انتشار ہے۔ رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ مغرب میں میاں بیوی ہی کے مقدس رشتے کو لے لیجیے۔ کسی محبت اور اعتماد کے بغیر بس کچی ڈوری میں بندھا ہوا ہے۔ طلاق ایک فیشن بن گیا ہے۔ برداشت اور قربانی کہاں چلی گئی۔ باہم جنسی اختلاط ہی جذب ہے۔ جسمانی لذت ہی بندھن کی بنیاد ہے۔ معاشی مفادات بھی مشترکہ نہیں۔ شادی کی پابندی بھی برداشت نہیں۔ بغیر شادی کے اکٹھے رہنا (Living together) کا زمانہ ہے۔ اپنی مرضی سے جب چاہو بائے بائے کر جاؤ۔ بچے ریاست کی ملکیت ہیں۔ پیدائش سے ہی وظیفہ مقرر ہو جاتا ہے۔ استاد یا والدین مارنا تو دور کی بات ہے، چیخ کر ڈانٹ دیں تو بچہ پولیس کو بلوالیتا ہے اور اگر عدالت سمجھے کہ والدین تشدد پسند ہیں یا مناسب خیال نہیں رکھتے تو بچہ ریاستی اداروں کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ جنسی بے راہ روی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ شخصی آزادی کے نام پر لوگ تیزی سے (Gays) اور عورتیں (Lisbens) ہو رہی ہیں۔ امرد پرستی (Sodomy) عام ہوتی جا رہی ہے۔ معاشی پہلو بھی نئی خوفناک حقیقتوں کا

انکشاف کر رہا ہے۔ انسان کو قرضوں کی بے پناہ سہولت دے کر (Debit trap) میں جکڑ لیا گیا ہے۔ کرنسی ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈز میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ ترسیل زر (Transfer of money) آسان ترین ہو چکی (E-Banking) نے کروڑوں ڈالروں کی منتقلی کو لمحوں کا کھیل بنا دیا ہے۔ (E-commerece) سے پچھلے سال اربوں ڈالر کی خرید و فروخت ہوئی ہے۔ Cyber Cities بن گئی ہے۔ انٹرنیٹ پر (Cyber Sex) حقیقی جنسی تجربے کا متبادل بنتی جا رہی ہے۔ ایک موبائل فون (Black berry) میں جدید زندگی کے سارے طریقے اور سلیقے موجود ہیں۔ E-mail، Sms تو پرانی باتیں لگتی ہیں۔

آج کی دنیا تو مادہ پرست ہے۔ مغرب تو دولت ہی کو زندگی کا مقصد بنا بیٹھا ہے۔ آج کے دور میں ڈالر کو Almighty کہا جاتا ہے۔ ڈالر میں ایک قوت ہے۔ آپ پیسے سے دنیا کی ہر راحت خرید سکتے ہیں حتیٰ کہ محبت بھی خرید سکتے ہیں۔ جنس کو ہمیشہ ایک Commodity رہی ہے اور آج کی آزاد معیشت کی منڈی میں بہت عام ہو گئی ہے۔ آپ ہر راحت اور لذت خرید سکتے ہیں۔ آپ کی قوت خرید ہونی چاہیے۔ دنیا آپ کی غلام ہے۔ انسان کو بڑے گھر، بنگلی اور جدید گاڑی، بینک بیلنس، پرکشش اور بااختیار عہدے میں اتنی کشش اور دلکشی نظر آتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی بیچ دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اپنی عزت نفس اور جسم تک بیچ ڈالتا ہے۔"

ساجد صاحب بولتے گئے۔

انسان تیزی سے کائنات کو مسخر کر رہا ہے۔ دن رات ایجادات ہو رہی ہیں۔ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل فونز نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ Software کی نت نئی ایجادیں ہو رہی ہیں۔ Mitrex ایک اپنی کمپیوٹر کی تخلیق کردہ دنیا ہے۔ بلیک بیری، موبائل فون سے مواصلات کے سارے کام ہو سکتے ہیں۔ اطلاعات کا سمندر ہے کہ امنڈ آیا ہے۔ ایک چپ نے انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یادداشت کمپیوٹر کی باندی ہے۔ میگا بائیٹس میں کروڑوں میں Memory ہے جہاں ڈیٹا سٹور کیا جا سکتا ہے۔ پورا انسائیکلو پیڈیا ایک ڈی وی ڈی یا ہارڈ ڈسک میں محفوظ ہے۔ Data base میں کروڑوں لوگوں کی ہر طرح کی معلومات موجود ہیں۔ کریڈٹ کارڈ، پلاسٹک منی کی نئی اصطلاح ہوتی ہے۔ A.T.M مشین تو پرانی بات ہے۔ E-Commerce اور E-Poorchasing کا زمانہ ہے۔ لیپ ٹاپ یا اب I.Pad کی چھوٹی سی مشین پر ہم دنیا کا ہر کام کر سکتے ہیں۔ یوٹیوب، فیس بک، ٹویٹر اور نہ جانے کروڑوں ذاتی بلاگز اور ویب سائٹس ہیں

جس میں ہر چیز موجود ہے۔ Innovations کا زمانہ ہے۔ نہ جانے کہاں ختم ہوگا۔ Ideas کا دور ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک سخت مقابلہ ہے، گلا کاٹنے والا مقابلہ۔ دوسروں کو نیچا دکھانا، کارپوریٹ Greed نے نئی طرز کے استحصال کو جنم دیا ہے۔ کارپوریٹ سیکٹر میں Sharking ہوتی ہے۔ بڑی مچھلی جیسے چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ اسی طرح بڑی کمپنیاں چھوٹی کمپنیوں کو نگل جاتی ہیں۔ جس شہر میں وال مارٹ، میٹرو، کیش اینڈ کیری جیسے بڑے سٹور کھل جائیں وہاں چھوٹے سٹور بند ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک چیز برانڈڈ ہے۔ کاروباری چیزیں، فرنچائز ہیں جیسے میکڈونلڈ، پیزاہٹ، سب وے، ڈومینو اور بے شمار کمپنیاں ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں کا کاروبار کرتی ہیں۔ کوکا کولا اور پیپسی کولا ٹریلین ڈالر کا کاروبار کرتی ہیں۔ لباس میں رینگلر، کارٹیئر، گوچی سینٹ مائیکل اور سیکڑوں کمپنیاں ہیں۔ ڈیزائنر سوٹ اور خواتین کے لباس ہیں۔ لباس اور فیشن ایک بہت بڑی انڈسٹری ہے۔ اسی طرح میک اپ کی انڈسٹری اربوں ڈالر کما رہی ہے۔ بیوٹی پارلرز، مساج پارلرز کا زمانہ ہے۔ نائٹ کلبوں کا دور ہے۔ بل گیٹس اور وارن بفٹ روزانہ لاکھوں ڈالر کما رہے ہیں۔ دنیا میں تیزی سے ارتکاز زر ہو رہا ہے۔ Seven sisters سات مشہور تیل کمپنیاں جن میں H.B، Shell، ارامکو اور دوسری تیل کی کمپنیاں پوری دنیا کے انرجی کے وسائل پر قابض ہیں۔

(Cartelisation) کا زمانہ ہے۔ آج کے دور میں Time is money کا نعرہ ہے۔ ایک بے روح اور ظالم مقابلہ ہے۔ ایک امریکی یہودی سامایہ دار جارج سورس نے اپنے کثیر سرمائے کے زور پر ایشیائی سٹاک مارکیٹوں میں سرمایہ کاری کی اجارہ داری قائم کی۔ Shaking سے ایشیائی معیشتوں کو ہلا کر رکھ دیا اور پھر سرمایہ نکال کر ان مارکیٹوں کو تباہ کر دیا گیا۔ یہاں تو دولت کی حکمرانی ہے۔ قوت اور جبر کا نظام ہے۔ سارا ڈھانچہ بدترین استحصال پر مبنی ہے۔ انسان کی غلامی کے جدید طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ Mortgage کے نظام نے بینکوں کو اتنا طاقتور کر دیا ہے کہ انسان معاشی غلامی اور قرض (Debt-trap) میں مکمل طور پر جکڑا گیا ہے۔

سرمایہ داری نظام کا مہیب اور سفاک چہرہ جو آج نظر آ رہا ہے، تاریخی طور پر یورپ نے سامراجی ممالک نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں نوآبادیاتی نظام مسلط کر کے ان ملکوں کی دولت اپنے ممالک میں منتقل کی جس کا کچھ فائدہ یورپی عوام کو بھی ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فلاحی ریاست نے جنم لیا۔ امریکہ میں صدر روزویلٹ نے New deal کے ذریعے عوام کو معاشی حقوق دیئے۔ اشتراکی نظام کے خوف نے یورپ میں جمہوریت اور عوامی فلاح و بہبود کے

جذبے نے جنم لیا اور ریاست ایک فلاحی ادارہ بن گئی۔ برطانیہ میں کلیمنٹ جرمنی میں ویلی برانڈ اور اٹلی میں شٹ فرانس میں مائیکل روکا اور متران، سویڈن میں اولوف پالمے ایگر کارلسن، گورن پیٹرسن اور پرتگال میں فلپ گونزالویز اور ماریو سوارونیہ نے ڈیموکریٹک سوشلزم کے سیاسی نظام کو عوام کی بہتری اور فلاح کے لیے مخصوص کر دیا۔ ایشیائی ملکوں میں ملائیشیا میں مہاتیر محمد، سنگاپور میں لی کوان (Lee kuan) اور چین میں جو جن تاؤ اور جاپان کی پارلیمنٹ نے فلاحی پروگراموں کی بنیاد رکھی۔ بعد میں امریکی صدر رونلڈ ریگن اور برطانیہ کی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے بڑے سرمایہ داری نظام کو فروغ دیا اور نیٹو اور عسکریت پسندی کو مضبوط کیا۔

سرمایہ داری نظام اور سوویت یونین کے کمیونزم میں سرد جنگ سالہا سال جاری رہی جو بالآخر افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں لڑی گئی۔ سوویت یونین کو شکست ہوئی اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام ایک عفریت بن کر دنیا پر حاوی ہو گیا۔ امریکہ اس سرمایہ داری نظام کا سرغنہ بن گیا اور New World order کے نام پر ساری دنیا کے وسائل پر قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگا اور اس کی فوجی اور معاشی قوت کے سامنے دنیا سرنگوں ہو گئی۔ بقول ایک امریکی یہودی پروفیسر نوم چومسکی نے اپنی کتاب "The Rogue State" میں امریکہ کو ایک بدمعاش ریاست قرار دیا۔

سیموئیل پی ہنگٹن کے بقول سرد جنگ کے خاتمے کے بعد عالمی سیاست کے نئے دور نے جنم لیا۔ لوگ پرانے پرچموں کے سائے تلے گامزن ہیں اور نئے اور حقیقتاً پرانے دشمنوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ شاید اسی زمانے میں مائیکل ڈبز نے اپنے ناول "مردہ جھیل" میں ایک مقرر کی زبان سے یہ کہلوایا تھا:

"جن کے کوئی اصلی دشمن نہیں ہوتے، وہ ان کے سچے دوست بھی نہیں ہوتے۔ وہ اس وقت تک اپنوں سے محبت نہیں کر سکتے جب تک غیروں سے نفرت نہیں کرتے۔ یہ وہ قدیم حقیقتیں ہیں جنہیں ہم سو سال کے بعد جان رہے ہیں۔ جو لوگ ان حقیقتوں کو ٹھکراتے ہیں دراصل وہ اپنے خاندان، اپنے ورثے، اپنے جنم کے حق اور یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی ٹھکراتے ہیں اور انہیں کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

ہنگٹن کے بقول "قدیم تہذیبی حقیقتیں فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ جو شخص کے متلاشی اور نسل پرستی کو دوبارہ زندہ کرنے والے لوگ نئے دشمنوں کو وجود میں لا رہے ہیں اور سب سے

بڑی دشمنیاں دنیا کی بڑی تہذیبوں کے درمیان موجود ہیں۔'' ندیم نے بحث کو نئی سمت دیتے ہوئے کہا۔

رابعہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ زیر لب مسکرائی:

پروفیسر دلاور نے بات سمیٹتے ہوئے کہا'' سرد جنگ کے بعد امریکی اور مغربی تہذیب نے عروج حاصل کیا۔ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک امریکی قیادت میں سرمایہ دارانہ معیشت اور جمہوری نظام رکھنے والے معاشروں کا ایک گروپ اور دوسری طرف بکھرے ہوئے سوویت یونین کے نسبتاً معاشی طور پر کمزور معاشرے اور تیسری دنیا۔ لوگ نہ صرف اپنے مفادات کے حصول کے لیے بلکہ اپنے دشمنوں کو متعین کرنے کے لیے بھی سیاست کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس وقت یہ جان پاتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ جب ہم اپنے دشمن سے واقف ہوں۔ اس حوالے سے ہنری کسنجر کا کہنا ہے کہ ثقافتی اور تہذیبی جنگیں جدید اور قدیم تہذیب کے درمیان تصادم ہیں اور ایک نیا دشمن تخلیق کرنا ضروری تھا کیونکہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کے مصنف کہتے ہیں کہ پہلے چینی تہذیب اس کا ہدف تھی لیکن تاریخ کے بے رحم دھارے (Dia bectic of history) نے اس کا رخ اسلامی دنیا کی طرف موڑ دیا اور مغرب اور اسلامی دنیا کے اس تصادم کو (New Crucade) کا نام دیا گیا۔ ریپبلکن پارٹی کی حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں بھی آئی۔ امریکی صدر W.Walker Bush جس کی قیادت کر رہے تھے، وہ New cons جدید قدامت پرست کہلاتے تھے۔ جن کی راہنمائی Canglie Church کے مشہور پادری کر رہے تھے اور جو بائبل کی اس پیش گوئی کو سچا اور ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس میں ایک بہت بڑی جنگ Armagodon کا ذکر ہے جس کے وقوع پذیر ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ کا ظہور ہوگا اور عیسائی سیکڑوں سالوں سے حضرت عیسیٰ کے دوبارہ دنیا میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

New cons میں اکثریت ان لوگوں کی بھی تھی جو اس صدی کو امریکن صدی اور دنیا بھر میں امریکی طرز بود و باش کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ اس سے اچھے پہلو بھی ہیں لیکن بنیادی طور پر پوری دنیا میں امریکی غلبہ حاصل کرنے کا خواب ہے۔

ندیم جو خاموش بیٹھا تھا، پہلو بدل کر بولا۔ شاید وہ رابعہ کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

'' انکل دلاور! امریکہ کی اپنی تہذیب ہے۔ اگرچہ زیادہ پرانی نہیں لیکن امریکیوں نے

حیرت انگیز کمالات کیے۔ کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کی ایجاد امریکہ نے کی۔ بل گیٹس، دوورن برٹن، ایپل کا بانی، اسٹیو جان اور لاتعداد دوسرے لوگوں نے دنیا کے نقشہ بن کر رکھ دیا۔ آج کے ڈیجیٹل کیمرے، I-port، E-Banking، عام معمولات میں شامل ہیں۔

رفتہ رفتہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو گلوبلائزیشن اور پرائیویٹائزیشن کے نام پر پوری دنیا کے وسائل کو لوٹنے اور تیسری دنیا کا استحصال کرنے کے لیے ایک ایسا بلیک ہول پیدا کیا کہ قومی اور ریاستی کمپنیوں کو اس میں ضم کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بل بورڈ، اشتہارات اور Colebsities کو ملوث کر کے ایسے کمرشلز بنائے کہ لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی اشتہار ٹی وی چینلز میں مسلسل اور تکرار کے ساتھ بار بار دہرایا جائے تو انسانی ذہن پر نقش (Register) ہو جاتا ہے۔ اس Hammering کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کے دماغ اس چیز کو دیکھ کر بے اختیار متوجہ ہوتے ہیں۔ بچے اور عورتیں اس کا زیادہ شکار ہوتی ہیں۔"

"ساجد صاحب یہ Consumerism کیا ہے؟" رابعہ نے پوچھ لیا۔

ساجد صاحب نے اپنی طویل گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا:

"بیٹا یہ ایک خواہش کو بیدار کرنے کا عمل ہے۔ بڑے بڑے شاپنگ مالز بنا کر اس میں ہر چیز کی اتنی مقدار رکھ دی جاتی ہے اور کیونکہ اشتہاروں نے ان موضوعات کو آپ کے دماغ میں نقش کیا ہوتا ہے تو بے ساختہ آپ کا ہاتھ چیزیں پکڑ پکڑ کر ٹرالی بھرتا چلا جاتا ہے۔ اکثر آپ اپنی ضرورت سے زیادہ خرید لیتے ہیں۔ اس سارے عمل کو Consumerisim یا خریداری کا نظام کہتے ہیں۔ دنیا کی دس سب سے بڑی کمپنیاں امریکہ میں ہیں جیسے وال مارٹ، کیلوگ، اور میکسیکو Mextica۔"

"ساجد صاحب!" پروفیسر زبیر بولے "امریکہ کی پہلی تہذیب ہے جو زیادہ پرانی نہیں لیکن امریکیوں نے حیرت انگیز کمالات کیے ہیں۔ بل گیٹس، دوورن برنٹ اور جان میتھز امریکہ میں پیدا ہوئے۔ مجموعی طور پر امریکہ علم کا مرکز ہے۔ امریکہ میں ہارورڈ سے لے کر یونیورسٹی آف کیلیفورنیا تک یونیورسٹیوں کی ایک بھرمار ہے جہاں علم تخلیق ہوتا ہے۔ تحقیق ہوتی ہے۔ ریسرچ کرنا امریکہ کے طالب علموں کے مزاج کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ دنیا کی ٹاپ تین یونیورسٹیاں امریکہ میں ہیں۔

امریکی ثقافت نے دنیا بھر کی ثقافت اور کلچر کو متاثر کیا ہے۔ جینز اور ٹی شرٹ ایسا لباس ہے جس نے دنیا کے لباس کے کلچر میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ فاسٹ فوڈ نے کھانے کے آداب ہی بدل ڈالے۔ انہوں نے ورکنگ لنچ کا تصور دیا۔ وقت کی قیمت کا احساس دلایا Time is money کا نظریہ پیش کیا۔ وقت کی بچت امریکیوں کا طرز زندگی ہے۔ آج ہم جہاں رہتے ہیں، ایجادات کی بھرمار ہے۔ 2050ء میں ہم کہاں کھڑے ہوں گے، اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن یہ ساری ترقی انسان کے لیے ہے جس میں تضاد ہے، ٹکراؤ ہے۔"

دنیا میں معاشی طاقت ہی اصل طاقت بن گئی ہے۔ ایلون ٹافلر (Alvin Toffler) نے اپنی تین ہوش اڑانے والی کتابیں (1) Future Shock، (2) The Third Wave اور (3) Power Shift میں انسانی فکری ارتقا کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ آخری کتاب میں اس نے طاقت (Power) کے نئے معانی ترتیب دیے ہیں۔ سلطنتوں کا دور ختم ہو گیا۔ (The end of empire) قریباً 2050ء تک پوری دنیا کی تاریخ ارتقا باقی ساری انسانی تاریخ سے یکسر مختلف ہے۔ صنعتی انقلاب جسے وہ (Smoke stack civilization) کہتا ہے۔ اس نے صدیوں اس دنیا پر حکمرانی کی، وہ تبدیلی کی زد میں آئی۔ یہ تبدیلی (Change) اتنی تیز رفتار تھی کہ اس نے نسل انسانی کو ایک صدمے سے دوچار کر دیا۔ تبدیلی کا تاریخی عمل تیز سے تیز تر ہو گیا۔ بعض افراد، تنظیمیں اور اقوام کے لیے اس تبدیلی کے عمل کو جذب (Adaptation) کرنے کی صلاحیت کم تھی، لہٰذا وہ تذبذب کا شکار ہو گئے۔ ایک نئی معاشرتی قدر پیدا ہوئی کہ چیزوں کو استعمال کرو اور پھینک دو۔ ایک تھرو اوے (Through away) سوسائٹی نے جنم لیا۔

پہلی تاریخی لہر زراعتی انقلاب تھا۔ دوسری لہر صنعتی انقلاب تھا اور تیسری لہر میں کمپیوٹر، معلومات کا بہاؤ، بائیو ٹیکنالوجی، فری مارکیٹ اکانومی، میڈیا کا زبردست کردار، اب چوتھی لہر طاقت کی تبدیلی (Power shift) جس نے طاقت کے نئے معانی کو دریافت کیا۔ ماؤزے تنگ نے کہا تھا، طاقت بندوق کی نالی سے جنم لیتی ہے۔ کسی نے کہا، دولت ہی سب سے بڑی قوت ہے۔ فرانس بیکن نے کہا، علم بذاتِ خود ایک طاقت ہے۔ آج کی اقتصادیات علم پر مبنی ہیں۔ (Knowledge based economy) علم ایک بنیادی ہتھیار کی طرح طاقت کی کشاکش میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ کارپوریٹ سیکٹر ایک نئی قوت بن کر ابھرا۔ ایک کارپوریٹ کلچر پیدا ہوا۔ کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا سرمایہ افریقہ اور ایشیا کے بجٹ سے زیادہ ہے۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں

ایک عفریت بن چکی ہیں۔ سٹاک ایکسچینج (Stock Exchange) میں Speculative business ہوتا ہے۔ شیئرز کے اتار چڑھاؤ سے کمپنیاں امیر اور غریب ہوتی ہیں۔ شیئرز انڈیکس بین الاقوامی مارکیٹ کو متاثر کرتا ہے۔ کارپوریٹ سیکٹر میں Sharking ہوتی ہے۔ بڑی کمپنیاں چھوٹی کمپنیوں کو نگل جاتی ہیں۔ جس شہر میں وال مارٹ، میٹرو، کیش اینڈ کیری جیسے بڑے سٹور کھل جاتے ہیں، وہاں چھوٹے سٹور بن جاتے ہیں۔ سپر مارکیٹس کا زمانہ ہے۔ میکڈونلڈ، پیزا ہٹ، سب وے، ڈومینو اور لاتعداد برانڈڈ چین (Branded Chain) میں Gocci, Cartier (Armani، (Govlenchi)، (Saint Michal)، (Wrangler) اور سیکڑوں برانڈڈ کمپنیاں ہیں۔ فیشن ایک الگ انڈسٹری ہے۔ اربوں ڈالر کا کاروبار ہے۔ خوبصورت ماڈلز ہیں۔ فیشن شوز ہیں، کیٹ واک ہیں۔ ٹی وی چینل ہے۔ لسٹ بہت طویل ہے۔ Microsoft ہے، Dell ہے اور لاتعداد کمپنیاں ہیں جن کے بجٹ پاکستان کے بجٹ سے زیادہ ہیں۔

آج کے دور میں وقت دولت ہے۔ (Time is money) ایک بے روح اور الم مقابلہ ہے۔ Monopolies اور Cartelisation کا زمانہ ہے۔ اجتماعی معاشی مفادات کے گروہ میں جو مارکیٹ کو کنٹرول کرتے ہیں۔ Sharking کے ذریعے ایک امریکی یہودی ''جارج سورس'' نے سرمایہ کے زور پر ایشیا کی سٹاک مارکیٹوں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔ آج کا زمانہ بھی جبر و استحصال کا زمانہ ہے اور دنیا کو چھوڑ یئے امریکہ جو سرمایہ داری نظام کا سرخیل ہے، اس کارپوریٹ سیکٹر میں دولت کا ارتکاز کتنا ہے اور عام امریکی، افریقی نسل کے پاس کیا ہے۔ یہ ایک الگ تضاد اور المیہ ہے۔ عسکری لحاظ سے امریکہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی عسکری قوت ہے لیکن بقول ایک یہودی امریکی پروفیسر نوم چومسکی امریکہ ایک بدمعاش ریاست (Rogue State) بن چکا ہے۔ دنیا میں پبلسٹی سٹنٹ چھوڑے جاتے ہیں۔ جرمن نازی جنرل گوئبل نے کہا تھا کہ جھوٹ کو اگر مسلسل اور لگاتار تکرار کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں اُتار دیا جائے تو لوگ اسے سچ ماننے لگتے ہیں۔ اشتہارات کی بھرمار، ٹیلی ویژن، اخبارات اور بل بورڈ کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں پر تکرار Hammering کی جاتی ہے۔ خریداری کا شوق Shopping عورتوں کی (Hobby) بنا دیا گیا ہے۔ (consummerism) کو فروغ دیا گیا ہے۔ خواہش کے شعلوں کو مستقل ہوا دی جاتی ہے۔ مصنوعی طلب پیدا کی جاتی ہے۔ استحصال کے خوبصورت طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔'' ساجد صاحب نے لمبی تقریر کر ڈالی۔ پروفیسر زبیر نے رابعہ

کو چائے بنانے کو کہا اور گویا ہوئے:

''ساجد صاحب، آپ کا تجزیہ درست ہے۔ امریکہ ہر شعبے میں دنیا کو لیڈ کر رہا ہے۔ اس نے پوری دنیا کے کلچر اور ثقافت کو متاثر کیا ہے۔ لباس میں جینز اور ٹی شرٹ، کھانے میں برگر اور پیزا نے نئی عادات پیدا کی ہیں۔ پینے میں کوک اور پیپسی کولا پانی کا نعم البدل بن گئی ہیں۔ آج کی جدید دنیا میں وقت بہت قیمتی ہے۔ اس لیے ورکنگ لنچ کا تصور آیا ہے۔ امریکہ علم کا گہوارہ ہے۔ صرف ہارورڈ یونیورسٹی ہی کو لے لیں۔ دنیا جہان کے علم وہیں سے پھوٹتے ہیں۔ نئی نئی تھیوریاں، ریسرچ امریکیوں کا امتیاز ہے۔ ہم آج کی ہمہ گیر ترقی سے پریشان ہیں۔ (Maniature) کا دور ہے۔ آسانی ہی مقصدِ حیات ہے۔ انسان کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان کیسے بنایا جائے۔

سب کچھ انسان کے لیے بنایا جا رہا ہے۔ یہ آدم خاکی فضا میں طیاروں میں اڑ رہا ہے۔ یہ آدمی ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ یہ ذات کی تکمیل میں مصروف ہے۔ بقولِ اقبال:

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

آدم اس کائنات کی سب سے بڑی پہیلی (Puzzel) ہے۔ اس گوشت پوست کے نئے آدمی نے زمین کے خزانے دریافت کر لیے ہیں اور چاند کو مسخر کر لیا ہے۔ ایٹم کو توڑ کر مادہ کی حقیقت کو پالیا ہے جو مضبوط ہو تو طوفانوں کو زیر کر لیتا ہے اور کمزور پڑ جائے تو لمحوں میں گر پڑتا ہے۔ جو لمبی عمر پاتا ہے لیکن جوانی میں دل کی دھڑکن اچانک بند ہونے سے مر جاتا ہے۔ وہ جذبات میں آگ اور شعلہ ہے اور بیماری میں حسرت و یاس۔ جو عاقل ہو تو کائنات کے راز ڈھونڈتا ہے اور دیوانہ ہو تو خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ جو خوشی میں زندگی کو رنگ و نور دیکھتا ہے اور ڈپریشن میں مایوس اور بے دل ہو جاتا ہے۔ جو مکار بھی ہے اور معصوم بھی ہے۔ جو ظالم بھی ہے، رحمدل بھی ہے جو شدت غم میں قہقہہ لگاتا ہے اور انتہائی خوشی میں اس کی آنکھیں لبریز ہو جاتی ہیں جو زندگی سے بے پناہ پیار کرتا ہے اور خودکشی بھی کر لیتا ہے۔ جو قتل بھی کرتا ہے اور قتل بھی ہو جاتا ہے۔ جو پہاڑ سے زیادہ مضبوط بھی ہے اور گلاب کی پتی سے نازک بھی ہے۔ وہ کامیابی پر نازاں ہوتا ہے اور ناکامی میں افسردہ۔ جو اداس ہو تو اسے سارا شہر سائیں سائیں کرتا دکھائی دیتا ہے اور خوش ہو تو اسی شہر کی رونقیں دوبالا ہو جاتی ہیں۔ جو خوشی اور ناخوشی کا سنگم ہے۔ جو سکون اور

اضطراب کا پیکر ہے۔ جو موجود بھی ہے اور معدوم بھی ہے۔ جو سوچتا ہے تو وہ ہے اور نہ سوچے تو وہ نہیں ہے۔ جو بیداری میں خواب ہے اور خواب میں بیداری۔ جو مجبور مالک ہے مگر ذلت کا شکار ہے۔ جو افراط سے نازاں ہے کہ تفریق سے شرمندہ ہے۔ بقول غالب:

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی
ورنہ میں ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

جو شعور اور لاشعور میں معلق ہے۔ جو تضاد کا مجموعہ ہے۔ جس کے بارے میں اس کے خالق کی رائے ہے "وقت کی قسم، انسان خسارے میں ہے" جو کبھی محبت میں تڑپتا ہے تو کبھی وصال سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ جو حیران ہے مگر سماجی حیوان ہے۔ جو ہوس کا پجاری ہے اور قربانی کی منزل ہے۔ جو کہیں محبوبہ کے لیے تخت و تاج چھوڑ دیتا ہے اور کہیں سلطنت کے لیے باپ کو قیدِ تنہائی میں رکھتا ہے۔ جو بے حس ہے تو شرارہ کی طرح حساس بھی ہے۔ وہ عجب چیز ہے۔ آدمی جس کوکھ سے جنم لیتا ہے، اسی کوکھ کا دھندا کرتا ہے۔ وہ احسن تقویم بھی ہے اور اسفل السافلین بھی ہے۔ بلند ہو تو آسمانوں کی سیر کر آتا ہے اور پست ہو تو ذلت کی آخری گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ جو ہوس میں اندھا ہے۔ حسد میں آگ ہے۔ محبت میں شبنم ہے۔ نفرت میں شعلہ ہے۔ گفتار میں شیریں ہے، کردار میں کڑوا ہے۔ آستین کا سانپ بھی ہے تو دوستی کی مالا بھی ہے۔ جو فصاحت میں لاثانی ہے اور بلاغت میں لاجواب۔ جو دیرینہ دوست ہے اور کینہ دشمن جو حالتِ رکوع میں بھی ہے اور آستینوں میں بت بھی رکھتا ہے۔ "جو وہ ہے وہ نہیں ہے اور جو نہیں ہے، وہ ہے۔" جو حقیقت میں سیراب ہے اور سیراب میں حقیقت جو مقدر کا قیدی ہے مگر عمل میں خودمختار ہے۔ جو جبر کے آگے جھک بھی جاتا ہے اور استبداد کے آگے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ جو بزدل بھی ہے اور بہادر بھی۔ جو قاتل بھی ہے اور مقتول بھی۔ جو زہر کا پیالہ پی کر سقراط بن جاتا ہے اور بزدل بھی ہے اور بہادر بھی ہے۔ جو اندر بھی ہے اور باہر بھی ہے۔ جو سچ کو سربلند کر دیتا ہے اور جھوٹ کی غار میں اتر جاتا ہے جو منصور الحلاج بن کر انا الحق کی صدا لگاتا اور ژاں پال سارتر بن کر وجود being سے عدم Nothingness میں بدل جاتا ہے۔ اپنے آپ سے پیار بھی کرتا ہے اور اپنے آپ سے نفرت بھی کرتا ہے۔ وہ فرزانوں کی عقل کی پناہ گاہ بھی ہے اور دیوانوں کی طرح صحرا کا مسافر بھی۔ ابدیت پر یقین رکھتا ہے لیکن فنا ہونے سے خوفزدہ ہے۔ انسان ایک عجیب چیز ہے۔ زندگی ایک بہت بڑی پہیلی ہے۔ فانی بدایونی نے کہا ہے:

یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یہ ٹھوس ہے لیکن پانی کا بلبلہ۔ گلزار نے آدمی کے بارے میں خوب کہا ہے:

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
اور پانی کی بہتی سطح پر
ڈوبتا بھی ہے، ٹوٹتا بھی ہے
پھر ابھرتا ہے پھر سے بہتا ہے
نہ سمندر نگل سکا اس کو
نہ کوئی موج توڑ پائی ہے
وقت کی موج پر سدا لیٹا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

رابعہ چائے لے کر آئی تو آدمی پر بات ہو رہی تھی۔

پروفیسر نے کہا" زبیر صاحب! آپ نے بڑے خوبصورت انداز میں آدمی کی تعریف کی ہے لیکن آدمی کی تعریف ممکن ہی نہیں۔ یہ عجیب وغریب چیز ہے۔ اس کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہے۔ سارے فلاسفروں اور مفکروں نے آدمی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے اسے روحانیت سکھائی تو کسی نے بتوں کی پوجا پاٹ میں لگا دیا۔ فرائیڈ نے جنس کے حوالے سے اس کی تعبیر کی تو Libido کو ہر حرکت کا محرک بنا دیا۔ کارل مارکس نے معیشت اور معاش کو ہی بنیاد آدمیت قرار دیا۔ بنتھم نے خوشی کا متلاشی کہا تو سارتر نے اپنی ذات سے نفرت کا درس دیا لیکن کوئی آدمی کو نہیں سمجھ سکا۔"

پروفیسر دلاور نے بات جاری رکھی تو رابعہ نے کہا:

"آپ سب کی اجازت ہو تو میں آپ کو ن۔م۔راشد کی مشہور نظم سناتی ہوں۔ پہلے غالب کا شعر سنا دوں جو شاعروں کا امام ہے:

پانی سے جس طرح سے ڈرے سگ زدہ اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

ن۔م۔راشد نے آدمی سے مخاطب ہو کر کہا:

زندگی سے ڈرتے ہو
زندگی تو تم بھی ہو
زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو
آدمی تو تم بھی ہو
آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
حرف اور معانی کے رشتہ ہائے آہن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
ان کہی سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو
پہلے بھی تو گزرے ہیں دور نارسائی کے
بے ریا خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزو مندی
یہ شب زبان بندی ہے، رہ خداوندی
تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں راہ کا نشاں بن کر
دور کی زبان بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں صبح کی اذان بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو
روشنی تو تم بھی ہو
روشنی تو ہم بھی ہیں

روشنی سے ڈرتے ہو
شہر کی فصیلوں پر دیو کا جو سایہ تھا
پاک ہوگیا آخر
رات کا لبادہ بھی چاک ہوگیا آخر
اژدہام انسانوں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
ایک نیا جنوں لے کر
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو

''لیکن دلاور صاحب!'' پروفیسر گویا ہوئے۔
''انسان کا وجود اس وسیع وعریض کائنات میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔''
رابعہ نے کہا ''انکل کچھ کائنات کے بارے میں بتایئے۔''
پروفیسر دلاور نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا:
''بیٹا یہ بہت وسیع موضوع ہے۔ اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جس میں Steven Weinlurg کی مشہور کتاب ''اولین تین منٹ'' (The first three mintiees) شامل ہے لیکن Cosmology اور Quantin کے بارے میں تحقیق بہت مشکل ہے۔ کائنات کہاں سے آئی۔ اس کا آغاز کیوں اور کیسے ہوا۔ کیا وہ اپنے اختتام تک پہنچے گی اور اگر یہ ہوگا تو کیسے ہوگا۔ بات بوجھل ہو جائے گی۔ یہ سوال کہ کیا کائنات کا آغاز زمان (Time) کے اندر ہوا تھا یا کیا وہ مکان (Space) تک محدود ہے۔ اس بات کا جواب ایمونیل کانٹ (Immauual kant) نے اپنی کتاب "Critique of pure reason" میں دیا ہے۔ وہ ان سوالات کو عقل محض کے تضادات (Anomilies) کہا کرتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ دعویٰ کہ کائنات کا آغاز ہوا تھا اور اس کا جوابی دعویٰ کہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے، ایک جیسے وزنی دلائل رکھتے ہیں۔ دعویٰ کے لیے اس کا استدلال یہ تھا کہ اگر کائنات کی ابتدا نہ ہوتی تو ہر واقعے سے قبل لامتناہی وقت ہوتا

جو اس کے نزدیک لا یعنی (Absurd) بات تھی۔ جوابی دعویٰ کے لیے اس کی دلیل یہ تھی کہ اگر کائنات کا آغاز ہوا ہوتا تو اس سے قبل بھی لامتناہی وقت ہوتا۔ پھر کائنات کیونکر ایک خاص وقت سے شروع ہو سکتی تھی۔ اس کا مفروضہ یہ تھا کہ کائنات ہمیشہ سے ہو نہ ہو مگر وقت کا تسلسل ہمیشہ سے موجود ہے مگر ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کائنات کی ابتدا سے قبل وقت کا تصور کوئی معانی نہیں رکھتا۔ اس بات کی نشاندہی سب سے پہلے سینٹ آگسٹن نے کی تھی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا تو انہوں نے یہ جواب نہیں دیا تھا کہ خدا ایسا سوال پوچھنے والوں کے لیے دوزخ تیار کر رہا تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے کہا تھا کہ وقت یا زماں کائنات صنعت یا (Property) ہے جو خدا نے بنائی ہے اور وقت کائنات سے پہلے وجود نہیں رکھتا تھا۔

ہاں اگر کوئی چاہے تو سوچ سکتا ہے کہ کائنات کو بگ بینگ کے لیے تخلیق کیا ہے یا پھر اس کے بعد اس طرح بنایا ہو کہ ہمیں یہ تاثر ملے کہ اس کا آغاز بگ بینگ سے ہوا ہے۔

کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کائنات کی ابتدائی صورتحال کا سوال مابعد الطبیعات یا مذہب کا معاملہ ہے کیونکہ خدا قادر مطلق ہے اور کائنات کو جس طرح چاہے شروع کر سکتا ہے لیکن اس نے چاہا کہ کائنات کو بڑی ترتیب سے چند قوانین کے مطابق تشکیل دیا جائے۔

البرٹ آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت میں کہا کہ کمیت اور توانائی مساوی پن ہے۔ اس کی شہرہ آفاق مساوات $E\text{-}Mc^2$ جہاں E توانائی (انرجی) (m) سمیت (c) روشنی کی رفتار کے لیے ہے اور یہ قانون کہ کوئی بھی شے روشنی کی رفتار سے تیز سفر نہیں کر سکتی۔

بیسویں صدی کے عظیم فکری انقلاب سے پتہ چلا کہ یہ کائنات پھیل رہی ہے اور مختلف کہکشاؤں کا درمیانی فاصلہ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ کوانٹم میکینکس (Quantum Mechanic) کے نظریہ پر آئن سٹائن کو نوبل پرائز ملا تھا۔ یہ تھیوری ہمیں بتاتی ہے کہ تمام پارٹیکل (Particle) درحقیقت بریں ہیں۔ ایٹم کی تسخیر اور الیکٹرون نیوٹرون اور پروٹون کے دریافت کے ایک تہلکہ مچا دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح پارٹیکلز (Particles) کی توانائیاں لاکھوں اور کروڑوں وولٹ تک پہنچائی جا سکتی ہیں۔"

"کائنات میں بلیک ہول کا کیا تصور ہے؟" رابعہ نے اچانک پوچھ لیا۔ ندیم کو اس تجسس پر حیرت ہوئی۔

''زبیر صاحب! ایک گرم چائے کا کپ ضروری ہو گیا ہے۔ بات ذرا سائنسی ہو گئی ہے مگر حقیقتوں سے باخبر رہنا ہی تو علم ہے اور علم ہے کیا؟''

''تو ہاں بیٹا رابعہ۔'' پروفیسر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''نیوٹن نے ہمہ گیر تجاذب (Universal gravitation) کا ایک قانون تشکیل دیا جس کی رو سے کائنات میں موجود تمام اجسام ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اس کشش کا انحصار ان اجسام کی کمیت اور قربت پر ہے۔ نیوٹن کے نزدیک یہ تجاذب ہی ہے جو چاند کو زمین کے گرد بیضوی مدار میں گردش کرنے پر مجبور کرتا ہے اور زمین اور سیاروں کو سورج کے گرد بیضوی راستوں پر چلاتا ہے۔

بلیک ہول کے بارے میں ڈان جان مچل جو کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں، بہت خوبصورت بات کی ہے کہ آسمان پر ستارے بہت بڑی تعداد میں ہو سکتے ہیں مگر ہم انہیں دیکھ نہیں سکیں گے کیونکہ ان کی روشنی ہم تک نہیں پہنچے گی مگر ہم ان کے تجاذب (Gravitation) کی کشش تو محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی اجسام کو ہم (بلیک ہولز) کہتے ہیں۔ سٹیون ہاکنگ نے اپنی کتاب "A brief history of times" میں ان موضوعات جیسے کائنات کا ماخذ اور مقدر۔ طبعیات کی وحد پیائی اور وقت کا تیر The Arrow of time کی بات کی۔ باتیں بہت مشکل ہیں اور سائنسی مفروضوں (Hypothesis) پر مستعمل ہیں۔

کچھ سوالات صبح ازل سے انسان کو پریشان کر رہے ہیں۔

(1) کائنات کی بے پناہ اور بے کراں وسعتوں میں انسان کا مقام کیا ہے؟

(2) کیا یہ کائنات بامعنی ہے یا اس کی کوئی غایت ہے۔

(3) کیا اس کائنات کو انسان کی امنگوں تمناؤں اور خوابوں میں کوئی دلچسپی ہے۔

(4) کیا کائنات میں کوئی ذی شعور آفاقی قوت موجود ہے۔ اگر موجود ہے تو کیا یہ کائنات سے ماورا ہے یا اس میں جاری و ساری ہے۔

(5) کائنات ازل سے موجود ہے یا اسے کسی نے خلق کیا ہے۔ حقیقتِ کبریٰ کیا ہے؟

(6) زمان کی حرکت و گردش دولابی ہے یا خطِ مستقیم پر ہو رہی ہے۔ یعنی کیا کائنات کا آغاز ہوا تھا اور اس کا انجام بھی ہوگا یا وہ ازل سے موجود ہے اور ابد تک باقی رہے گی؟

(7) ذہن مادے کی پیداوار ہے یا مادے کو ذہن نے خلق کیا ہے؟

(8) انسان مجبور ہے یا مختار ہے؟ اگر مجبور ہے تو یہ جبریت داخلی ہے یا خارجی ہے۔ اگر مختار ہے تو اس کے وجود کے جبر و اختیار میں کیا فرق ہے۔ کیا روح کا جسم کے ساتھ کوئی تعلق ہے؟

(9) روح کیا ہے۔ کیا روح کا جسم کے ساتھ وہی تعلق ہے جو شعلے کا شمع کے ساتھ ہے کہ اِدھر موم ختم ہوا، اُدھر شعلہ بجھ کر رہ گیا یا روح خارج سے جسم میں داخل ہوتی ہے اور موت کے بعد کسی اور عالم کو لوٹ جاتی ہے؟

(10) ضمیر کیا شے ہے۔ کیا خیر و شر کا مبدا (Origin) ایک ہی ہے؟

(11) خیر و شر کی تمیز انسان میں وہبی ہے یا ماحول کے اثرات کی پیداوار ہے؟

(12) حسن کیا ہے۔ موضوع میں ہوتا ہے یا معروض میں؟

(13) فرد اجتماع کے لیے ہے یا اجتماع فرد کے لیے ہے۔

(14) کیا انسان کے تمام اعمال کا محرک حصول لذت کی خواہش ہے یا کیا وہ بلند تر نصب العین کی کشش بھی محسوس کرتا ہے؟

(15) مسرت کیا ہے۔ مسرت کا سرچشمہ انسان کے اپنے بطن ہی میں ہے یا وہ دوسروں کو مسرت پہنچا کر اس سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے؟

(16) اخلاقی قدریں کیا ہیں۔ کیا اخلاق مذہب کی ایک فرع ہے یا مستقل شعبہ علم و عمل ہے؟

(17) صداقت کیا ہے؟

(18) کیا انسان حیوان ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے؟

(19) کیا انسان کا کردار ہی اس کا مقدر ہے؟

(20) قدر و قضا کیا ہے؟ منشائے ایزدی ہے یا انسانی عمل کا نتیجہ ہے؟

ان سوالوں کے جوابات فلسفیوں نے بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی سکالر نے بھی حقیقت اشیاء کو تلاش کیا ہے اور سائنس دانوں نے تجرباتی تجزیے سے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ اپنے اپنے (Paradiam) میں سب صحیح ہیں۔

یونانی مفکر ہیر قلیطس کے اقوال میں دانش ہے:

''ہم ایک دریا میں دو دفعہ قدم نہیں رکھ سکتے کہ ہر لمحہ نیا پانی آتا ہے۔''

''ہر روز ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔''

"ہم ہیں اور نہیں ہیں۔"

اس نے کہا تغیر وتبدل حقیقی ہے۔ وجود وثبات فریب نظر ہے۔ ہر شے ہر وقت تغیر پذیر ہو رہی ہے اور ہر شے اپنے بطون میں اپنی ضد رکھتی ہے۔ اضداد اور پیکار اور آویزش میں حرکت اور زندگی ہے۔ یہ پیکار نہ ہوتو عالم میں کسی شے کا وجود نہ ہو۔ اسی بنا پر اس نے جنگ کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ "جنگ ہر شے پر خالق ہے اور ہر شے پر مسلط ہے۔"

تحریک احیائے علوم نے ابن رشد کو اس عقیدے کی اشاعت کی کہ صداقت دوگونہ ہے۔ مذہب کی صداقت اور فلسفے کی صداقت ولی انسلم (saint Ansalam) کا مشہور قول ہے: "میں پہلے عقیدہ رکھتا ہوں۔ پھر سمجھتا ہوں۔ پہلے سمجھ کر عقیدہ اختیار نہیں کرتا۔"

یورپ میں کسی فلسفی یا سائنسدان کو حق نہیں پہنچتا تھا۔ جو کسی ایسے علمی نظریے کی اشاعت کرے جو مذہبی عقائد کے منافی ہو۔ اس جسارت کی سزا موت تھی۔ برونو کو آگ میں جلایا گیا۔ گلیلیو کو گرفتار کیا گیا۔ وہ موت کی سزا سے بال بال بچا۔ کوپرنیکس کو اپنی کتاب اپنی زندگی میں شائع کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔" پروفیسر نے بات سمیٹتے ہوئے کہا بقول اقبال:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

رابعہ نے موقع پا کر کہا: "پروفیسر انکل! وہ بیس سوال جو آپ نے ابھی سنائے تھے، بہت سے مفکروں اور فلاسفروں نے ان کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے اور مزید کی جاری ہے مگر عقل انسانی محدود ہے۔ بہت ساری چیزیں ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں۔ ہمارے فہم سے بالاتر ہیں۔ ہم سب سے چھوٹے معمول کی علت سے بھی ناواقف ہیں۔ رسل نے اپنی مشہور کتاب "History of western philosophy" میں مغربی سوچ وفکر کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ رسل نے علت اور نتائج (Cause & Effect) کی بات کی ہراقلیت کا ایک کاز ہے۔ رسل ایک ریاضی دان تھا۔ اس نے اپنی تھیوری کو یہاں تک پھیلا دیا کہ اگر خدا اقلیت ہے تو اس کی کاز کیا تھی اور خدا کے وجود سے انکار کر دیا۔ فرانس کے مشہور سائنسدان لاپلاس نے اپنی کتاب نپولین کو پڑھنے کے لیے دی جس میں اس نے ثابت کیا تھا کہ طبعی حقیقت ہی کائنات کی اساس ہے۔ چند روز بعد نپولین نے بلا کر پوچھا "اس کتاب میں تو نے کہیں بھی خدا کا ذکر تو کیا ہی نہیں۔" لاپلاس نے کہا "مجھے علمی تحقیق میں کہیں بھی اس مفروضے کی ضرورت کا احساس نہیں

ہوا۔" ڈارون نے بے شمار شواہد اور انسانوں اور حیوان کے عضویاتی تقابل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان حیوان ہی سے ارتقا پذیر ہوا ہے اور وہ اوپر سے گرا ہوا فرشتہ نہیں ہے بلکہ نیچے سے اوپر اٹھتا ہوا حیوان ہے۔ قانون فطرت (Survival of the fittest) جن حیوانوں نے ماحول سے موافقت پیدا کر لی، وہ باقی رہے اور جو موافقت پیدا نہ کر سکے، فنا ہو گئے۔

ندیم نے رابعہ کی طرف دیکھا تو رابعہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ٹکرائیں تو شرارے سے پھوٹنے لگے۔ آنکھیں بھی بولتی ہیں۔ بہت بولتی ہیں جس کا چہرہ ذہن کا (Index) ہے۔ اسی طرح آنکھیں انسان کے اندرونی وجود (Inner self) کی کھڑکیاں ہیں۔ یہ جھیل سے بھی گہری اسی لیے ہوتی ہیں کہ انسان ایک دوسرے کے وجود میں ڈوب جاتا ہے۔ آنکھوں سے محبت کے پیالے بھی چھلکتے ہیں اور نفرت کے انگارے بھی برستے ہیں۔ آنکھوں میں مقناطیسی قوت ہے۔ ایک نظر التفافات، ایک دلفریب نگاہ۔ فیض نے کہا تھا:

"تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔"

آنکھیں کہیں کائنات میں پھیلتی ہوئی اور کبھی نقطے کی طرح سمٹی ہوئی اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ ندیم اور رابعہ کی آنکھیں شناسائی اور محبت کے جذبات میں مبہوت ہو گئیں جیسے جادوگر نے سحر سے پتھر کا بت تراش دیا ہو۔ وہ دونوں ساکت تھے۔ آنکھوں میں محبت کے جگنو ٹمٹما رہے تھے۔ وہ خاموش تھے اور آنکھیں بول رہی تھیں۔ نظریں دل کے صنم خانے کا طواف کر رہی تھیں۔ رابعہ کی آنکھیں احمد فراز کے اس شعر کی تصویر بن گئیں:

اُن کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

نیم وا آنکھیں رابعہ کو خوابوں کی دنیا میں لے گئیں۔ تصور نے انگڑائی لی۔ اسے لگا، ایک مدہوش رات کا دامن پھیلا ہے اور ندیم شیروانی پہنے خوشبوؤں سے مہکتے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ وہ پھولوں کی سیج پر محبت کے چراغ جلائے اس کی منتظر ہے۔ وہ خوابوں کا شہزادہ دلہن کے اس کے معطر پہلو میں بیٹھ جاتا ہے اور چپکے سے گھونگھٹ اٹھا کر کہتا ہے" رابعہ تم حسن کی پیکر ہو۔ تمہاری گہری جھیل جیسی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔" اور پھر رات انھیں اپنی آغوش میں لے کر سمیٹ دیتی ہے جیسے صحرا کی ریت میں دریا گم ہو جاتے ہیں۔ امجد کے اس شعر کی مانند:

کیا کہیں کیا دے سکے ہم زندگی کی پیاس کو

پانی جس کا ریت میں کھو جائے وہ دریا ہیں ہم

پروفیسر زبیر نے زور سے بولتے ہوئے کہا کہ "رابعہ کافی ہا دو۔"

رابعہ کو ایسا لگا کہ کسی نے اسے خوبصورت خواب سے جگا دیا ہو۔ اس نے غصے سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جو کوئی نیا فلسفہ بگھارنے لگے تھے۔

"پروفیسر ولاور صاحب! تاریخ کے بارے میں کچھ بتایئے۔"

"زبیر صاحب!" پروفیسر ولاور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا:

"تاریخ (History) کو مدر آف نالج کہا جاتا ہے۔ ہمارے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ ہمیں کیا سکھاتی ہے اور ہم تاریخ سے کیا سیکھتے ہیں۔" پروفیسر ولاور بولے "ویسے تو دنیا میں بہت نامور مورخ پیدا ہوئے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں ابن خلدون، طبری اور بہت سے نام ہیں لیکن میں اپنی گفتگو کو آرنلڈ جے ٹوائن بی (Arnold J Yoyn bee) اور ول ڈیورانٹ تک محدود رکھوں گا۔ ٹائن بی نے "تاریخ کے مطالعے" (A Study of History) میں فلسفیانہ انداز میں تاریخی حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ پہلے باب میں ہی ذریعہ کا حصول اور طریقہ اور اس کے نتیجے پر بحث کی ہے۔ (End ness) کا تجزیہ کیا ہے کہ کیا کچھ آفاقی یا کائناتی حالتیں ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

"We are connected with universal states, and we may begin by asking whether they are ends in themselves or means toward something beyond them."

ان کی کتاب کو ایک نشست میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ول ڈیورانٹ کی کتاب "The story of civilazation" ان کی زندگی بھر کی علمی تحقیق اور فکری کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ ان کی ایک مختصر کتاب "تاریخ کیا سکھاتی ہے" "Lessions of History" میں انہوں نے انتہائی اختصار سے تاریخی نتائج پر نظر ڈالی ہے۔ Will durant کے الفاظ میں "اکثر تاریخ قیاس آرائی پر مبنی ہے اور باقی ماندہ کی بنیاد تعصب پر ہے۔"

ول ڈیورانٹ کے بقول: "مورخ ہمیشہ واقعات اور انسانوں کے بے کراں ہجوم میں سے جس کی بے انتہا پیچیدگیوں کا نہ تو وہ احاطہ کر سکتا ہے اور نہ ہی ادراک۔" 1909ء میں چارلس پیگوئی (Charles peguy) کا یہ خیال تھا: پچھلے تیس سالوں میں دنیا میں ہونے والی تبدیلیاں

حضرت عیسیٰ کے دور سے لے کر اب تک ہونے والی تبدیلیوں سے زیادہ ہیں۔ بعض اوقات کسی ایک مرد کے کردار یا حالات میں تبدیلی اس دنیا کی معلومات کو وسیع پیمانے پر تہہ و بالا کر سکتی ہے جس طرح کثرت شراب نوشی، سکندر اعظم کی جوانی میں وفات اور اس کی قائم کردہ سلطنت کا پارہ پارہ ہونے کا سبب بنی۔ ''ہمارا حال ہمارے ماضی کا مجموعہ برائے عمل ہے اور ہمارا ماضی سمجھنے کے لیے پھیلا ہوا زمانہ حال۔''

فلسفہ میں ہم جزو کو کل کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ فلسفہ تاریخ میں موجود لمحے کو ماضی کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ انسان کائناتی وقت میں ایک لمحے کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمین پر اپنی زندگی گزارتا ہے۔ جاندار انواع میں ایک (Spore) نطفہ ہے اور نسل انسانی کا ایک فرد ہے۔ وہ ایک جسم و کردار اور سوچ کا مرکب۔ ایک خاندان اور گروہ کا رکن بھی ہے۔ انسان یا تو کسی مذہبی عقیدے کا پیروکار ہوتا ہے یا پھر متشکک (Sceptic) ہوتا ہے۔ وہ معیشت کے اندر ایک اکائی، ایک ریاست کا شہری یا ایک فوج کا سپاہی ہوتا ہے۔ کیا تاریخ سے انسانی فطرت اور مستقبل کے امکانات کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ پرانے حقائق کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کرتی ہے اور مختلف حوالوں سے منعکس ہوتی ہے۔ جیسے تاریخ کا اس کائنات سے گہرا تعلق ہے۔ انسانی تاریخ اس وسیع اور بے کراں کائنات میں ایک حقیر اور مختصر دھبہ کی مانند ہے۔ کوئی دوسرا سیارہ یا دم دار ستارہ یا بہت بڑا شہاب ثاقب ہماری دنیا کو نیست و نابود کر سکتا ہے لیکن انسان نے اس زمین پر ترقی کا ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اس سفر کے دوران درپیش تمام اسباب، امکانات و خطرات کے بارے میں ہمیں علم ہے۔ ہمارے پاس اس کا جواب وہی ہے جو پاسکل (Parcel) نے کبھی دیا تھا۔ ''اگر کائنات انسان کو نیست و نابود بھی کر دے تب بھی انسان اپنے پر فتح پانے والی ان کائناتی قوتوں سے عظیم تر ہوگا کیونکہ اسے یہ تو علم ہوگا کہ وہ مر رہا ہے جبکہ کائنات کو اپنی فتح کا کوئی علم نہیں ہو سکے گا۔''

اگرچہ انسان نے دیوقامت بحری جہاز، بلند تر عمارتیں (Sky scrappers) اور تیز ترین طیارے بنا لیے ہیں۔ زرق برق شاہراہیں بنائی ہیں۔ نیویارک، لندن، شنگھائی اور بے شمار خوبصورت شہر اور بستیاں آباد کی ہیں لیکن ایک زلزلہ، ایک سونامی ایک سمندری طوفان پل بھر میں سب کچھ تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ حال ہی میں جاپان میں سونامی اور ترکی کے زلزلے اس کی نزدیک ترین مثالیں ہیں ورنہ تاریخ میں بے شمار شہر، علاقے اور قومیں آفات سماوی اور تغیر ارضی سے نیست

و نابود ہو گئیں۔ سائنسدان اور ماہر ارضیات کہتے ہیں، دنیا سات بڑی پلیٹوں پر مشتمل ہے اور زلزلے ان پلیٹوں کے سرکنے سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بڑے سونامی نے دنیا کے کئی ساحلی شہروں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ سمندر کی تہہ میں ایک پلیٹ کے سرنے سے اتنی بڑی تباہی ہو سکتی ہے تو دنیا انتہائی ناپائیدار جگہ ہے جو کسی بڑے اور خوفناک زلزلے یا سونامی سے تباہ و برباد ہو سکتی ہے۔ ماہر ارضیات بتاتے ہیں کہ انسان خود بھی اپنے گھر (زمین) کو تباہ کر رہا ہے۔ مختلف گیسوں کے اخراج سے ہماری زمین کے گرد ایک ہالہ (Ozon lear) تیزی سے تباہ ہو رہی ہے۔ اس کی جگہ اس میں خلا پیدا ہو رہے ہیں۔ اس غلاف کا کام سورج کی تیز کرنوں کو فلٹر کرتا ہے۔ اگر یہ غلاف تباہ ہو گیا تو خلا کی بدولت انسانی صحت پر خوفناک اثرات مرتب ہوں گے اور کینسر کی بیماری وبا کی طرح پھیلے گی اور دنیا کا درجہ حرارت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ گلیشیئر پگھل رہے ہیں، سمندر کی سطح پر پانی کی مقدار میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ Green house effect اور Globel wraming پر کانفرنسز ہو رہی ہیں۔ فطرت جہاں ہمیں پروان چڑھاتی ہے، وہیں ہمیں برباد کر دیتی ہے۔ بارشیں کم ہوں تو تہذیبیں ریت میں دفن ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ وسطی ایشیا میں ہوا اور اگر بہت زیادہ بارشیں ہونے لگیں تو تہذیب و تمدن جنگل کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں جیسا کہ وسطی امریکہ میں ہوا۔

ابن خلدون نے (المقدمہ) میں جہاں قبائلی عصبیت کا نظریہ پیش کیا ہے کہ انسانی تاریخ میں تہذیبی ترقی اور خوشحالی کا باعث بھی ہے لیکن لاکھوں انسانوں کے قتل کا باعث بھی ہے۔ گرم علاقوں کے لوگ اپنی آب و ہوا کی بدولت سست اور کاہل ہوتے ہیں۔ اسی کے باعث یہ سرد علاقوں کے سخت جان اور مضبوط لوگوں کے محکوم رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کی ترقی میں بہت اہم ہے۔ انسان کو دریا، جھیلیں، نخلستان اور سمندر اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

مصر کو دریائے نیل نے آباد کیا۔ میسوپوٹیمیا (Meso potamia) میں دریاؤں کے درمیان بہت سی تہذیبیں پروان چڑھیں۔ ہندوستان کی تہذیب دریائے سندھ، گنگا اور جمنا کی مرہون منت تھی۔ اٹلی کے دریائے ٹیبر (Tiber) اور ارنو (Arno) کی بدولت تھی۔ فرانس کے تمدن کے فروغ کا باعث دریائے رہون (The Rhone) اور دریائے سین (Seine) تھے۔ اسی جگہ قدیم جنگیں دریاؤں کے قبضے کے لیے لڑی گئیں۔ جہاں زندگی تھی خوشحالی تھی۔ ول ڈیورانٹ نے کہا ہے "تمدن انسان پیدا کرتا ہے زمین نہیں۔"

تاریخ انسان کا حیاتیاتی سبق یہی ہے کہ زندگی پیہم مقابلہ کا نام ہے۔ مقابلہ نہ صرف بیوپار کی جان ہے بلکہ یہ تو جان کا مقابلہ بھی ہے۔ جانور ایک دوسرے کو بغیر کسی ہچکچاہٹ یا بنا کسی ضمیر کی خلش کے کھا جاتے ہیں۔ مہذب انسان ایک دوسرے کو ہڑپ کرنے کے لیے قانون کا سہارا لیتے ہیں۔

ہماری ریاستیں بھی چونکہ اجتماعی طور پر ہماری نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کا رویہ بھی بالکل ہمارے رویوں جیسا ہوتا ہے۔ یہ ہماری فطرت کو وسیع پیمانے پر منعکس کر دیتی ہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ زندگی ترجیحی بنیادوں پر انتخاب کے عمل سے عبارت ہے۔ خوراک کے حصول، جیون ساتھی کی تلاش یا طاقت کے لیے مقابلے کی دوڑ میں بعض جاندار کامیاب ہوتے ہیں اور بعض ناکام۔ چونکہ فطرت (یہاں اس سے مراد کائنات کی کلی حقیقت اور اس کے تمام عوامل ہیں) نے نہ تو امریکی اعلان آزادی یا انقلاب فرانس کے دوران جاری ہونے والے انسانی حقوق کے اعلامیہ کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ ان پر عمل کرنے کی پابند ہے کہ سب انسانوں کو برابر بنادے۔ قدرت کو "اختلاف" بہت مرغوب ہے۔ بچوں میں سو طرح کے فرق پائے جاتے ہیں اور مٹر کے دو دانے بھی ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے۔

ہمارا آزادی اور مساوات کا تخیلاتی گٹھ جوڑ (Union) فطری طور پر مضحکہ خیز ہے کیونکہ آزادی اور مساوات کا ازلی اور مستقل بیر ہے۔ جہاں ان میں ایک غالب ہو تو دوسرا خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

تاریخ کا ایک خلاصہ یہ بھی ہے:

جنوب کے لوگ تہذیبیں پیدا کرتے ہیں۔ شمال کے رہنے والے انہیں فتح کر لیتے ہیں۔ برباد کر دیتے ہیں اور پھر انہی سے تہذیبیں مستعار لے کر ان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی میں ازل سے جتنے بھی خدا کے پیغمبر اور رسول آئے ہیں یا عظیم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا ہے۔

اگر تاریخ کو اخلاقیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ساری انسانی تاریخ، جرم اور گناہ سے لتھڑی ہوئی ہے۔ جسم فروشی، ہم جنس پرستی اور دوسرے اخلاقی جرائم کی ابتدا انسانی تمدن کے وجود میں آتے ہی ہو گئی تھی۔ اس لیے آج کی جنسی بے راہ روی پر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

والٹیئر کے مطابق "تاریخ بنی نوع انسان کے جرائم، حماقتوں اور بدنصیبیوں کا مجموعہ ہے۔"
گبن (Gibben) بھی تاریخ کے اس فیصلے سے پوری طرح متفق نظر آتا ہے۔
تاریخ کا مذہب سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ول ڈیوانٹ کہتا ہے کہ تاریخ کے حوالے سے خدا پر یقین رکھنے کے عقیدے کے حق میں دلائل نکلتے ہیں۔ اگر خدا سے ہماری مراد فطرت کی تخلیقی قوت کے بجائے ایک باشعور، رحیم و کریم، اعلیٰ و ارفع ہستی سے ہے تو اس کا جواب قدرے تذبذب کے ساتھ نفی میں ہوگا۔ تاریخ دراصل ایک ایسی جدوجہد اور کشمکش کے نتیجہ میں موزوں ترین افراد یا گروہوں کے انتخاب کا عمل ہے جس میں نہ تو نیکی اور اچھائی کو کسی قسم کی برتری حاصل ہے جہاں قدم قدم پر حادثات اور ناکامی کا سامنا ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت ہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ تمام مذاہب کے راہنما ہمیں بتاتے ہیں کہ نیکی قوت غالب آتی ہے لیکن تاریخ ایسے کسی نتیجے کے لیے کوئی یقین نہیں کرواتی۔ فطرت اور تاریخ کو ہماری اچھائی اور برائی کے تصورات سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کے نزدیک اچھا وہی ہے جو باقی رہتا ہے اور برا وہ جو مٹ جائے، یہ حقیقت ہے کہ "جب تک غربت باقی رہے گی، دیوتا موجود رہیں گے۔"
معاشیات اور تاریخ کے حوالے سے ول ڈیوانٹ کہتا ہے: "جو لوگ انسانوں کے منتظم ہیں، وہ دراصل ایسے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں جو محض اشیاء کو قابو کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ دولت کے منتظم ہیں وہ اشیاء اور لوگ سب کو قابو میں رکھتے ہیں۔"
ڈیورانٹ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ارتکاز دولت فطری اور ناگزیر عمل ہے۔ اس عمل میں وقتاً فوقتاً پرتشدد یا پرامن طور پر دولت کی ازسرِ نو تقسیم کے باعث رکاوٹ پڑتی رہتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تمام معاشی تاریخ، سماجی نظام کے دل کے سست رو دھڑکن کی مانند ہے جس میں دولت کا جمع ہونا اور لازمی طور پر دوبارہ گردش میں آنا دل کے سکڑنے (Stytole) اس کے پھیلنے (Diastole) کے عمل سے مشابہ ہے۔
جنگ اور تاریخ کا بھی ایک ربط باہم ہے۔ جنگ کی وجوہات بھی تقریباً وہی ہیں جو افراد کے درمیان مقابلہ کی ہوتی ہیں یعنی حرص، جھگڑالو پن اور غرور۔ علاوہ ازیں خوراک، زمین، اشیاء اور ایندھن کے حصول کی طلب اور سب سے بڑھ کر حاکمیت کی خواہش، تاریخ کی عسکری توجیہہ پر یقین رکھنے والوں کے نزدیک جنگ مسائل کا آخری حل ہے۔
ایک جرنیل کہتا ہے "جنگوں میں بہت سے نوجوانوں کا ہلاک ہونا بلاشبہ افسوسناک

ہے لیکن اس کو کیا کہیے کہ جنگ کی نسبت ٹریفک کے حادثوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی طرح بے شمار نوجوان ڈسپلن کی کمی کے باعث دنگا فساد کرتے ہوئے ہلاک ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنی مہم جوئی اور جنگجو فطرت کی تسکین کے لیے اپنی بے کیف زندگی اور اکتاہٹ کے باعث کسی نکاسی کے راستے (Outlet) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انہوں نے جلد یا بدیر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ انہیں جنگ کی خوفناک اور پر عظمت فضا میں اپنے وطن کے لیے مرنے دیا جائے۔"

تاریخ اپنے آپ کو وسیع تر تناظر میں اس حلیے دہراتی ہے کہ انسان اکثر وقوع پذیر ہونے والی صورت حال اور محرکات مثلاً بھوک، خطرہ اور جنس کے زیر اثر لگے بندھے طریقوں کے مطابق ہی عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ایک نکتے پر سب مورخین کا اتفاق ہے کہ تمدن پیدا ہوتے ہیں، پروان چڑھتے ہیں، روبہ زوال ہوتے ہیں اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی کی کوکھ سے نئے تمدن جنم لیتے ہیں۔

ندیم نے رابعہ کی طرف دیکھا جو اس دقیق گفتگو سے اکتانے لگا تھا۔ اس نے دیکھا کہ رابعہ کے گلاب کی پنکھڑی کی طرح نازک ہونٹوں پر ایک تبسم ہے، مسکراہٹ ہے۔ ایک دل لبھا دینے والی مسکراہٹ۔ یہ مسکراہٹ بھی عجیب چیز ہے۔ مسکراہٹ عطیۂ خداوندی ہے۔ ہونٹوں پر موتی بکھیرتی ہوئی، نازک اور حسین، مسکراہٹ روحانی خوشی کا عکس ہوتی ہے تو جسمانی راحت کا اظہار، مسکراہٹ سے من کے اندر مسرت وشادمانی کے دروازے کھلتے ہیں اور خوشی کی دیوی نازک ہونٹوں پر سحر کر دیتی ہے۔ جیسے کوئی پری اپنے پر پھیلا دیتی ہو۔ مسکراہٹ جہاں خوبصورت اظہار ہے، وہاں مہلک ہتھیار بھی ہے۔ کبھی مسکراہٹ دل کی ترجمان بن گئی تو کبھی جذبوں کی پیغام رساں ہوگئی۔ محبوب کی ایک معصوم سی مسکراہٹ کایا پلٹ دیتی ہے۔ جہاں محبت کی رازداں بن کر دلوں کو راحت پہنچاتی ہے وہاں دکھاوے کی مصنوعی مسکراہٹ (Cosmatic Smile) فریب کا جال بن دیتی ہے۔ طوائف کی مسکراہٹ ہیجان پیدا کرتی دعوت گناہ بن جاتی ہے تو سچے محبوب کی مسکراہٹ الہامی آیات کی طرح مقدس تحریر بن جاتی ہے۔ مسکراہٹ رومانس کی جان ہے، محبت کی روح ہے۔ دلوں کی راحت ہے۔ خوابوں کی تعبیر ہے۔ خیالوں کی تجسیم ہے۔ دل کا محراب ہے تو روح کا حرم ہے۔ پھول کی نزاکت ہے، شبنم کی ٹھنڈک ہے۔ دھوپ میں سایہ ہے، تمازت میں حرارت ہے۔ درد کی دھڑکن ہے، اضطراب کی دشمن ہے۔ راحت کی امانت ہے۔ سکون کا مسکن

ہے۔ اطمینان کا خیمہ ہے۔ دہکتا ہوا انگارہ ہے۔ لپکتا ہوا شرارہ ہے۔

ندیم پر جیسے محبت کی پھوار پڑ گئی ہو۔ وہ چاہت میں ڈوبا ہوا بس دیکھتا ہی چلا گیا۔

پروفیسر زبیر نے کہا "دلاور صاحب! آج کی نشست تو بہت نتیجہ خیز رہی اور میں آپ کے علم کی داد دیتا ہوں لیکن کچھ سوالات ہیں۔ اگر آپ مختصر جوابات میں سمجھا دیں تو عنایت ہو گی۔ یہ کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی اور میں صرف اسے محسوس کرتا ہوں۔" رابعہ نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

پروفیسر زبیر نے سوال کیا "یہ بتایئے، جبر کیا ہے اور موت کا کیا راز ہے؟"

پروفیسر دلاور مسکرائے۔ سگریٹ سلگایا اور بولے:

"آپ نے ساغر صدیقی کا مشہور شعر یاد کرا دیا:

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

جبر دراصل ایک پیچیدہ لفظ ہے اور استبداد یعنی ظلم سے جڑا ہوا ہے۔ جبر اپنی مرضی، خواہش اور مرضی کے برخلاف ایسی زندگی ہے جس میں کوئی دوسری وقت آپ پر حاوی ہو اور آپ کو لاچار کر کے اپنی مرضی مسلط کر دے۔ جبر کا غلامی سے بھی رشتہ ہے یعنی اپنی مرضی کے بغیر زندگی گزارنا۔ منیر نیازی کے اس شعر میں جبر کی ایک نئی جہت ہے:

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
زندگی میری تھی لیکن بسر اس نے کیا

یہ بھی ایک خوبصورت زاویہ ہے۔ جبر کا مقدر سے بھی تعلق ہے لیکن تقدیر کیا ہے؟ مقدر کسے کہتے ہیں؟ جبر و اختیار میں کیا فرق ہے؟ قدر و قضا کیا ہے؟ بات بہت دور تلک جائے گی۔ اقبال کے الفاظ میں

خود بخود ٹوٹ کے گرتی نہیں زنجیر کبھی
بدلی جاتی ہے بدلتی نہیں تقدیر کبھی

یعنی تقدیر کو تدبیر سے بدلا جا سکتا ہے۔ تقدیر اٹل نہیں ہے۔ عمل سے بدل جاتی ہے۔ دعا سے بدل جاتی ہے۔ بلائیں صدقات سے ٹل جاتی ہیں۔ بری ساعتیں لوٹ جاتی ہیں۔ جبر و اختیار کے بارے میں حضرت علیؓ کی مثال بڑی خوبصورت ہے۔ جب ایک بدو نے آپؓ سے

پوچھا کہ جبر اور اختیار سمجھایئے تو حضرت علیؓ نے اس کے ذہنی لیول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا:

''اپنی ایک ٹانگ اٹھاؤ۔ اس نے اٹھالی۔ آپؓ نے فرمایا اور دوسری ٹانگ بھی اٹھاؤ۔ اس نے کہا، نہیں اٹھا سکتا۔ آپؓ نے فرمایا۔ پہلا فعل تیرا اختیار تھا اور دوسرا جبر ہے جو تو نہیں کر سکتا۔''

انسان بہت ترقی کرنے کے بعد بھی جہاں اس کے اختیار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے وہاں وہ جبر کا شکار بھی ہے۔ اچانک حادثہ کیوں ہو جاتا ہے؟ غلطی کرنے والا بچ جاتا ہے اور معصوم مارا جاتا ہے۔ جرم کوئی اور کرتا ہے اور ہمارے نظام انصاف میں سزا کسی اور کو مل جاتی ہے۔ عدالتیں انصاف نہیں کر سکتیں۔ صرف بنائے قانون کے مطابق فیصلے کرتی ہیں۔ اسی لیے خدا نے انصاف کے ساتھ عدل کے لیے احسان کی شرط رکھی ہے۔ جہاں انصاف ممکن نہ ہو، احسان کرو۔ جبر ایک انسان کا دوسرے انسان پر بھی ہے۔ افراد کا افراد پر بھی ہے اور ریاست بھی کسی ریاست کو اپنے تسلط میں رکھتی اور جبر کا نشانہ بناتی ہے۔ عورت اکثر مرد کے جبر کا نشانہ بنتی ہے جو اس سے اس کی اپنی مرضی چھین کر اپنی ذاتی مرضی مسلط کر دیتا ہے۔ مرد اس کے جسم پر حق ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی سوچ پر بھی پہرے بٹھا دیتا ہے۔ محبت میں اگر Possession ہے۔ قبضہ کرنے کی کوشش ہے تو محبت بھی جبر ہے۔ ایک غیر محسوس طور پر پنجرے میں قید کر لینا۔ محبت میں گرفتار ہو جانا۔ گرفتار کا مطلب ہی یہی ہے کہ پابندِ سلاسل ہو جانا۔ قید ہو جانا، آزادی کھو بیٹھنا۔

زبیر صاحب! یاد رکھیں آگاہی محبت کی جان ہے۔ اندھی محبت غلامی ہے۔ Love & awareness کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے ورنہ محبت جبر کا دوسرا نام بقول منیر نیازی:

''میں جس سے پیار کرتا ہوں اسی کو مار دیتا ہوں۔''

محبت میں کوئی ابھرتا نہیں، گر پڑتا ہے۔ you never rise in love you always fall in love. دوسرے لفظوں میں محبت میں بلندی نہیں ہے، آزادی نہیں ہے۔ پابندی ہے، گراوٹ ہے۔ اپنی ذات کو surrender کرتا ہے۔ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ خود کو کسی کی مرضی میں ڈالنا ہے۔ خود فنا ہو کر کسی اور کو بقا دینی ہے۔ اسی لیے تو لوگ محبت میں جان دے دیتے ہیں۔ خودی کا سودا کر دیتے ہیں۔ مرد عورت کی محبت کے سامنے بے بسی سے اس کا تابع ہو جاتا ہے اور اپنا کنٹرول اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی خود سپردگی میں اپنی ذات کو فنا تک لے جاتی ہے۔ خود کو محبوب کے سپرد کر دیتی ہے۔ یونانی فلسفی کہتے ہیں کہ پہلے مرد اور عورت کا جسم ایک ہی تھا، جکڑا ہوتا ہے۔ یکتا تھا جدا نہ تھا لیکن ظالم دیوتا نے حسد

میں اسے کاٹ کر الگ الگ کر دیا۔ تب سے وہ دوبارہ ایک ہو جانا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حصہ بن جانا چاہتے ہیں اور جنسی ملاپ میں شاید یہی خواہش ہوتی ہے۔ فارسی کا مشہور شعر ہے

تو من شدم من تن شدم

محبت کے غیر محسوس رومانی پنجرے میں انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور محبوب کو حاصل کرنے، قبضہ کرنے کی خواہش اسے مار دیتی ہے جیسے شریر بچے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس کے خوبصورت رنگوں سے متاثر ہو کر ان کو پیار سے پکڑتے ہیں اور ان کا یہی پیار تتلی کی موت بن جاتا ہے۔ انسان کی فطرت بھی ایسی ہی ہے کہ خوبصورت چیزوں کو اپنی قید میں بند رکھنا چاہتا ہے، چاہے ان کا دم ہی نکل جائے۔ جبر کے بارے میں میر تقی نے خوب کہا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
جو چاہتے ہیں آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

بہادر شاہ ظفر نے بڑے کرب کے ساتھ جبر کا اظہار کیا ہے:

آئی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے چلے

جہاں تک موت کا تعلق ہے تو موت کیا ہے۔ اسے مذہبی مفکروں، فلسفیوں اور عام لوگوں نے جیسے بھی سمجھا ہے، بیان کر دیا ہے لیکن سب نے اتفاق کیا ہے کہ موت اٹل ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ اس کا نہ کوئی وقت مقرر ہے نہ کسی جگہ کا تعین ہے کہ کب اور کہاں آئے گی اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کوئی حادثہ اس کا سبب بنے گا۔ کوئی بیماری اس کا باعث بنے گی۔ کیوں؟ کب؟ کہاں؟ اور کیسے آئے گی، ہمیں معلوم نہیں لیکن ہمارے ذہن میں بات رجسٹرڈ ہے کہ ہم نے مر جانا اور ضرور مر جانا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مر جانا ہے۔ غالب کہتے ہیں:

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

تمام عمر زندگی بھر موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس دنیا میں موت کے بے پناہ سامان ہیں۔ جدید اسباب بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ بیکٹیریا (Becteria) اور وائرس، ملیریا اور ڈینگی بخار، معمولی سے جراثیم ہماری زندگی کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ ہم گاڑی، ٹرین اور ہوائی جہاز میں سفر کے دوران ہلاک ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کو دوسروں کو مار دینے کی جبلت ہوتی ہے۔ لاکھوں

انسانوں کے ہاتھوں اور اس کے ہتھیاروں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ قتل ہوتے ہیں۔ قاتل بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور مقتول بھی ویسے ہی انسان ہوتے ہیں۔ انتقام ایک اور خوفناک جذبہ ہے جو وحشیانہ طور پر دوسروں کو ہلاک ہی نہیں کرتا۔ دوسرے انسانوں کا سر ہی قلم نہیں کرتا، اسے گولیوں سے چھلنی ہی نہیں کرتا۔ اس کی لاش کو پامال کرتا اور افغانستان میں وحشت کا روپ دھار کر "رقصِ بسمل" دیکھتا ہے۔ اسلامی موت کا رقص دیکھتا ہے۔ دشمن کی موت پر شادیانے بجاتا ہے۔ خوشی سے رقصاں و فرحاں ہوتا ہے اور پھر خود بھی موت کی صلیب پر لٹک جاتا ہے۔ موت کو خریدا اور بیچا بھی جاتا ہے۔ مر کر بھی کسی کو نقصان یا فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ موت کے بعد زندگی کا تصور موت کو آسان کر دیتا ہے۔ کسی بڑے مقصد کے حصول کی خاطر سقراط زہر پی کر موت کو گلے لگا لیتا ہے اور تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حق کی خاطر کربلا برپا ہوتی ہے تو شہادت کے متوالے شوق سے اللہ کی راہ میں جامِ شہادت نوش کرتے ہیں۔ بڑے لوگ مر کر موت کو شکست دے جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے: "موت زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔" یعنی موت اپنے وقتِ مقررہ تک زندہ ہی نہیں رکھتی، زندگی کی حفاظت بھی خود کرتی ہے۔ موت کیا ہے؟ یہ بہت بڑا سائنسی سوال ہے۔ اوشو کہتا ہے "ہمارے اختیار میں کچھ نہیں۔ زندگی پہلے ہی ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ موت نے ہر صورت آنا ہے۔ یہ بڑی حقیقت ہے۔ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو پہلے دن ہی ہمارا ایک قدم قبر کی طرف چلا جاتا ہے۔" (we are dead the day we are born) یہ دراصل جس دن ہم جنم لیتے ہیں، اسی دن مر جاتے ہیں یعنی زندگی ہو گئی ہے۔ اب موت نے ہو جاتا ہے۔ درمیان میں ایک وقفہ ہے Life has happened, death will happen there is only a pause. یہ مختصر وقفہ ہے۔ یہ وقفہ ہی زندگی ہے۔ زندگی موت کے خوف سے معمور ہے۔ زندگی کتنی ہے، کم ہے، زیادہ ہے۔ اب ہے، کب تک رہے گی، خوف ہے۔ موت کی دہشت ہے۔ لوگ بیچارے مر جاتے ہیں۔ کسی بھی وجہ سے ہوں۔ مر تو جاتے ہیں۔ ہم نے بھی مرنا ہے۔ آج وہ گیا، کل ہماری باری ہے۔ مر جائیں گے تو آگے کیا ہو گا؟ مذہب والے قبر کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ سانپ اور بچھوؤں سے ڈراتے ہیں، اندھیرا ہو گا۔ سب چھوڑ جائیں گے۔ ہم نہیں ہوں گے لیکن ہمارے بچے، ہماری بیوی، والدین، زمین، جائیداد، بینک بیلنس، عمر بھر کی کمائی دوسروں میں بٹ جائے گی۔ زندگی میں جن بچوں سے ہم دیوانہ وار پیار کرتے تھے، وہ جائیداد کی تقسیم پر لڑ رہے ہوں گے۔

موت ایک خوف ہے۔ یہ لامحدود خوف، مرنے کا خوف، مرنے کے بعد کا خوف، انجام کار کا خوف، اپنی خطاؤں اور گناہوں کے حساب کا خوف، سزا کا خوف۔ شاعر نے کہا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے ہم

موت سے آگے ایک اندھیرا ہے، تاریکی ہے۔ وحشت ہے۔ (Dust unto dust) مٹی میں مٹی ہونے کی بات ہے۔ روح اگر ہے تو کہاں ہوگی۔ پہلے جو مر گئے کیا وہ واقعی مر گئے یا وہ کسی اور شکل میں کسی اور دنیا میں کسی اور حالت میں زندہ ہیں۔ مفروضے ہیں، مذہب کی اپنی مائی تھالوجی (Mythology) ہے۔ پیغمبروں کی تعلیمات ہیں، عقیدے کی بات ہے۔ مذہب کہتا ہے، ہم مرتے ہیں لیکن مرتے نہیں کسی اور دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ ہم فنا نہیں ہوتے، صرف انتقال ہوتا ہے۔ زمین سے کہیں اور نامعلوم مقام پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ کہاں؟ یہ نہیں جانتے۔ بس مذہبی عقیدے پر یقین رکھتے ہیں کہ جو روحیں لطیف یا کثافت سے پاک ہوتی ہیں، وہ کسی بلند مقام پر راحت میں ہوتی ہیں اور جو گنہگار اور کثافت زدہ روحیں ہوتی ہیں، وہ اسی دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہیں اور جب اپنی جمع کی ہوئی دولت کو اپنے ہی بچوں کے درمیان لڑائی اور مقدمے بازی میں تقسیم اور برباد دیکھتی ہیں تو وہ چیختی، چلاتی زمین پر ہی بھٹکتی رہتی ہیں۔ ہندوؤں کے نیک بندوں اور بدکار بندوں کی روحوں کو آواگون کے نظریہ میں بدل دیا۔ اگر زندگی میں "پُن" نیک کام کیے ہوں گے تو اگلے جنم میں بہترین انسانی شکل میں واپس زمین پر آئیں گی اور اگر گناہ اور بدکاری کی ہوگی تو انسان سے کمتر شکل یعنی حیوانی شکل میں دوبارہ جنم لیں گے۔ خدا کہتا ہے انا للہ وانا علیہ راجعون ترجمہ: "پس تم اللہ ہی کے لیے ہو اور اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔"

جو مابعد الطبعیات (Metaphysics) کو نہیں مانتے اور روح کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں یا اس کا شعور نہیں رکھتے۔ وہ موت سے زیادہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دولت مند اور امیر لوگ غریبوں کی نسبت موت سے زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں۔ یہ بے تحاشا دولت جمع کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ بھروسہ کرتے ہیں کہ بہترین ہسپتال، بہترین ڈاکٹر پیسے لے کر ان کو موت کے منہ سے بچالے گا لیکن دولت کا کتنا بڑا سے بڑا حصار ہو، محافظوں کی بہترین فوج ہو۔ تحفظ کی اونچی فصیلیں ہوں۔ موت تو برحق ہے۔ جب آتی ہے تب آ جاتی ہے۔ کوئی سپیشلسٹ، کوئی بڑے سے بڑا امراض دل کا ماہر موت کو نہیں روک سکتا۔ امریکہ کے سب سے

بڑے دماغ کے ماہر (Neurosurgion) نے ایک انٹرویو میں کہا: ''میں دو مریضوں کے دماغ کا آپریشن اپنی پوری مہارت، یکسوئی اور میڈیکل نالج سے کرتا ہوں۔ کوئی مریض بے ہوشی سے زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے تو کوئی موت کی وادی میں چلا جاتا ہے۔ دونوں کے لیے میرا علاج ایک جیسا ہوتا ہے۔ رتی بھر فرق نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا ''میرا پختہ یقین ہے کہ کوئی ماورائی قوت جو مجھ سے زیادہ مہارت اور قدرت رکھتی ہے۔ کسی کو زندگی دے دیتی ہے اور کسی سے زندگی لے لیتی ہے۔ وہ ماورائی طاقت خدا ہے اور میں خدا کو مانتا ہوں؟''

موت حکم ربی ہے۔ امرالٰہی ہے۔ کسی شاعر نے موت کے بارے میں کہا کہ درحقیقت یہ کیا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشاں ہونا

تو زندگی عناصر کا ظہور ترتیب ہے اور موت انہی اجزا کا پریشاں ہونا ہے لیکن انسان بڑا گھمنڈی ہے۔ جب صحت منداور توانا ہوتا ہے، جوانی کے نشے میں بدمست ہوتا ہے۔ پر کیف، مسرور، نشے میں چُور اور مستقبل سے بیگانہ ہستی کے غرور میں نازاں لیکن غالب نے خوب کہا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہستی ایک فریب ہے۔ یہ ہستی نہیں نیست ہے، ہونا بھی نہ ہونا ہے۔ یہ دامِ خیال ہے، فریب نظر ہے لیکن غالب ہی نے موت کے بارے میں ایک خوبصورت بات کہی کہ جیسا ہم سوچیں گے، ویسا ہی مرنے کے بعد ہوگا۔ اگر اچھا گمان رکھیں گے تو اچھا ہوگا اور برا گمان رکھیں تو برا ہوگا۔ غالب کو مرنے کے بعد حسن سلوک پر اتنا یقین تھا کہ وہ کہتا ہے

ہے خیال حسن میں، حسن عمل کا سا اثر
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

یعنی میرے خیال حسن کا یا دوسرے لفظوں میں خوبصورت زندگی اور جنت کے حصول کا اتنا بڑا یقین ہے کہ میری قبر میں ایک دروازہ ہے جو کھلا ہے اور سیدھا جنت کی طرف جاتا ہے۔''

سب نے واور صاحب کی بصیرت کی داد دی۔ زبیر صاحب نے خاص کر ان کے جوابات کا شکریہ ادا کیا ہی تھا کہ رابعہ بول پڑی:

''انکل، اب ذرا حسد اور لالچ کے بارے میں بھی بتا دیجئے۔ یہ ہمارے ہاں بہت نقصان کرتے ہیں۔ Jeoleusy & Greed انسان کے بڑے دشمن ہیں۔ عورتوں میں مردوں کی نسبت یہ دونوں منفی جذبے ضرورت سے زیادہ موجود ہیں۔ کیا یہ ہماری فطرت کا حصہ ہیں؟''

''رابعہ بیٹا! یہ ہماری فطرت کا حصہ ہیں اس کا زبردست تقاضا ہیں۔ حسد انتہائی خوفناک انسانی جذبہ ہے جو حاصل نہیں ہوتا۔ پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ حسد اور ملکیت (Jeolessy & Possession) کا گہرا ساتھ ہے۔ جہاں کسی پر قبضہ جمانے یا پالینے کی ہوس ہوگی وہیں حسد کا پودا بھی اُگ آئے گا۔ ماں کی گود میں معصوم بچہ دوسرے بچے کے آنے کے بعد دوبارہ ماں کی گود کی طرف لوٹتا ہے اور نئے بچے (اپنے بھائی یا بہن) کو اپنا دشمن سمجھتا ہے کہ اس نے اس کی ماں پر قبضہ کر لیا ہے۔ بعض اوقات یہ حسد اتنا خطرناک ہو جاتا ہے کہ ماں کو چھوٹے بچے کو بڑے بچے سے بچانا پڑتا ہے۔ انڈین فلم ایکٹر سلمان خان نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے ماں کے حوالے سے اس قدر حاسد تھا کہ اس نے چھوٹے بھائی کو پلنگ سے گرا دیا تھا۔ سب بڑے بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ عورتوں مردوں کو، بیویاں شوہروں کو اتنی شدت سے (Possess) کرتی ہیں۔ ان کو ذاتی ملکیت سمجھتی ہیں۔ پنجاب کے دیہات میں ان پڑھ عورتیں اپنے خاوندوں کو ''میرا بندہ'' کہتی ہیں۔ یہ ملکیت پسندی کی انتہا ہے۔ بندہ تو کسی کا نہیں ہوتا۔ صرف اللہ کا بندہ ہوتا ہے لیکن عورت اسے اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ بندہ تو اپنے خالق اللہ کا بندہ نہیں بنتا، کسی عورت کا بندہ کیا بنے گا جسے وہ صرف اپنا بندہ سمجھتی رہتی ہے وہ کوئی دوسری عورتوں کا بندہ بھی ہوتا ہے مگر اسے پتہ نہیں ہوتا۔ درحقیقت حسد ایک ایسی آگ ہے جس کی تپش میں حاسد خود ہی جلتا رہتا ہے۔ اپنے اندر اپنی ہی چتا جلانے والی بات ہے۔ اپنی سلگائی ہوئی جہنم میں خود داخل ہو جاتا ہے۔ اپنی دوزخ بھی آدمی خود ہی تیار کرتا ہے۔ ایک بزرگ صوفی نے اپنے شاگرد سے کہا۔ ''مجھے آگ چاہیے، چاہے کہیں سے بھی لے کر آؤ۔'' شاگرد پہاڑوں کو تلاش کرتے کرتے ایک بڑی سی غار میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں آگ ہی آگ نظر آتی ہے۔ ایک داروغہ غار کے دروازے پر کھڑا تھا۔ شاگرد نے کہا ''براہ کرم تھوڑی سی آگ دے دیں۔'' داروغہ نے کہا ''دوزخ میں آگ نہیں ہوتی۔'' شاگرد نے حیرانگی سے پوچھا ''اندر تو آگ ہی آگ ہے۔'' داروغہ نے سادگی سے جواب دیا۔ ''یہاں جو بھی آتا ہے اپنی دوزخ کی آگ ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔''

حسد رشتے میں تمیز نہیں کرتا۔ یہ انبیا کی زوجہ مبارک میں موجود تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی پہلی بیوی ہاجرہ جن کے ہاں حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے اور آپ کی کنیز سارہ بی بی جب حکم ربی سے دوسری زوجہ بن گئیں جن سے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ دونوں پاک دامن بیویوں میں بے شمار حسد پیدا ہوا اور دونوں میں اپنے اپنے بیٹوں کو وارث ابراہیم علیہ السلام بنانے پر سخت رقابت اور حسد نے جنم لیا۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں آپ حضرت یوسف علیہ السلام سے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ باقی بھائیوں نے حضرت یوسف کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ اسی حسد کا نتیجہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے دل میں حسد اور ایمان اکٹھے نہیں رہ سکتے اور فرمایا "حسد سے بچو، حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

بابا فرید گنج شکر فرماتے ہیں کہ "اگر تو سوو گی چاہتا ہے تو حسد مت کر۔"

اسلام میں حسد کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جو آدمی حسد سے بچ گیا، وہ آدمی برائیوں سے بچ گیا کہ حسد ہی نفرت میں بدل جاتا ہے اور نفرت تو زہری زہر ہے۔

یہ بھی اہم بات ہے کہ حسد کرنا تو گناہ ہے لیکن اپنے حاسد پیدا کرنا بھی گناہ سے کم نہیں۔ جب آپ دولت اور خوشحالی کے قصے بڑھا چڑھا کر لوگوں کو بتاتے ہیں تو وہ اس سے خوش نہیں ہوتے، حسد کرنے لگتے ہیں اور دعا مانگنے لگتے ہیں کہ اس کی دولت چھن جائے اور یہ بھی ہمارے جیسا ہو جائے۔ رسول پاک صلعم نے فرمایا:

"اگر تم اچھا اور مہنگا کھانا کھا رہے ہو تو اپنے غریب پڑوسیوں کے سامنے مت کھاؤ اور یہاں تک فرمایا کہ پھل کھا کر اپنے دروازے کے باہر نہ پھینکو۔ مبادا تمہارے غریب ہمسائے کے بچوں میں حسد اور احساس کمتری پیدا نہ ہو۔"

تاریخ عالم ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حسد نے سلطنتیں برباد کر دیں۔ تاج و تخت خون آلود کر دیے۔ بھائیوں کو بھائیوں کے ہاتھوں قتل کروایا۔ ہر عورت مرد سے دس گنا حاسد ہے۔ خوبصورت عورت سے دوسری عورتیں بے پناہ حسد کرتی ہیں۔ ان کا بس چلے تو اسے قتل کر دیں۔ عورت میں مقابلہ آرائی بہت ہے۔ دوسری عورت کے لباس، زیور حتیٰ کہ میک اپ سے بھی حسد کرنے لگتی ہیں۔ عورتیں بے پناہ (Possessive) ہوتی ہیں۔ ایک شفیق اور رحمدل ماں کسی دوسرے بچے کو پالتے ہوئے سوتیلی ماں کیوں بن جاتی ہے اور دوسری عورت کے بچے پر مظالم کی

انتہا کر دیتی ہے۔ حسد ایک بھیانک جذبہ ہے۔ منفی ہے اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ اب رہی لالچ کی بات تو رابعہ بیٹا غور سے سنو۔

تم نے یہ عام سی کہاوت تو سنی ہوگی کہ لالچ بری بلا ہے لیکن کبھی گہرائی میں اس کے معانی تلاش نہیں کیے ہوں گے۔ بلا مصیبت اور عذاب کو کہتے ہیں۔ یہ بلا کسی بڑے جن یا مافوق الفطرت کو بھی کہتے ہیں۔ عربی میں کرب و بلا یعنی تکلیف اور دکھ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ دشت نینوا میں سب سے زیادہ تکلیف اور مصائب کی جگہ۔ جہاں مصائب ہی مصائب تھے۔ دشت نینوا میں اس جگہ کا نام کربلا ہے جہاں معرکہ حق و باطل بپا ہوا۔

تو لالچ ایک بلا ہے۔ لالچ سے ہوس کا بھی گہرا تعلق ہے۔ (Greed & lust) دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ ہوس شدید بھوک سے بھی زیادہ طلب ہے۔ ہوس پرستی نفس کی مکمل پیروی ہے اور وہ بھی نفس امارہ کی جو برائیوں کا نفس ہے۔ نفس لاوازمہ اور نفس مطمئن تو اعلیٰ ترین صفات ہیں۔ نفس امارہ شہوت ہوس اور لالچ کی آماجگاہ ہے۔ حضور اقدس (محمد صلعم) کی حدیث مبارکہ ہے "نفس انسانی کی شکل میں خدا نے اپنا بدترین دشمن پیدا کیا۔" نفس امارہ لالچ کو جنم دیتا ہے۔ لالچ خواہشات نفسانی کو بڑھاتا ہے۔ لالچ اندھا ہوتا ہے، لہٰذا جب انسان لالچ میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لالچ عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ بصیرت کی شمع بجھا دیتا ہے۔ لالچ جسم میں زہر کی طرح پھیل کر پورے جسم کو لالچ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انسان، انسان نہیں رہ جاتا مجسم لالچ بن جاتا ہے۔ یہ ٹھگ، بہروپیے، جعلی پیر اور نوٹ دگنا کرنے والے انسان کے اندر کے لالچ کو اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ اس کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ عورتیں اصلی زیور دے کر دگنا نقلی زیور لے لیتی ہیں۔ اصلی نوٹ لے کر جعلی نوٹ دوگنا لے کر پچھتاتی ہیں۔ یہ چند مثالیں ہیں ورنہ جائیداد کے لالچ میں بیٹے باپ کو پاگل قرار دلوا دیتے ہیں۔ جہاں عورت اور لالچ مل جائے، پورے پورے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ وارث اور تاج و تخت کے لالچ کی عبرتناک مثالیں موجود ہیں۔ لالچ نے افراد اور خاندان کو نہیں سلطنتوں کو بھی برباد کیا ہے۔ اقتدار، اختیار، دولت، جائیداد کا لالچ، عورت کو حاصل کرنے کی ہوسناک خواہش کا لالچ، لالچ کی سو قسمیں ہیں۔ سو رنگ ہیں لیکن انسانی نفس امارہ میں لالچ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

مہاتما بدھ کے الفاظ ہیں "جب نفرت، لالچ اور کینہ کی آگ بجھ جاتی ہے تو نروان (دائمی سکون) حاصل ہوتا ہے۔ پھر لالچ کی کوئی حد نہیں، لالچ مزید لالچ کو جنم دیتا ہے اور یہ سلسلہ

ختم نہیں ہوتا۔" اس کہاوت سے کہ جب تک لالچ زندہ ہے، ٹھگوں کو کوئی فکر نہیں۔ روحانیت میں نفسِ امارہ کو کنٹرول کر کے نفسِ مطمئنہ کی طرف جایا جاتا ہے۔ اس لیے صوفی کہتے ہیں کہ لالچ کی جڑ ہی کاٹ دو۔ کچھ پاس مت رکھو۔ کوئی خواہش ہی نہ کرو تا کہ انسان لالچ سے آزاد رہے۔

حدیث پاک ہے کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا" جاہل سخی اللہ کو عابد بخیل سے زیادہ پسند ہے۔" لالچ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے حق سے زیادہ چاہتا ہے۔ لالچ ایک بیماری ہے تو اس کا علاج قناعت ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ لالچی کے پیٹ کو صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔"

رابعہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔" کچھ ڈر اور خوف کے بارے میں بتائیے۔"

"رابعہ بیٹی! خوف ایک خوفناک بیماری ہے۔ خوف ایک ایسا عمل ہے جو ڈر پیدا کرتا ہے۔ ڈر اور خوف ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ انسانی ترقی کے عمل کے پیچھے بھی ایک خوف ہے۔ انسان مستقبل سے ڈرا ہوا ہے۔ امیر لوگ اس بات سے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ کہیں ان کی دولت اور امارت نہ چھن جائے۔ برسرِ اقتدار حکمران اس شدید خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کا اقتدار نہ جائے کیونکہ دولت اور اقتدار بے شمار دشمن پیدا کر دیتے ہیں۔ دولت دشمن پیدا کرتی ہے اور دولت پسند خوفزدہ رہتا ہے کہ اس کی دولت نہ چھن جائے جس کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ امیر دراصل اپنے لاشعور میں چھپے خوف سے گھبراتا ہے کہ وہ غریب نہ ہو جائے۔ وہ مرتبہ اور مقام جو اس کی شخصی صفات سے نہیں محض دولت سے حاصل ہوا ہے، کہیں کھو نہ جائے۔ اسی طرح عام لوگ بھی مختلف خوف کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے بیماری کا خوف، آنے والے برے وقت کا خوف۔ کسی پیارے کے بچھڑ جانے کا خوف۔ غربت کا خوف، موت کا خوف، بے عزتی اور توہین کا خوف۔ اولاد کے مستقبل کا خوف۔ ہزاروں قسم کے خوف ہیں جن سے ہم روزانہ زندگی میں دوچار ہوتے ہیں۔

"The Psychology of Fear" ایک بہت بڑا مضمون ہے۔ خدا کا خوف بدی سے روکتا ہے۔ خدا خود کہتا ہے کہ" جو لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں، دراصل وہی میری اطاعت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی مخلوق کو دو ذرائع سے اپنے لیے اطاعت طلب کی ہے۔ دوزخ کے خوف سے کہ وہاں دہکتی ہوئی آگ کے شعلے ہیں اور جنت کی ترغیب سے کہ اگر برے اعمال کرو گے تو جہنم کے شعلے ملیں گے اور اگر اچھے کام کرو گے تو جنت کے حقدار بن جاؤ گے اور جنت میں

حوریں، پھل، دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ شراب طہورہ ملے گی۔ جزا اور سزا کا تصور بھی خوف کی پیداوار ہے۔ انسان موت کے خوف سے دوچار ہے۔ دنیا کی رونقیں اور دلکشیاں وہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اہل وعیال سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ اپنی پیاری چیزوں سے بچھڑنے سے وہ خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی جب چالیس سال سے اوپر آتی ہے تو بڑھاپے کا خوف اس کے وجود کو ہلا دیتا ہے۔ خوبصورت عورتوں میں یہ خوف کہ ان کا حسن اور جوانی قائم نہیں رہے گی، بڑا ہی روح شکن ہے۔ Old age syndrone بذات خود ایک خوف کی بیماری ہے۔ اسی لیے Anti aging چیزوں کا استعمال، واٹر تھراپی اور بیوٹی پارلرز میں ہزاروں ونکش، کریمیں اور سکن ٹریٹمنٹ اسی خوف کا نتیجہ ہیں۔ ایک اسی خوف پر ملین ڈالرز کی کاسمیٹکس (Cosmetic) انڈسٹری چل رہی ہے۔ Anti aging اور Anti wrinkle وٹامن کے استعمال سے لاکھوں عورتیں بڑھاپے کو روکنے کے لیے اعلان جنگ کر دیتی ہیں۔ صرف ایک بڑھاپے کے خوف کی خاطر۔ مرد کے بارے میں کہتے ہیں کہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا لیکن آج کے دور کا مرد بھی نسوانیت کی زد میں ہے۔ اس لیے مردوں کے مساج پارلرز اور بیوٹی پارلرز الگ ہیں۔ آپ خوف کی گہرائی میں جائیں تو انسان کے ہر عمل کے پیچھے ایک خوف کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا اور یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ آپ جس چیز کے خوف میں مبتلا ہیں، وہی خوف انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو لوگ برے وقت (Rainy days) کے لیے رقم بچا کر رکھتے ہیں، گویا وہ برے وقت کو بلا رہے ہوتے ہیں اور ان کا لاشعور برے وقت کو تلاش کر رہا ہوتا ہے اور ان پر برا وقت ضرور آتا ہے۔ یہ کشش کا اصول (Law of attraction) ہے۔ آپ اچھا سوچیں گے تو اچھا ہوگا، برا سوچیں گے تو برا ہوگا۔ آپ بیماری سے خوفزدہ ہوں گے تو بیمار ہو جائیں گے۔ اگر ڈرائیونگ کرتے ہوئے ٹریفک کے ہجوم سے خوفزدہ ہو کر حادثے کے بارے میں سوچیں تو حادثہ ضرور ہوگا۔ کاروبار میں نقصان کے بارے میں ڈریں تو لاشعور ایسی حرکات کروائے گا کہ نقصان ہی ہوگا۔

خوف پیدائشی نہیں ہے۔ خدا بچے کو آزاد پیدا کرتا ہے لیکن وہ آہستہ آہستہ خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مائیں بچوں کو سلانے کے لیے خوف کا سہارا لیتی ہیں۔ بچوں کو ڈراتی ہیں کہ سو جاؤ ورنہ جن بابا آ جائے گا۔ کبھی یورپ میں مائیں بچوں کو ترکوں سے ڈرایا کرتی تھیں۔ برطانیہ میں مائیں عرصہ تک بچوں کو سلانے کے لیے ٹیپو سلطان سے ڈرایا کرتی تھیں۔ اس طرح ہم بچوں

میں خود ہی خوف پیدا کرتے ہیں۔ صرف اپنی سہولت کے لیے کہ بچہ سو جائے۔

اسی طرح کچھ نفسیاتی عوامل کی وجہ سے عورتیں چھپکلیوں (Lazards) کاکروچ اور چوہوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ نفسیات میں بے شمار قسم کے ڈر (Phobias) ہیں۔ وہ خوف جو بے بنیاد ہوتے ہیں لیکن ہوتے ہیں (unfounded fears) جیسے بند جگہوں کا خوف (clustro phobia) بلندی کا خوف۔ کچھ لوگ کسی اونچے مینار پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھیں تو بلندی کا خوف اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پانی کا خوف (Hydro Phobia) ایک تو دریا یا سمندر کا خوف ہے۔ دوسری طرف پاگل کتے کے کاٹنے سے جو بیماری (Rabbies) ہوتی ہے اس کی انتہائی کیفیت میں انسان پانی سے ڈرتا ہے کیونکہ اسے پانی میں کتے نظر آتے ہیں۔ غالب نے خوب منظر کشی کی ہے:

پانی سے جس طرح سے ڈرے سگ زدہ اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

کہ جس طرح کتے کا کاٹا ہوا پانی سے ڈرتا ہے کہ اس کو پانی میں کتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح میں کیونکہ انسان کا کاٹا ہوا ہوں تو جب مجھے آئینے میں اپنی صورت نظر آتی ہے تو میں اپنے آپ سے ڈر جاتا ہوں۔

خدا نے جنت کے بارے میں جو بتایا ہے، اس میں دو ہی چیزیں انسانی نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی "ولا خوفا" یعنی وہاں خوف نہیں ہوگا۔ کتنی بڑی بات ہے کہ جنت میں کوئی خوف نہیں ہوگا اور کوئی حزن یا پچھتاوا نہیں ہوگا۔ اگر خوف اور پچھتاوا (Fear & repentence) سے اسی دنیا میں نجات مل جائے تو یہی دنیا جنت بن جائے گی۔

روحانیت کی بنیادی تعلیم ہی یہی ہے کہ خوف کو ختم کرو۔ خوف ہی روح کا قاتل ہے۔ اس لیے کہتے ہیں پیسے جمع مت کرو کیونکہ جمع کرو گے تو پھر ان کے کھونے کا ڈر ہوگا۔ اچھے کھانے کی لت پڑ گئی تو پھر اسی ڈر میں رہو گے کہ کہیں کھانے ملنے بند نہ ہو جائیں۔

ہندوؤں، بدھوں اور دوسرے مذاہب میں ترک دنیا کا درس اسی لیے دیتے ہیں کہ اگر بیوی بچے ہوں تو ان کی فکر پڑی رہے گی۔ ضروریات پوری کرنی پڑیں گی۔ پھر وہی پیسہ کمانے کا چکر ہوگا اور ضروریات کے بڑھ جانے سے زیادہ پیسوں کی ضرورت۔ رشوت، دھوکا فریب، جھوٹ اسی لیے جنم لیتے ہیں کہ ضروریات کے لیے پیسے مل جائیں اور انسان ایک شیطانی چکر میں گرفتار ہو

جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ سارا قصہ ہی ختم کرو۔ فقیر ہو جاؤ، سب کچھ ہی چھوڑ دو۔ اپنی توانائی ان سوچوں میں ضائع نہ کرو۔

اس لیے بھی یہ کرو کہ اگر کسی سے پیار کرو گے تو پھر کھونے کا ڈر ہوگا۔ کسی سے دوستی مت کرو۔ کسی سے دشمنی مت کرو۔ دوستی، دشمنی کے چکر ہی میں مت پڑو۔ یہ بقول ان کے خدا کو ماننے یا نہ ماننے کے چکر میں ہی مت پڑو۔ کسی کی سرے سے پروا ہی نہ کرو۔ خدا کو ماننے یا نہ ماننے کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ مت کہو کہ میں خدا کو نہیں مانتا کیونکہ یہ کہنے کا مطلب ہوگا کہ خدا کوئی چیز ہے جس کو میں نہیں مانتا۔ اس سے ہاں، ناں کے چکر ہی میں نہ پڑو۔ باہر کی کسی چیز پر توجہ ہی نہ دو کیونکہ کوئی اچھا ہے نہ برا۔ نیکی اور بدی ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں یعنی کوئی اچھا نہیں، کوئی برا نہیں۔ کوئی خوبصورت نہیں، کوئی بدصورت نہیں۔ یہ سب تمہارے دیکھنے کا طریقہ ہے۔ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ (Beauty is in the eyes of the beholder) کسی چکر میں نہ پڑو۔ اپنے آپ کو سمجھنے میں لگے رہو اور اسی چیز پر توجہ دو۔"

ساجد صاحب جو لگتا تھا کہ خاصے خوفزدہ ہو گئے ہیں، گھبراہٹ میں بولے "خوف کی تھیوری بتا کر آپ نے تو مجھے بھی خوفزدہ کر دیا ہے۔ یہ بات بتائیے کہ خوف پر قابو کیسے پایا جا سکتا ہے؟"

رابعہ نے بھی اضافہ کرتے ہوئے کہا "ایک غیر محسوس خوف (Fear of the unknown) بھی تو ہوتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟"

پروفیسر دلاور نے ہنستے ہوئے کہا "گرم گرم کافی کے بغیر تو ان مشکل سوالوں کا جواب دینا ممکن نہیں۔"

کافی فوراً ہی آ گئی۔

پروفیسر دلاور نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا:

"مغرب میں لوگ مذہب سے دور ہو گئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے جدید اصطلاحات سے خوف کو قابو کرنے کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی روحانیت والے تصور کرنا (Visualization) کہتے ہیں۔ اگر آپ امیر ہونا چاہتے ہیں، کاروباری بننا چاہتے ہیں تو آپ اپنی امارت اور کاروبار کا تصور کریں کہ آپ ایک بہت بڑے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ نیچے سٹور میں گاہک آ رہے ہیں۔ آپ کو آمدنی ہو رہی ہے۔ آپ کا لاشعور اس منظر کی تلاش میں نکل پڑے گا اور خود ہی اس کا راستہ ڈھونڈے گا۔ اس میں اصول یہ ہے کہ آپ نے اپنے لاشعور کو اپنی

منزل پر پہنچنے کی تصویر دکھائی ہے اور آپ کو اپنے اندر بیٹھا ہوا ناکامی کا ڈر ختم کرتا ہے۔ مغرب والوں نے Visualization کی ٹریننگ کے مختلف طریقے بتائے ہیں جس میں آج کل مشہور طریقہ اوتار (Avatar) کہلاتا ہے۔ اوتار ہندی کا لفظ ہے جو ہندو دیوتاؤں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً رام چندر جی ان کے نزدیک اوتار تھے۔ مہاراج کرشن بھی ان کے اوتار تھے۔ ہندوؤں کے نظریے کے مطابق خدا انسان کی شکل میں زمین پر آیا تھا۔ اوتار کا طریقہ دراصل انڈین یوگا کے سسٹم سے لیا گیا ہے۔ یوگا ہندی تصوف میں ایک نہایت اہم ذریعہ ہے۔ اسی سے مکتی یا نروان ملتا ہے۔ اوشو نے کنڈلانی یوگا کا تصور پیش کیا جس میں ریڑھ کی ہڈی (Spinal card) کو انرجی کا ماخذ قرار دیا گیا ہے کہ اگر آپ دھیان (Meditation) کے ذریعے اپنی کنڈلانی انرجی کو مہرہ بہ مہرہ اونچا لیتے جائیں کیونکہ عام لوگوں کی انرجی کنڈلانی میں یعنی (Spinal cord) کے آخری مہروں میں ہوتی ہے جو جنسی اختلاف کی قوت بن کر خارج ہو جاتی ہے۔ اگر اسی انرجی کو مسلسل ارتکاز کے ذریعے بلند کر کے مہرے یعنی گردن اور دماغ تک لایا جائے تو انسانی ذہن میں قوت کا ایک دھماکا ہوگا اور انسان کے ذہن کو ایسی نایاب توانائی ملے گی جس سے آگاہی، شعور اور نروان حاصل ہوگا۔ مکتی اور شانتی ملے گی۔ اس کا اصول یہ ہے کہ کوئی مراقبہ کرتے وقت یا مرکوز کرنے یا Concentration کے بعد آپ کے شعور اور لاشعور کے درمیان پردہ اٹھ جاتا ہے۔ آپ کا لاشعور ایک چھوٹے بچے کی طرح آپ جو بھی دکھائیں، اس پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ چند بار اس طرح کرنے سے وہ ماننے لگ جاتا ہے۔ روحانیت میں بھی کامیابی سے آپ کو یہی ڈر روکتا ہے۔ مراقبے میں تصورات کی مشقیں اس لیے کروائی جاتی ہیں۔ کبھی آپ پانی کا تصور کرتے ہیں۔ کبھی نور کا اور کبھی اللہ کا اور یہ حقیقت ہے کہ آپ کا لاشعور بالکل ایک معصوم بچے کی طرح ہے۔ جو چیز بھی تواتر سے کی جائے، مان لیتا ہے اور پھر اس تک پہنچنے کے راستے خود ہی ڈھونڈ لیتا ہے۔ اس کی طاقت بے انتہا ہے۔ منزل تک پہنچنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ پیدا (Create) کر لیتا ہے۔

اسلام کی روحانیت میں مختلف مراقبات میں ایسی مشقیں کرائی جاتی ہیں جیسے تصور شیخ، تصور رسول اور پھر تصور اللہ۔ اپنی کامیابی میں ہماری مثبت اور منفی سوچ کا بھی بڑا رول ہے۔ کوئی شخص جب کسی چیز سے ڈر کر منفی سوچے گا تو اس کے فوری منفی نتائج سامنے آئیں گے اور اگر مثبت سوچے گا تو اچھے نتائج فوراً سامنے آئیں گے۔ ہم پاکستانی وسائل کے خزانے پر بیٹھے ہوئے ہیں

اور پریشان ہو رہے ہیں۔ اپنے نیچے خزانوں کو تلاش نہیں کرتے۔ اس کا استعمال نہیں کرتے۔ دوسروں سے معاشی بھیک مانگتے، دنیا بھر میں ذلیل ہو رہے ہیں۔

خوف کا بزدلی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ مائیں بچپن سے ہی ڈرا ڈرا کر بچوں کو بزدل بنا دیتی ہیں۔ پھر وہ ساری زندگی بزدلی میں گزار دیتے ہیں۔ ان میں رسک یعنی خطرہ لینے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ عملی قدم (Initiative) ہی نہیں اٹھاتے یعنی رسک نہیں لیتے، لہٰذا کامیاب نہیں ہوتے۔ (No Risk no gain) مستقبل سے خوفزدہ لوگ بہت سی پناہ گاہیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ حقیقت کا سامنا نہیں کرتے۔ فراریت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ (Escapism) حقیقت سے خوفزدہ ہو کر کسی اور مصنوعی پناہ میں چھپ جانے کا نام ہے۔ یہ لاشعوری عمل سے لوگ زندگی سے فرار حاصل کرتے ہیں۔ سچ یا حقیقت کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ شراب، نشہ، شاعری، خواب و خیال کی دنیا (Dream world) جنس پرستی (Sexuality) حتیٰ کہ بیماری میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

انسان میں ڈر اور خوف کی ایک عجیب قسم ہے جس کا بہت سے لوگوں کو احساس نہیں ہوتا اور وہ یہ ہے کہ لوگ اکیلے بیٹھنے اور سوچنے سے ڈرتے ہیں۔ خوفزدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر آدمی کسی نہ کسی کی کمپنی (ساتھی) کی تلاش میں رہتا ہے کیونکہ اگر وہ اکیلا بیٹھتا ہے تو سوچیں اس پر حملہ کر دیتی ہیں۔ ہر قسم کے ادھورے چھوڑے ہوئے کام اور غیر یقینی اس کے ذہن میں آ جاتی ہے۔ مستقبل کا ڈر، بچوں کے مستقبل کا ڈر، اپنی کرتوتوں (wrong doings) کی سزا کا خوف یعنی سیکڑوں قسم کے خوف ہوتے ہیں۔ اس لیے آدمی ہر وقت مصروف رہنا چاہتا ہے۔ کچھ لوگوں کے دل و دماغ اور لاشعور میں کچھ خوف ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خوف سے بچنے کے لیے حقیقت کی دنیا سے راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں اور موسیقی اور Youtube میں پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ اپنے اندر کی تنہائی اور نامعلوم کا خوف چھپانے کے لیے ہر وقت موسیقی کے سُروں میں گم رہتے ہیں۔ Youtube پر ان کے پہلے سے گائے ہوئے گانے جب نشر ہوتے ہیں تو وہ اپنے انڈر گراؤنڈ کمرے سے نکل کر گلوبل شہری بن جاتے ہیں۔ جب خواتین ان کی ریٹنگ کرتی ہیں اور ان کے گانوں کے (Viewers) کی تعداد بڑھتی ہے تو انہیں خوشی اور طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنی کامیابی کو اپنی حد تک محدود نہیں رکھتا۔ دوستوں کو فخر سے بتاتا ہے۔ ایسے لوگ آہستہ آہستہ حقیقت سے رشتہ توڑ کر اپنی تخلیق کردہ دنیا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ باہر کی تلخ حقیقت اندر کی طرف

جذب کرتی ہے اور وہ اپنے آپ کو orchastrise کر کے کمپیوٹر اور یوٹیوب کی خود تخلیق کردہ مصنوعی دنیا (Mitrex) میں داخل ہو جاتے ہیں جو مصنوعی اور غیر حقیقی ہے۔''

رابعہ نے اچانک پوچھا ''Lunatie کیا ہوتا ہے؟''

پروفیسر ولاور نے تحمل سے جواب دیا: ''یہ لفظ تو Lunar سے نکلا ہے جس کے معانی چاند (Moon) ہیں۔ Lunatie یہ ایک ذہنی بیماری (Madness) ہے جس میں انسان چاند کے سحر میں کھو جاتا ہے اور حقیقت سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ رابعہ بیٹا حقیقت پسندی (Realism) زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ ذہن انسانی تلخ حقیقتوں یا زمینی تلخیوں سے فرار حاصل کر کے تصورات کی دنیا (Fantasies) میں رہنا شروع کر دیتا ہے۔

ہر راہ حق اور وجود ذات کو تلاش کرنے والا اپنی سوچوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ سوچ پر قابو پانے سے پہلے سوچ کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کا طریقہ جو جاپان میں استعمال کیا جاتا ہے وہ خاصا دلچسپ ہے۔ اس میں آپ نے خاموش بیٹھنا ہے۔ آپ کا جسم بالکل Relax ہونا چاہیے۔ آپ اپنی سوچ کو کھلا چھوڑ دیں۔ اس کو بالکل کنٹرول نہ کریں۔ صرف یہ دیکھیں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ طرح طرح کی سوچیں آئیں گی۔ آپ ان کو بالکل کنٹرول نہ کریں۔ پھر ہر روز ایک دو منٹ بڑھتے ہوئے 30 منٹ تک لے جائیں۔ آپ نے سوچوں کو محسوس کرنا ہے۔ ان کو روکنا یا کنٹرول کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ اصول یاد رکھیں، جس بھی سوچ کو آپ روکتے ہیں، وہ شدت سے واپس آتی ہے۔ زیادہ طاقت سے واپس آتی ہے۔ جب آپ سوچ کو مداخلت (Resist) کر رہے ہوتے ہیں تو آپ اس کو طاقت دے رہے ہوتے ہیں اور وہ آپ کے ذہن میں گہری اتر جاتی ہے۔ جب آپ کسی سوچ میں مداخلت نہیں کرتے تو پھر وہ سوچ آگے چلی جاتی ہے۔ دوسری سوچ آجاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ آہستہ آہستہ سوچیں کم ہوتی چلی جائیں گی اور کچھ عرصے بعد یہ غائب ہو جائیں گی۔ اس وقت آپ اپنے دماغ پر حاوی ہو چکے ہوں گے۔

یہ بدھ روحانیت کے (Zen) اسکول یا نظریہ کا مشہور اور کامیاب مراقبہ ہے۔ اسلام کی روحانیت میں تسبیح بھی کروائی جاتی ہے۔ پھر نہ آپ کو اکیلے بیٹھنے سے ڈر لگے گا اور حالات کیسے بھی ہوں، آپ پریشان نہیں ہوں گے۔ کم سوچوں کا ہونا صحت مند ذہن کی علامت ہے۔ سوچوں کو نہ سمجھنے والے ڈپریشن (Depression) اعصابی تناؤ اور بے شمار قسم کی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اوشو نے بھی اپنی مشہور کتاب "Kundaline yoga" میں مراقبے کی پراسراریت (mystery of meditation) میں مراقبے کے سارے مراحل اور تجربات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اسی کی ایک اور کتاب "The Psychology of the esotrik games" خواب کی نفسیات (Becoming and being اور Fallacy of Knowledge) کا ذکر کیا ہے۔ اگر تفصیل میں جاؤں تو گفتگو بہت ہی طویل ہو جائے گی۔ کتاب دانش میں اشو کہتا ہے کہ حقیقی لمحہ تو موجود ہے۔ مستقبل تو ایک اندیشہ ہے۔ ماضی تو ایک یاد ہے۔ لمحہ موجود ایک حقیقت ہے۔ اس لیے لمحہ موجود میں رہو۔ ہمیں ماضی کے بوجھ اور مستقبل کے اندیشے سے چھٹکارا پانا ہوگا۔"

رابعہ نے سوچتے ہوئے پوچھا: ''انکل یہ جمالیات (Aesthetic) کیا ہے اور جدلیات (Dialectic) کیا ہے؟''

''رابعہ بیٹا گفتگو پہلے ہی طویل ہو چکی ہے۔''

ساجد صاحب بولے" دراصل دو دن بعد ہم نے واپس جانا ہے۔ میں نے زندگی بھر اتنا کچھ نہیں سیکھا جتنا ان تین نشستوں میں سیکھا ہے۔ میرے اندر علم کی پیاس جاگ اٹھی ہے۔ کچھ بتائیے جو رابعہ بیٹی نے پوچھا ہے۔''

پروفیسر دلاور نے اور کپ کافی کا منگواتے ہوئے کہا:

رابعہ بڑے غور سے سن رہی تھی جبکہ ندیم بھی ہمہ تن گوش تھا۔

''یاد رکھنے والی بنیادی بات یہ ہے کہ زندگی Dialectical ہے۔ یہ Duality کے وسیلے سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ یہ دو مخالفوں کا آہنگ ہے۔ آپ ہمیشہ خوش نہیں رہ سکتے ورنہ خوشی معنویت کھو بیٹھے گی۔ تم ہمیشہ صلح کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ جنگ کی حالت بھی آئے گی، جھگڑا بھی ہوگا۔ ہر خوشی کے بعد غم ضرور آتا ہے۔ ہر سکھ کا اپنا ایک دکھ ہوتا ہے اور ہر دکھ کا اپنا ایک سکھ ہوتا ہے۔ ہستی کے فریب میں مت رہو اگر اس Dialectic کو نہیں سمجھتے تو ساری عمر اذیت میں رہو گے۔ زندگی کو قبول کرو اس کی ساری اذیتوں اور مسرتوں کے ساتھ۔ ناممکن کی آرزو مت کرو۔ یہ خواہش مت کرو کہ صرف اور صرف خوشی ہو، درد اور اذیت نہ ہو۔

خوشی اکیلی وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ اسے تضاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا موت سے عاری زندگی کا تصور تو کریں۔ زندگی ایک ناقابل برداشت وجود ثابت ہوگی۔ چونکہ آنے والے

کل میں موت ہے۔اس لیے ہمیں "اب" اور "یہاں" میں جینا ہوتا ہے۔انسان کے پرسکون رہنے کے لیے ضروری ہے کہ جب غم آئے تو اسے بھی خوش آمدید کہے اور اگر خوشی آئے تو اسے بھی خوش آمدید کہے کیونکہ یہ ایک ہی کھیل کے دو ساتھی ہیں۔

اور رابعہ بینا جہاں تک جمالیات (Aesthetic) کی بات ہے تو انسان فطرتاً جمال پرست ہے۔حسن پرست ہے۔دنیا کا حسن وصناعی، انسانوں کا حسن اور شباب اس کی جبلت میں شامل ہیں کیونکہ انسان کی ذات میں اللہ نے اپنی صفات رکھی ہیں۔اس لیے وہ اللہ کا ہی پرتو ہے۔اللہ خود بھی جمیل ہے۔جمال رکھتا ہے۔اس لیے انسان کے اندر بھی جمالیات کی قدرتی چپ موجود ہے۔خدا نے ایک مکمل اور خوبصورت کائنات بنائی ہے۔آسمان پر ستارے کتنی خوبصورتی سے سجائے۔چاند اور اس کی چاندنی ہمیں مسحور کر دیتی ہے۔یہ حسین وادیاں، یہ سمندر، یہ رنگ برنگی مچھلیاں، یہ درخت، پھول اور پھل خوبصورتی سے بنائے ہیں۔بعض قدرتی مناظر دیکھ کر صناعی قدرت کی تعریف بے اختیار منہ سے نکل جاتی ہے۔انسان کو بھی احسن تقویم بنایا ہے۔مکمل اور حسین تر۔مردوں میں مردانہ وجاہت رکھی ہے تو عورتوں میں نسوانی حسن، لہٰذا مرد جبلتی طور پہ جمالیاتی اور حسن پرست ہے۔وہ ہر حسین چیز سے پیار کرتا ہے۔یونانیوں نے اپنے دیوتا بھی خوبصورت بنائے۔حسن کا دیوتا (Vience)، عشق کا دیوتا (Cupid) اور زندگی بخشنے والا دیوتا اپالو (Apolo) خوبصورت نام ہیں۔اسی طرح انسان نے حسن پرستی کے جذبے کے زیر اثر خوبصورت عمارتیں بنائیں۔تاج محل بنوایا۔خوبصورت بت تراشے اور مجسمے بنائے۔حسین عورتوں کو خدا نے حسن و جمال بخشا اور انسان نے حسن پرستی کی جبلت سے مرغوب ہو کر عورت سے عشق کیا۔ہندوؤں نے دیویاں بنا کر ان کی پوجا کی۔جب خدا نے کائنات کی سب سے بڑی (Mystry) عورت تخلیق کی، ایک یونانی دیوتا کے بقول: عورت کو تخلیق کرتے ہوئے گلاب کے پھول سے خوشبو لی۔کلیوں کی تازگی لی، تتلیوں کے رنگ اکٹھے کیے۔چاند کی ٹھنڈک لی، سورج کی تمازت لی اور کمان لی۔آبشاروں کا ترنم لیا۔جھرنوں کی مدھر دھنیں چرائیں۔شیرنی سے جرأت لی۔لومڑی سے مکاری لی۔اونٹ سے کینہ لیا۔شیرنی سے لالچ لیا، عقاب سے پھرتی لی، سانپ سے زہر لیا۔شہد کی مکھیوں سے مٹھاس لی۔دریاؤں سے روانی لی۔صحراؤں سے وسعت لی، سمندر سے گہرائی لی۔خود دیوتا نے اپنی محبت اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دی۔پھر ان سب چیزوں کو اکٹھا کیا اور اپنی مہارت سے ایک خوبصورت عورت تراش لی۔جب اس نے عورت کے بت میں روح

ڈالی تو خود حیران رہ گیا۔ اس نے پریشانی سے دیکھا کہ یہ کیا چیز بن گئی ہے اور آج تک وہ دیوتا پریشان ہے اور سمجھ نہیں پارہا کہ یہ کیا چیز بن گئی ہے۔ نہ وہ سمجھ پارہا ہے، نہ ہی جس کے لیے بنائی گئی وہ سمجھ پارہا ہے کہ عورت کیا ہے۔

اوشو کہتا ہے، آپ ایک مرد ہو کر نسوانی نفسیات کے بارے میں کیسے بات کر سکتے ہیں "How can you, as a man talk about the female psychic." وہ کہتا ہے کہ میں نہ مرد بن کر بات کر رہا ہوں نہ عورت بن کر بلکہ آگاہی، شعور (Awareness) بن کر بات کر رہا ہوں اور شعور نہ He ہے نہ She ہے۔ نہ مرد ہے نہ عورت ہے کیونکہ ہمارے جسم میں تقسیم ہے۔ ہمارا ذہن ہمارے جسم کا اندرونی حصہ ہے اور ہمارا جسم ہمارے ذہن کا بیرونی حصہ ہے لیکن ہم ایک اکائی ہیں۔ ہمارا ذہن ایک جسم ایک ہیں۔ اس لیے باڈی مائنڈ کے ساتھ Masculime ہے۔ مردانہ ہے یا نسوانی Feminine ہے لیکن آپ کا اصل وجود شعور ہے، آگاہی ہے۔

عورت کے بارے میں پہلی آگاہی یہ ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اسے سمجھا نہ جائے۔

عورت ایک پہیلی ایک (Jigsaw Puzzle) ہے۔ یہ بھی زندگی کی طرح ایسی ہی پہیلی ہے، بھول بھلیاں ہے۔ آپ اس سے جی سکتے ہیں۔ آپ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن سمجھنے کی کوشش ہی بیکار ہے۔ آپ اسے کبھی سمجھ ہی نہیں سکتے۔

عورت آغاز میں آگے بڑھنے کو روکتی ہے۔ وہ انجام میں واپس نہیں جانے دیتی اور مرد آغاز میں پیچھا کرتا ہے۔ اگر آپ کسی عورت کے ذہن کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو واحد راستہ یہ ہے کہ اس سے متفق ہو جائیں۔ اگر آپ واقعی جاننا چاہتے ہیں کہ عورت کا کیا مطلب ہے تو اسے دیکھتے رہیں۔ اس کی بات نہ سنیں۔

ایک عورت نے ایک سپاہی سے شکایت کی کہ وہ آدمی کونے میں کھڑا ہے، مجھے گھور رہا ہے اور بڑی پریشانی ہے۔

سپاہی نے کہا، میری نظر مسلسل اس مرد پر ہے، اس نے تو آپ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

عورت نے کہا ''یہی بات تو مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

وہ عورتیں جو دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ انتظامی امور چلاتی ہیں۔ سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔ وزرائے اعظم اور صدر بن جاتی ہیں، بہت ذہین بہت لائق، مرد سے کہیں آگے، دانش اور راہنمائی کا پیکر بن کر مردوں کی راہنمائی کرتی ہیں۔ وہ مارگریٹ تھیچر، بن گوریاں، اندرا

گاندھی، بینظیر بھٹو بنتی ہیں۔ مردوں کو اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے حیران کر دیتی ہیں۔ اگر چہ انھوں نے شادیاں کیں، بچے پیدا کیے جو جسمانی افعال ہیں۔ بنیادی جبلتیں ہیں لیکن ان کے اندر کی نسوانیت (Femenity) کمزور پڑ جاتی ہیں۔ دل محبت سے محروم ہونے لگ جاتا ہے جو کہ بنیادی نسوانی صفت ہے۔ وہ اچھی بیوی، مثالی ماں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کے اندر ایک مرد جنم لے لیتا ہے۔ ان کی نفسیات (Psyche) کے اندر دور کہیں چھپا ہوا، لاشعوری طور پر غیر محسوس طریقے سے ان کی Femaliality میں Mascnliaity کا عنصر شامل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی اصل فطرت اور جبلت کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا، خدا نے کبھی کسی عورت کو پیغمبر کیوں نہیں بنایا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ خدا نے ایسا کیوں کیا کیونکہ خدا ہی اس کا خالق ہے اور اس کی اعضائے ترکیبی سے واقف ہے۔ بات جمالیات کی ہو رہی تھی۔ جمالیات کی کوئی بات عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ حکیم امت اقبال نے کہا:

"وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ"

اگر چہ دنیا کے آدھے سے زیادہ مسائل لالچ، رشوت، قتل، انتقام اور خاندانوں کی تباہی کے پیچھے بری عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور عورت مرد کے لیے مسائل کا انبار ہے لیکن پھر بھی عورت کائنات کا حسن ہے، مرد کی کمزوری ہے۔ اس کے وجود سے حیات میں رنگ و نور ہے۔ اس کی جاذبیت ہمیں کھینچتی ہے۔ ہم اس کو متاثر کرنے اسے حاصل کرنے، اسے منانے میں عمر گزار دیتے ہیں۔ بس اسی چکر میں پڑے رہتے ہیں، عورت کے خوبصورت جال میں اپنی رضا سے داخل ہوتے ہیں۔ یہ ہماری شام کو خوبصورت بناتی ہے۔ یہ ہماری رات کو رنگین بناتی ہے۔ یہ ہماری صبح کو روشن کرتی ہے۔ یہ خوبصورت خیال بن کر دل میں رہتی ہے۔ یہ شاعروں کی غزل ہے۔ مجسمہ سازوں کا تصور ہے۔ مصوروں کا تخلیقی اثاثہ ہے۔ یہ ہمارے دماغ میں ہے، دل میں ہے، روح میں ہے۔"

پروفیسر زبیر بولے "دلاور صاحب! آپ جیسے جیسے ہمیں چیزوں کی حقیقت اور انسان کی پراسراریت بیان کر رہے ہیں اتنا ہی ہمارا تجسس بڑھتا جا رہا ہے۔ پراسرار باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ مختصراً بتائیے کہ Occult کیا ہے؟"

پروفیسر دلاور نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "بڑا پیچیدہ سوال ہے۔ مختصر بیان کرتا ہوں۔

Occult لفظوں معنوں میں چھپا ہوا جو مشاہدے میں نہ آ سکے۔ جو ابھی دریافت (Discover) نہ ہوا ہو۔ قدرتی علم سے بلند تر ہو۔ نہ نظر آنے والی قوتیں ہمارے ذہن کی تہہ کی

دنیا۔اس کائنات میں بڑی پر اسراریت ہے۔انسان غیب کے حالات اور مستقبل میں ہونے والے واقعات کے جاننے کا ہر دور میں خواہاں رہا ہے۔ برے حالات سے بچنا بھی اس کی جبلی خواہش ہے۔انسان کے تجسس کا آغاز کیسے ہوا؟ کئی ہزار سال پہلے قدیم مصریوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے؟ جب انہوں نے دیکھا کہ ہر سال بہار میں پھول کھلتے ہیں، پھر جھڑ جاتے ہیں اور اگلے سال بہار میں دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں تو انہیں خیال آیا کہ شاید حیات لافانی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے سوچنا، پوچھنا اور ڈھونڈنا شروع کر دیا۔یہیں سے Occult کی ابتدا ہوئی۔غلام جیلانی برق نے اپنی کتاب ''من کی دنیا'' میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور بے شمار مغربی مفکروں کی تعلیمات اور کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

کہتے ہیں مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔یورپ میں دو عالمگیر جنگوں نے جو تباہی مچائی اور قدرتی آفات سے جو تباہی ہوئی اس نے وہاں کے بیدار ذہنوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ بے شمار کتابیں منظر عام پر آ گئیں۔روحانیت میں لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی۔ کچھ نے ایک نئی دنیا (Etheril World) دریافت کی۔جسم لطیف کا انکشاف ہوا کہ ہمارے اس جسم خاکی کے اندر ایک اور جسم داخل ہے جو آبی بخارات سے زیادہ لطیف ہے۔حقیقی انسان وہی ہے۔ یہ جسم تو خاکی ہے، فانی ہے اور وہ غیر فانی۔ جب ہم سو جاتے ہیں تو یہ جسم لطیف خاکی جسم سے نکل کر اِدھر اُدھر گھومنے چلا جاتا ہے۔یہ دونوں جسم لطیف بندھن میں بندھے ہوتے ہیں اور جب کسی حادثے یا بیماری سے یہ بندھن کٹ جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے ورنہ نیند کے بعد جسم لطیف جسم خاکی میں واپس آ جاتا ہے۔اس حقیقت کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے:

ترجمہ: ''اللہ وہ ہے جو دو طرح روحوں کو قبض کرتا ہے۔موت کے وقت اور نیند میں۔ وہ مرنے والوں کی روحوں کو اپنے ہاں روک لیتا ہے لیکن باقی ارواح کو ایک خاص میعاد کے لیے ان کے اجسام میں دوبارہ بھیج دیتا ہے۔اس حقیقت میں اہل فکر کے لیے کچھ اسباق ہیں۔'' (الزمر:42)

اسی روح کو جسم لطیف یا آسٹرل باڈی کہتے ہیں۔ یہ مستقل اور غیر فانی ہے اور جسم خاکی اس کی عارضی قیام گاہ ہے۔ پادری لیڈ بیٹر لکھتا ہے:

You are not your body. you inhalit your body. Bodies are mere shells which we cast aside like a suit of clothing. (invisible helpless)

ترجمہ: ''تم جسم نہیں ہو۔ یہ جسم تمہاری قیام گاہ ہے۔ اجسام محض خول ہیں جنہیں ہم موت کے وقت پرے پھینک دیتے ہیں جس طرح کہ کپڑے اتار دیئے جائیں۔''

ڈاکٹر الیکزز کا قول ہے:

Man over flows and is greater than the orgainsin which he inhalits."

ترجمہ: ''انسان اپنے جسم سے عظیم تر ایک چیز ہے اور اس کا وجود پیمانہ خاکی سے باہر چھلک رہا ہے۔''

رابعہ نے تجسس سے پوچھا ''یہ آورا کیا چیز ہے؟''

پروفیسر دلاور نے رابعہ کو پیاری نظروں سے دیکھا جیسے اس کی عمل کی جستجو کی داد دے رہے ہوں۔ ندیم بھی رابعہ کے علم سے حیران تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ رابعہ عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ علم کا خزانہ ہے۔ اس کی ذہنی استعداد (Intellectual depth) اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پروفیسر صاحب بولے:

''مغربی صوفیوں کا خیال ہے کہ انسان کے جسم سے مختلف رنگ کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ یہ شعاعیں ہر آدمی خارج کرتا ہے۔ چاہے نیک ہو یا بدکار۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیک و بد شعاعوں کا رنگ حسب کردار مختلف ہوتا ہے۔ موت سے پہلے یہ آورا سیاہ ہو جاتا ہے۔ ہر انسان اپنے اعمال کے مطابق ایک ماحول یا (Atmosphere) اپنے اردگرد بنالیتا ہے۔ بدکردار کا ماحول دیوار کی طرح سخت ہوتا ہے جس سے نہ کوئی فریاد یا دعا باہر جاسکتی ہے اور نہ کاسمک ورلڈ کے عمدہ اثرات باہر آسکتے ہیں۔ ایسا آدمی خفیہ طاقتوں کی امداد سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے قرآن حکیم کے حجاب عشاوہ (پردہ، دیوار) سے مراد یہی ہو۔ ڈاکٹر کرنگٹن کہتا ہے:

"Aura is an invisible magnatic radiation from the human body which either attracts or repels."

ترجمہ: ''اورہ وہ غیر مرئی مقناطیسی روشنی ہے جو انسانی جسم سے خارج ہوتی ہے۔ یہ یا تو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے یا اور پرے دھکیل دیتی ہے۔''

کاسمک ورلڈ سے مراد ایتھر یا اثر ہے۔ روحیں اسی دنیا سے آئی اور واپس جاتی ہیں۔ اس کے تین طبقے بتائے جاتے ہیں۔ نچلے طبقے میں گنہگار اپنے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں۔

دوسرے طبقے میں اچھے لوگ آباد ہیں۔ تیسرے طبقے میں بلند مرتبہ فلاسفہ، اولیا اور انبیا رہتے ہیں۔ جیلانی برق نے فلسفہ دعا و عبادات کو سلیس انداز میں بیان کیا ہے۔ ماہرین روحانیت کے ہاں ہر لفظ یا حرف کا ایک خاص رنگ اور اس میں ایک خاص طاقت ہوتی ہے۔ غیب بینوں (Clairvoyants) نے حروف کو لکھ کر تیسری آنکھ (The third eye) سے دیکھا تو نہیں الف کا رنگ سرخ، ب کا نیلا، د کا سبز اور س کا زرد رنگ نظر آیا۔ پھر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا تو بعض الفاظ کے پڑھنے سے بیماریاں جاتی رہیں۔ بعض سے بچھو کے ڈنگ کی تکلیف دور ہوگئی۔

اولیاءاللہ و انبیا کی روحانی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے کلمات میں حیرت انگیز طاقت پائی جاتی ہے۔ اتنی طاقت کہ ایک صاحب دل ان سے خطرناک امراض اور آلام و مصائب سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ آسمانوں میں خدائے ذوالجلال کے بعد سب سے بڑی طاقت حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ وحی خدا کا کلام ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے رسول خداؐ تک پہنچا۔ اسی لیے الہامی صحیفوں کا ہر لفظ قوت کا ایک خزانہ ہوتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ الہامی الفاظ (Highly energisad) ہوتے ہیں۔ تعویذ کی طاقت کا راز بھی یہی ہے۔

پروفیسر لیڈ بیٹر لکھتا ہے:

"A talisman or an amulet strongly charged with magnetsia for a particual purpose by some one who possesses strong magnetic power may be of trumendous help."

ایک تعویذ یا ٹونکہ جس میں کوئی زبردست مقناطیسی شخصیت کسی خاص مقصد کے لیے مقناطیسی طاقت بھر دے، بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

پادری لیڈ بیٹر ایک مشہور یورپی صوفیا تھے۔ وہ اپنی کتاب "The master and the path" میں لکھتے ہیں:

''ہر لفظ ایتھر میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً لفظ ''نفرت'' اس قدر بھیانک صورت میں بدل جاتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے یہ صورت دیکھ لی اور اس کے بعد مجھے یہ لفظ استعمال کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔''

الہامی الفاظ اور اسمائے ربی میں اتنی طاقت ہے کہ ان کے ورد (تکرار) سے بیمار، پریشانیاں اور بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ مسلمان خوش قسمت ہیں اور یہ اللہ کا خاص انعام ہے کہ ان

کے پاس اللہ کے ننانوے صفاتی (اللہ کی صفت بیان کرنے والے) ہیں جنہیں حسب حاجت پکارا جا سکتا ہے۔ یہ سہولت دیگر مذاہب میں موجود نہیں۔

ہر لفظ ایک یونٹ یا ایٹم ہے جیسے اندرونی جذبات کی برقی قوتیں ہیں اور اس کے اثرات اس عالم خاکی اور عالم لطیف (آسٹرل ورلڈ) دونوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس کی مثال گالی ہے جو محض الفاظ ہیں لیکن منہ سے نکلتے ہی مخاطب کے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے۔ یہ آگ کہاں سے آتی ہے۔ الفاظ کے اس مجموعے سے۔

فلسفہ عبادات میں سب سے اہم چیز (کاسمک وائبریشنز یا امواج اثیر۔ ایتھر ایک انتہائی حساس چیز ہے۔ جب ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد نیازمندی اور انکساری میں ڈوب کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو ہمارے اندرونی جذبات کی قوت (ایموشنل انرجی) کاسمک ورلڈ میں زبردست لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ جب یہ لہریں فیض پہنچانے والی زبردست طاقتوں سے ٹکراتی ہیں تو انہیں بے چین کر دیتی ہیں۔ وہ یا تو خود ہماری مدد کو دوڑتی ہیں اور راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹاتی ہیں اور یا خیال کی کوئی لہر وہاں سے چھوڑتی ہیں جو ہمارے دماغ سے ٹکرا کر ایک ایسی تجویز (Idea or proposal) کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جس پر عمل پیرا ہونے سے ہماری تکلیف دور ہو جاتی ہے۔

بعض امراض و مصائب ہمارے گناہوں اور بدکاریوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جس سے چھٹکارا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم گناہ اور بدکاری کو چھوڑ دیں۔ اس کے بعد مخفی قوتوں کو آواز دیں۔ یہ طاقتیں اللہ کی مرضی کے بغیر حرکت میں نہیں آتیں۔ گناہ اللہ سے بغاوت ہے اور ایک باغی کو جب تک وہ باغی ہے، اللہ سے رحم کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

دعا کے بارے میں یورپی صوفیوں کے اقوال یہ ہیں:

دعا کیا ہے، کاسمک ورلڈ میں خزانوں کے منہ کھول دینا۔

''یہ ایک زبردست ذہنی اور جذباتی جدوجہد ہے۔ یہ دنیا میں ایک نظام کے تحت چل رہی ہے۔ ہر کوشش کا کوئی نہ کوئی صلہ ہوتا ہے۔ یہاں نتائج اعمال کے ساتھ یوں بندھے ہوئے ہیں کہ انہیں جدا کرنا ممکن نہیں۔''

گداز میں ڈوبی ہوئی ہر آواز کا جواب فوراً آتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو لوگ کائنات کو مردہ تصور کرنے لگیں۔ دعا اور قبولیت ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ قبولیت اسی طرح دعا کا دوسرا رخ ہے

جس طرح نتیجہ سبب کا۔

R.W.Terina کا قول ہے:

''ہر خیال ایک لہر ہے جو دماغ سے نکلنے کے بعد موزوں صلہ لے کر واپس آتی ہے۔

قبولیت دعا کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

(1) اگر تکلیف گناہ کا نتیجہ ہو تو اعتراف گناہ اور توبہ۔

(2) نیاز مندی، گداز، عجز اور اضطراب کہ انہی پروں پر پرواز کر کے دعا عالم بالا کی مسافتیں طے کرتی ہے۔

اللہ نے قرآن مجید میں اسی دعا کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے جس کے ساتھ اضطراب ہو۔

ترجمہ: ''(ہمارے سوا) وہ کون ہے جو بے قرار کی پکار کا جواب دے۔'' (نمل:62)

یہ کسی دانا کا قول ہے بلکہ کائنات کو مسخر کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کے سامنے جھک جاؤ اور ان کے ہر اشارے کی تعمیل کرو۔ (By yilding to nature to conquer)

خیالات کا انسانی جسم پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ تسکین کے چند کلمات کے بعد مریض بول اٹھتا ہے:

''آپ کے آنے سے میری تکلیف کم ہو گئی ہے۔''

الفاظ خیالات کی تصویریں ہیں اور خیالات وہ لہریں ہیں جو دماغ سے اٹھتی ہیں۔ ان لہروں کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو خوف، ناامید، بے ہمتی، غصہ، حسد، جلن، انتقام، بے چینی اور سراسیمگی پیدا کرتی ہے۔

دوسری وہ جن سے محبت، رحم، فیاضی، سخاوت، شجاعت، نیکی اور تقویٰ کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

غصہ ایک زہر ہے۔ سٹیر آر، ڈبلیو ٹرائن نے ایک واقعہ درج کیا ہے۔ کسی عورت کو کسی بات پر اتنا شدید غصہ آیا کہ اس کے دودھ میں زہر بھر گیا اور اس کا دودھ پیتا بچہ مر گیا۔

ایک امریکی ڈاکٹر کا نظریہ ہے کہ بیماری پہلے جسم لطیف کو لگتی ہے اور پھر جسم خاکی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ خیر و شر کے اثرات سے پوری طرح واقف تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بیماری گناہ کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مریض سے یہ سوال کرتے Do you believe in me

''کیا تم مجھے اور میرے پیغام کو جانتے ہو؟''

Go and sin no more. "جاؤ اور آئندہ گناہ سے بچو۔"

قرآن حکیم میں ہے:

ترجمہ: "وہ ایمان والے جو ایمان میں گناہ کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ وہ امن و سکون اور ہدایت کی نعمت سے بہرہ ور ہوں گے۔" (سورۂ انعام:82)

گیتا میں لکھا ہے:

"جو شخص حواس اور عقل کو ضبط میں لانے کے بعد حواس کو ترک کر دیتا ہے، وہ تمام دکھوں سے رہائی پالیتا ہے۔"

مہاتما بدھ کا ارشاد ہے:

"تندرستی نیکی کا نام ہے۔ جب لالچ، نفرت اور فریب کی آگ بجھ جاتی ہے تو مکمل چین اور سکون مل جاتا ہے۔" (بدھ مت)

قدرت کا ایک اٹل اصول ہے کہ جب ہم کسی دکھیا کی مدد کرتے ہیں تو اس کے دل سے ایسی دعا نکلتی ہے جس میں ایموشنل انرجی (Emotional Energy) ہوتی ہے جو ہر دل میں رحم کرنے والے کے متعلق جذبات رحم و محبت بھر دیتی ہے۔

ٹرائن لکھتا ہے:

Give the world the best you have and best will come back to you."

کسی نے کہا ہے:

Those who live by hate die by hate and those who live by sord die by sord.

جو لوگ زندگی کی بنیاد نفرت سے رکھتے ہیں، وہ نفرت ہی سے ہلاک ہوتے ہیں۔ اسی طرح تلوار کے زور پر زندگی بسر کرنے والے تلوار ہی سے مرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے:

Do good to those who hate you.

"جو لوگ تم سے نفرت کرتے ہیں، ان سے بھلا کرو۔"

ہمیں قول، الفاظ اور اعمال میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

ترجمہ: "جب آدمی کی زبان سے کوئی بات نکلتی ہے تو ایک چوکس نگران اسے لکھ لیتا ہے۔ یہی ہمارا نامہ اعمال ہوگا۔"

انسان مختلف درجات طے کر کے ہی بلندی اور روحانیت کے درجات حاصل کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

ترجمہ: "اس شفق کی قسم جو طلوع آفتاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور رات اور اس کے فراہم کردہ نظاروں کی قسم، اس چاندکی جو بدر منیر بن جاتا ہے کہ تم بلندی کے مختلف طبقات طے کر کے ہی اوپر پہنچو گے۔"

پروفیسر زبیر جو ہر بات بڑی توجہ سے سن رہے تھے، انہوں نے ایک مشکل سوال کر ڈالا۔ "دلاور صاحب آپ کی روح پرور گفتگو سے میں بہت متاثر ہوا ہوں لیکن عرصہ دراز سے ایک سوال کا جواب ڈھونڈ رہا ہوں کہ لوح وقلم کیا ہے؟"

پروفیسر دلاور نے سوچتے ہوئے کہا "زبیر صاحب لوح وقلم کے بارے میں جتنا جانتا ہوں، بتا دیتا ہوں۔

لوح سے مراد لوح محفوظ ہے۔ کائنات ایک ایسا پروگرام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا اور موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب عمل درآمد کرنا چاہا تو اللہ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کائنات میں بے شمار مخلوقات وجود میں لا کر اپنا مظاہرہ کریں تو اللہ تعالیٰ نے "کن" فرما دیا۔ کن فرمانے کے بعد فیکون کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ اور جس طرح موجود تھا، وہ شکل وصورت کے ساتھ ایک سکرین پر نقش ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ذہن میں موجود پروگرام یا اس پروگرام کے کردار "کن" کہنے کے بعد جس بساط پر نقش ہوئے اس کو مذہب لوح محفوظ کہتا ہے۔ کائنات کی تشکیل کے پروگرام کا پہلا مظاہرہ لوح محفوظ پر ہوا۔ تصوف میں لوح محفوظ کو لوح اول کہا جاتا ہے۔ وہ لوح اول ہے اور جس سکرین پر تصویریں موجود ہیں، وہ عالم ہو ہے یعنی عالم تمثال جس میں انسانی ادارے بھی شامل ہیں۔ عالم تمثال کا تعلق بھی براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کے ذہن نے حرکت کی تو صفات الہیہ کائنات کی شکل میں موجود ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجزا یعنی اللہ کی مخلوق مختلف صورتوں میں ڈھل گئی۔ یہ صورتیں وہ صورتیں ہیں جو خلق کی شکل وصورت میں روح کی حیثیت سے لوح محفوظ پر موجود ہیں۔ انہی

روحوں کو قرآن نے ''امر ربی'' کہا ہے۔ مختصر یہ کہ کائنات کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے حکم کی ایک تصویر ہے۔ یہی حکم زندگی، موت اور موجودات میں ہر جگہ متحرک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ''الست بربکم'' فرما کر کائنات کو نگاہ کا علم عطا کیا۔ دیکھنے کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کوئی مرکز نگاہ نہ ہو۔ انسان کی پہلی نگاہ کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

کائنات یا انسان کی نگاہ کا مرکز اللہ تعالیٰ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا ''میں تمہارا رب ہوں'' اور انسان گمشدگی کے دریا سے باہر آ گیا تو اس نے سب سے پہلے اللہ کو دیکھا اور پھر ساری کائنات کو یکجائی پروگرام کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہوئے سنا۔ انسان نے جب کائنات کو، اس کی وحدت کو دیکھا۔ اس دیکھنے کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔

انسان جس مقام کے تعین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے یا سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اسی مناسبت سے وہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ کر دیتا ہے کیونکہ انسان کی لامحدود نگاہ بھی محدود ہے۔ اس لیے آگے اور آگے اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے ادراک میں یہ بات نہیں آتی کہ جو دیکھا ہے، اس سے آگے بھی کچھ ہے۔ وہ بے بسی کی حالت میں سمجھ میں نہ آنے والے عالم کا نام وحدت شہود رکھ دیتا ہے۔ غالب نے خوب کہا:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آخری نبی سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ترجمہ: ''پہچاننے کا جو حق ہے، وہ ہم سے پورا نہیں ہوا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں تب بھی اللہ کی باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔'' تجلی نے جب نزول کیا تو نور میں جلوہ گر ہوئی۔ جب موجودات کے فہم میں یہ بات آ گئی کہ ہمارے علاوہ بھی کوئی ہستی ہے اور اس ہستی نے ہمیں تخلیق کیا ہے تو موجودات نے اپنے علاوہ دوسری موجودات کو دیکھا۔ اس دیکھنے کو عالم مثال (کثرت) کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کا عکس علم واجب، علم جواب کا عکس، علم لوح محفوظ وحدت یا علم وحدت سے مراد کائنات کی وہ موجودگی جہاں کائنات گم صم اپنے احساس کے علاوہ کچھ نہیں جانتی۔

لوح محفوظ کا عکس۔ عالم تمثال۔

عالم تمثال کا عکس۔ عالم ناسوت۔

جب ہم نوعی اعتبار سے نوع کے افراد کا مطالعہ کرتے ہیں تو نوعی زندگی میں تقاضوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ ہر نوع میں جذبات مشترک ہیں۔ زندگی کے اعمال اور جسمانی تقاضے مشترک ہیں۔

تقاضوں میں یکسانیت اس بات کا ثبوت ہے کہ ساری کائنات کسی ایک نقطے میں بند ہے۔ انسان فی الواقع اطلاع کا مظہر ہے اور اطلاع علم ہے یعنی کائنات ایک علم ہے۔ یہ علم چار شعوروں پر پھیلا ہوا ہے۔

(1) کائنات کا لاشعور (2) کائنات کا شعور (3) کائنات کا ارادہ (4) کائنات کی حرکت۔

کائنات کا لاشعور تجلی ہے۔ کائنات کا شعور تجلی کی صفت ہے اور تجلی کی صفت ارادہ ہے اور ارادے میں حرکت مظہر ہے۔ یہ چاروں شعور کائنات کا اصل ہیں۔"

ندیم کے لیے یہ گفتگو ناقابلِ فہم تھی۔ اس نے پہلی دفعہ ایسی اصطلاحات سنی تھیں جن سے وہ مکمل طور پر ناواقف تھا۔ ندیم میں تجسس بہت تھا۔ پیدائشی طور پر وہ چیزوں کو سمجھنے اور ان کی حقیقت کو جاننے (Inquiry) پر یقین رکھتا تھا۔ آج اس کے اسی جذبے کی تسکین ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھا کہ وہ کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کے تجسس نے ایک اور انگڑائی لی۔ اس نے رابعہ سے پوچھا:

"آپ کچھ زیادہ ہی پڑھی لکھی ہیں۔ کیا آپ جادو (Magic) کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں کیونکہ دیکھنے میں آپ بھی بہت پراسرار شخصیت لگتی ہیں۔"

سب ندیم کی بے باکی پر حیران ہوئے لیکن ہنستے ہوئے کہا: "ہاں رابعہ بتاؤ۔ یہ سوال براہِ راست تم ہی سے کیا گیا ہے۔"

رابعہ نے اعتماد سے کہا "جتنا میں جانتی ہوں، ضرور بتاؤں گی ندیم صاحب۔

دراصل میں نے سی جے ایس تھامپسن کی کتاب "جادو کی تاریخ" (History of Magic) پڑھی ہے۔ اس کی کچھ نمایاں باتیں یاد ہیں جو بتا دیتی ہوں۔

"جادو ایک ایسا فن تھا جس کے ذریعے واقعات کے بہاؤ کو متاثر کیا جاتا تھا اور عقل و شعور میں نہ آنے والے مظاہر کو جنم دیا جاتا تھا (Illusion) پیدا کیے جاتے تھے۔ اس کے لیے تین طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ ان میں مافوق الفطرت (Super natural) ہستیوں کو یا

فطرت کی مخفی قوتوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

نوع انسان پر جادو کا گہرا اثر صدیوں تک رہا ہے۔

بابل اور مصر میں تو اسے مذہب کا حصہ بنا لیا گیا تھا۔ توہمات پرستی (Superstitions) کی طرح جادو پر یقین کی جڑیں بھی خوف میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ "نامعلوم" کے خوف کا شکار رہا ہے۔ اسرار کی جبلت جو انسان میں موجود ہے۔ ابتدا میں جہالت اور نامعلوم مستقبل کے خوف سے ابھری تھی۔ زیادہ ذہین لوگ ان رازوں کو سمجھ گئے تھے اور انہوں نے پراسرار اشیاء پر یقین کو اپنے مفاد میں استعمال کیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، زیادہ ذہین لوگ سمجھتے گئے کہ جادو کی رسومات، تقریبات اور ٹونے ٹوٹکے حقیقتاً ویسے اثرات جنم نہیں دیتے جیسا کہ فرض کیا جاتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ عقیدے میں تقسیم رونما ہوئی۔ جاہل افراد جادوئی طاقتوں پر عقیدے، توہمات سے چمٹے رہے اور زیادہ ذہین افراد نے تمام کائنات میں ایک عظیم ترین طاقت کے ہاتھ کو کارفرما دیکھا اور انہوں نے خدا (God) کو ماننا شروع کر دیا۔

فریزر کہتا ہے کہ جادو کی اساس جس تصور پر تھی اس کے دو حصے تھے۔ اس نے پہلے حصے کو تمثیلی جادو قرار دیا ہے۔ جس میں جادوگر جس طرح کا اثر پیدا کرنا چاہتا تھا، ویسا ہی عمل کیا کرتا تھا۔ دوسرے حصے کو اس نے متعدی جادو کا نام دیا ہے۔ اس میں جادوگر نے جس شخص کو نشانہ بنانا ہوتا تھا۔ اس کے استعمال میں رہنے والی کسی شے پر جادو کرتا تھا جس کے نتیجے میں متعلقہ شخص پر اس جادو کا اثر ہو جاتا تھا۔ عملی طور پر دونوں صورتیں مربوط ہوتی تھیں۔ یہ ایک ہمدردانہ جادو ہوتا تھا کیونکہ دونوں صورتوں میں یہ فرض کیا جاتا تھا کہ چیزیں خفیہ ہمدردی کے ذریعے فاصلے سے ایک دوسرے پر عمل کرتی ہیں۔

جادوگر دشمن کو زخمی یا ہلاک کرنے کے لیے اس کے پتلے میں اس یقین کے ساتھ سوئیاں چبھوتا کہ پتلے کے جس حصے میں سوئی چبھوئی جائے گی، دشمن کے اسی عضو میں تکلیف ہوگی۔ یہاں تک کہ پتلے کے تباہ ہوتے ہی دشمن بھی مر جائے گا۔ یہ تمثیلی جادو کی ایک مثال ہے جو کہ ہزاروں سالوں سے جاری ہے اور عقل و شعور کے زمانے آج کے دور میں بھی موجود ہے۔

اس جادوئی عمل کو ایک اچھے مقصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا یعنی کسی شخص کو محبوب بنانے کے لیے۔ محبت کے لیے کیے جانے والے جادوئی عمل میں ہوتا یہ تھا کہ متعلقہ شخص کا موی پتلا آگ کے قریب رکھ کر پگھلایا جاتا تھا۔ اس عمل کے پیچھے یہ عقیدہ ہوتا تھا کہ پتلے کے پگھلنے کے

ساتھ ساتھ مذکورہ شخص کا دل بھی نرم ہوتا جائے گا اور یوں اس کی محبت حاصل ہو جائے گی۔

متعدی جادو کا دار و مدار جادوئی ہمدردی پر نہیں تھا۔ اس حوالے سے عقیدہ یہ تھا کہ جادوئی ہمدردی کسی شخص اور اس کے جسمانی اعضا مثلاً بالوں، ناخنوں یا دانتوں کے درمیان موجود ہوتی ہے۔ جادو میں مافوق الفطرت ہستیوں کا بھی اہم کردار ہے۔ ان (Supernatural) ہستیوں کا ذکر ہر تہذیب میں مختلف طریقے سے ملتا ہے۔ مشرق بعید میں یہ مافوق الفطرت ہستیاں رومانی کہانیوں کا حصہ ہوتی تھیں اور قدیم ہندو روایات کے مطابق وہ انسان کی تخلیق سے پہلے بھی اس زمین پر آباد تھیں۔ قدیم ایران میں بھی ایسی ہستیاں موجود ہونے کا عقیدہ پایا جاتا تھا جو کہ آسیب زدہ مقامات اور محلات میں رہتی تھیں۔

یورپ کی اقوام بھی توہم پرستی، روحوں کی زیادہ خبیث قسموں، بھوتوں اور جنتنوں کو متعارف کروایا۔ قدیم ایران میں پریوں پر عام یقین تھا اور انہیں انتہائی خوبصورت اور انسانی (منی ایچرز) سمجھا جاتا تھا۔ یہودی کے ربیوں (Rabbies) کا عقیدہ تھا کہ شیطان اکثر و بیشتر بکری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ بکری کو گناہ کے کفارے کے طور پر پیش کیا گیا۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ لفظ (Devil) فارسی کے لفظ (Div) سے بنایا گیا تھا اس کے مترادف عبرانی لفظ کے معنی (بالوں والا) کے لیے جاتے ہیں۔ بکریوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔

جادو کا تمام دیومالاؤں سے گہرا تعلق ہے۔ نیز اس کا تعلق فلسفے کے قدیم عقائد سے بھی ہے۔ زرتشت جیسے (Magian) مذہب کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ 1500 قبل مسیح میں زندہ تھا۔ تاہم ژند اوستا کے مطابق جس میں اس کا نام موجود ہے، وہ اس سے بھی کافی عرصہ پہلے وجود رکھتا تھا۔ اس کی تعلیمات کے مطابق دو عظیم قوتوں، خیر اور شر کا تصادم برپا ہے۔ خیر ازلی و ابدی ہے۔ آخرکار شر پر غالب آجائے گا۔ یہ بڑی ایرانی سلطنت کا زمانہ تھا۔ زرتشت کے سامنے والے خوابوں کی تعبیر اور علم نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ حق کے متلاشی ہیں۔ وہ بتوں کو نہیں مانتے تھے اور آسمان کو خدا کا عکس مانتے ہوئے اس کی پرستش کرتے تھے۔

جادو کے اعمال میں تین چیزیں بنیادی اہمیت کی مالک ہوتی ہیں۔ اول ''جادو الفاظ'' جس کے لیے جادوگر، دیوتاؤں یا مافوق الفطرت عناصر کو مدد کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ دوم اس شخص یا بری روح کا نام جو کہ مقابلے میں عمل کر رہی ہے۔ سوم تعویذ گنڈے یا موم اور مٹی کے پتلے

یا بعض اوقات بال یا کٹے ہوئے ناخنوں کے ٹکڑے۔

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، یہودی تصوف کبالہ میں بڑی پراسراریت تھی۔ عہد نامہ قدیم کی پہلی پانچ کتابیں جو جادو کے حوالے سے موجود ہیں، وہ بنیادی طور پر مصر سے ماخوذ ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہودیوں نے جادو مصریوں سے ہی سیکھا تھا۔ جب وہ مصر میں قید تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف قرآن مجید کے بیان کردہ اس واقعہ سے ہو جاتا ہے جب رسیاں سانپ بن گئی تھیں اور ساحروں نے جادو کے زور پر ان رسیوں میں حرکت پیدا کر دی تھی۔ پھر عصائے موسوی خدا کی قدرت سے ایک اژدھا بن کر ان سانپوں کو نگل گیا۔ اس سے مصری جادوگری کا ثبوت ملتا ہے۔

"Book of Enoch" میں ایک کہانی ہے کہ جادو کا فن دو فرشتوں نے انسان کو دیا تھا۔ ان کے نام اُزّا (Uzza) اور ازائیل (Azael) تھے۔ انہوں نے عورتوں کو جادو کا فن اور آرائشی اشیاء کا استعمال سکھایا۔ ایک قدیم مصری روایت کے مطابق جادو کا فن ایک فرشتے نے انسانوں کو دیا تھا۔ اس فرشتے کو ایک عورت سے محبت ہو گئی تھی۔

"Book of tobit" میں درج ہے کہ ایک بری روح کو سارہ سے محبت ہو گئی تھی۔ اس روح کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے رافائیل نامی فرشتے نے اپنی روحانی قوت استعمال کی اور اسے ختم کر دیا۔ اس بری روح کو جس کا نام اشموڈیس تھا، بھگا دیا گیا اور بعد ازاں اسے ''شر کی طاقتوں'' کا نام دیا گیا۔

ایک مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون کہتا ہے: ''بری روحوں کا پسندیدہ ترین تحفہ خون ہے۔ جادوگر کو خون کی بھینٹ ضرور دینا ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ بری روحوں کا کھانا کھاتا ہے تاکہ ان کا رفیق بن جائے۔ دھوئیں کی مہک ان روحوں کو بہت پسند ہوتی ہے۔ یونان اور روم میں بھی جادو کی بے شمار شکلیں موجود تھیں۔ عرب دنیا میں بھی جادو عام تھا۔ عرب روایات کے مطابق جادو یا سحر جس کا مطلب نظر کا فریب پیدا کرنا ہوتا ہے، دو فرشتوں ہاروت اور ماروت نے بابل میں انسانوں کو سکھایا تھا۔ سحر کے ذریعے شوہر کو بیوی سے جدا کیا جاتا تھا۔ نیز کسی فرد کے دل میں محبت ابھاری جاتی تھی۔

جب کسی عمل کو سحر قرار دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ نظر کا دھوکا ہے یا بری روحوں کے ساتھ غیر قانونی معاملہ ہے۔

عربوں نے جادو پر پابندی لگادی تھی اور جادوگروں کے لیے موت کی سزا مقرر کی تھی۔ جو شخص بھی جادوگری کا مرتکب پایا جاتا اس کو توبہ کی اجازت نہیں تھی۔

عرب جنات کو مانتے تھے اور عرب رومانوی قصوں کے شاعروں اور ادیبوں کے تخیل جنات سے بہت متاثر رہے ہیں۔ ''الف لیلہ'' نامی قدیم داستان میں جنات کثرت سے موجود ہیں۔ ''الف لیلہ'' کی کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں نے دیگر قوموں کے علاوہ یہودیوں سے جادو کا فن سیکھا تھا۔

حضرت محمد (صلعم) پر بھی ایک مرتبہ ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا تاہم آپؐ نے بری نظر سے بچنے، سانپ کے زہر سے محفوظ رہنے اور دیگر بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے جادو کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی۔ عرب آئینے کو روحوں کے دیکھنے کے لیے استعمال کرنا بہت قدیم زمانے سے جانتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بادل یا دھوں میں لپٹی ہوئی شبیہ آئینے اور دیکھنے والے کی آنکھ کے درمیان نظر آتی تھی۔ کہتے ہیں خلیفہ منصور کے پاس ایک ایسا آئینہ تھا جس سے اسے دوست دشمن کا فرق پتا چل جاتا تھا۔ عرب مستقبل بینی کے لیے روشنائی اور پانی بھی استعمال کرتے تھے۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ خاص نام جادوئی طاقت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان الفاظ کو کپڑے کے ٹکڑے پر لکھ کر پانی میں ڈبویا جائے اور پھر اس پانی کو پیا جائے تو مختلف امراض سے نجات مل سکتی ہے۔

ایسی دوشیزہ جو کہ کسی نوجوان کی محبت حاصل کرنا چاہتی ہو، ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ خاص نقش پانی کے اس برتن میں ڈال دے جس سے وہ نوجوان پیاس بجھاتا ہو تو وہ نوجوان اس لڑکی سے شدید محبت کرنے لگے گا۔

ہندوستان میں بہت قدیم زمانے سے جادو پر عمل کیا جاتا رہا ہے۔ یوگیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنی جادوئی قوتوں کے ذریعے مادی دنیا پر تسلط رکھتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ انہوں نے دھاتوں کو تبدیل کرنے کا راز (مثلاً لوہے کو سونا بنانے کا راز) پالیا ہے۔ یوگی ویناناتھ کی کہانی میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ جب اس نے ایک لڑکے کے پیتل کے سکوں کو سونے میں بدل دیا تھا۔ اس نے بھگوان وشنو سے پرارتھنا کی کہ وہ اس لڑکے کو انعام دینے کی قوت عطا کرے۔ یوگی نے پیتل کے سکوں پر جادوئی سفوف چھڑکایا۔ منتر پڑھے اور وہ سارا پیتل سونے میں تبدیل ہوگیا۔

ہندوستانی جادوئی رسومات میں ایسے درختوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا جن کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ ان میں جنات رہتے ہیں۔ بڑ کے درخت کو مقدس مانا جاتا تھا۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ اسے کاٹنے والا شخص بیمار ہو جاتا ہے۔ نیز اس کے بال جھڑ جاتے ہیں۔

عورتوں پر قابض روحوں کو بھگانے کی غرض سے ہندو تین مختلف رنگوں والے ریشمی یا سوتی دھاگے لے کر انہیں اکیس گرہیں دیتے۔ انہیں گنڈے کہا جاتا تھا۔ گرہ لگاتے ہوئے پنڈت منتر پڑھ کر ہر گرہ پر پھونک مارتے جاتے۔ جب ساری گرہیں لگائی جاتی تھیں تو اس گنڈے کو عورت کی گردن میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس کے اثر سے بری روحیں بھاگ جاتی تھیں۔

حضرت سلیمان جادو پر یقین رکھتے ہیں لیکن جادو کی اس قسم کی مذمت کرتے ہیں جس میں شیطان یا بدروحوں سے مدد لی جاتی ہے۔ اگر جادو کسی نیک روح یا نیک جن کی مدد سے کیا جائے تو اس کو برا نہیں سمجھا جاتا، خواہ اس کے نتائج تباہ کن ہی کیوں نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا جادو کسی کو نقصان پہنچائے۔

ایسا لگتا ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں ایک عقیدہ آفاقی طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ عقیدہ ہے ہواؤں، زمین، آسمانوں اور درختوں میں رہنے والی روحوں کی موجودگی کا۔ ہندوستان میں جادوئی رسومات کا اتنا عام ہونے کی وجہ شاید یہی عقیدہ ہے۔

جادوئی طاقتوں کے حصول کے لیے ہندو یوگی الگ تھلگ زندگی بسر کرتے۔ فاقہ کشی کرتے اور خاموش رہتے تھے۔ جادوئی رسومات کے ساتھ ساتھ بھینٹ بھی چڑھائی جاتی تھی۔ اس کے لیے قبرستان یا ویران جگہ استعمال کی جاتی تھی۔

ہندوؤں میں بری روحوں (witches) کا گہرا تصور موجود ہے۔ پیدائش، شادی، موت کے مواقع پر خاص طور پر خطرناک ہو جاتی ہیں۔ وہ انسان، اس کی جائیداد اور مویشیوں اور فصلوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں، لہٰذا ان تمام پر حفاظتی جادو کروائے جاتے تھے۔

برے اثرات سے بچنے یا اچھی قسمت کے لیے لکڑی اور دیگر چیزوں کے بنے ہوئے تعویذ اپنے پاس رکھے جاتے تھے۔ انہیں انسان کے لیے بھگوان کا تحفہ مانا جاتا تھا۔

قدیم چین میں جادوگروں کو وو (Wu) کہا جاتا تھا۔ خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، مستقبل بینی اور شگون گوئی کے حوالے سے انہیں ممتاز مقام دیا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مردہ افراد کی روحوں کو بلا سکتے ہیں۔ چینی جادوگر مستقبل کی پیش گوئیوں کے حوالے سے بھی

مشہور تھے۔

کنفیوشس مت کے بعد تاؤ مت پھیلنا شروع ہوا۔ جو عیسائی سن عیسوی سے ہزاروں سال پہلے تھا، بارش برسانے کے لیے جادوگروں کا رقص خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ تاؤ مت چین میں جنم لینے والا مذہب ہے۔ اس کی بنیادی کتاب ''تاؤ تیر کنگ'' ہے جو کہ واؤ ترے سے موسوم کی جاتی ہے۔ وہ کنفیوشس کا ہم عصر بتایا جاتا ہے۔ تاؤ کے بارے میں عقیدہ ہے کہ وہ ساری ہستی کا اصول اور سارے علم کا قلب ہے۔ موجودہ زمانے کے تاؤ مت کا بانی ''چانگ تاؤ لنگ'' کو قرار دیا جاتا ہے۔ تاؤ مت جادو اور توہمات کا مرکب دکھائی دیتا ہے جس میں مستقبل بینی کرنے کا عمل بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کنفیوشس کی قبر پر اُگنے والی شبہ تساوی نامی گھاس کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کو احتیاط کے ساتھ توڑ کر پیکٹ بنائے جاتے ہیں۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ کنفیوشس کی قبر کی مقدس مٹی سے اس گھاس میں روحانی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ اپنے گھروں میں بری روحوں کا داخلہ روکنے کے لیے اور خوشی کو داخل کرنے کے لیے خاص پودوں کو لٹکایا کرتے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ یورپ کے دیہاتی آج بھی کرتے ہیں۔

عمل حاضرات جادو کے فن کی وہ شاخ ہے جس کے ذریعے مردے کی روح کے وسیلے سے مستقبل کے حالات معلوم کیے جاتے تھے۔ قدیم زمانے میں کسی مردے سے زندہ انسانوں کے مستقبل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا رواج عام تھا۔ کوئی شخص اس وقت تک حاضرات کا عمل کرنے سے قاصر ہے جب تک وہ شیطان سے معاہدہ نہیں کر لیتا۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان سے معاہدہ کرنے والا شخص اپنے خون سے دستخط کرتا تھا۔

وچ کرافٹ (Withc Craft) سفلی عمل جس کی مدد سے بری روحوں سے رابطہ کرنا اور ان کی مدد سے مافوق الفطرت کام کروانا۔

جادوگرنیاں عموماً بدصورت بوڑھی اور معذور ہوا کرتی تھیں۔ کچھ جادوگرنیاں رومن کیتھولک ہوتی ہیں۔ اکثر لادین (Alhiest) ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایسی عورتیں بھی ہوتی تھیں جو شیطان کو اپنا خدا تسلیم کرتی تھیں۔

انگلستان میں وچ کرافٹ کے خلاف ہنری ششم کے زمانے میں ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے جادوگرنیوں کو موت کی سزا کا حقدار قرار دیا گیا اور بہت سی جادوگرنیوں کو ہلاک کر

دیا گیا۔

قدیم زمانے میں یہ بھی مانا جاتا تھا کہ مرگی اور ہسٹریا کی بیماری بری روحوں کے انسانی جسم میں پیدا ہونے سے لاحق ہوتی تھیں اور بے شمار توہمات کا سہارا لیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیطانی پوجا کی تقریبات میں ننھے بچوں کو قتل کیا جاتا تھا۔

مستقبل بینی کا عمل بھی بہت قدیم ہے۔ مغربی ایشیا کے لوگ 700 قبل از مسیح یہ کام کیا کرتے تھے۔ انجیل میں بھی مستقبل بینی کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے تیر استعمال کیے جاتے تھے۔ آئینہ بینی یا بلوری پیالوں (Crystal bowls) کے ذریعے بھی لوگوں کی قسمت کا حال بتاتے تھے۔ ایسے لوگ آج کے دور میں بھی ہیں۔ قسمت کا حال بتانے والے نے علم الاعداد بھی رائج کیا جس کا نجوم کے علم سے گہرا تعلق ہے۔ سنگ بینی بھی مستقبل گوئی کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں خاص قسم کے پتھر استعمال کیے جاتے تھے۔ ان پتھروں کو انگیٹھیوں میں سجا کر برے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ کیا جاتا تھا اور نیک شگون (Good omen) سمجھا جاتا تھا۔

سولہویں صدی میں آئینوں کے ذریعے مستقبل بینی کرنے والوں کو (skryer) کہا جاتا تھا۔ ایڈورڈ کیلی جو کہ ملکہ الزبتھ کے زمانے میں ڈاکٹر "ڈی" کہلاتا تھا، اس فن میں ایک مشہور ماہر تھا۔ مستقبل بینی کے لیے جو وہ آئینہ استعمال کرتا تھا، وہ آج بھی برٹش میوزیم (لندن) میں موجود ہے۔

جادوئی رسومات میں جادوئی دائرے بھی بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جادوگر عمل کے دوران بدروحوں سے محفوظ رہے۔ جادو سے وابستہ زیادہ تر رسوم میں خوشبویات یا بخورات کا بھی اہم کردار ہوتا تھا۔ اس کا استعمال اس تصور کے تحت ہوتا تھا کہ دیوی، دیوتاؤں کو خوش کر کے ان کی تمنائیں دور کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔

جادوئی اعداد کا عقیدہ بہت قدیم ہے اور آج بھی رائج ہے۔ عہد نامہ قدیم (Old testament) میں عدد سات (7) کے ساتھ پراسرار خواص منسوب کیے گئے ہیں اور تیرہ (13) سے جو توہمات منسوب ہیں، بعض لوگ آج بھی ان پر یقین رکھتے ہیں۔

فیثا غورث کے ماننے والے عدد سات کو عظمت کی نشانی سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ انسانی زندگی کی اساس ہے۔ اسے رحمت اور سکون کا عدد مانا جاتا تھا۔ ہفتے کے سات دن ہوتے ہیں۔ سیارے سات ہیں۔ رنگ سات ہیں، دھاتیں بھی سات ہیں، آسمان بھی سات ہیں اور

اواگون میں سات ہی انسان کے جنم ہیں۔

عدد چھ (6) فطرت میں کامل ترین عدد ہے۔ دنیا چھ دن میں بنائی گئی تھی۔ چھٹے دن کو انسان کا دن کہا جاتا ہے کیونکہ انسان کو چھٹے دن تخلیق کیا گیا تھا۔ کام کرنے کے چھ دن، من وسلویٰ جمع کرنے کے لیے چھ دن اور چھ دن رات زراعت کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔ کروبی پرندے کے چھ پر ہوتے ہیں، عدد تیرہ تبدیلی اور بدقسمتی کا عدد ہے۔ یہ موت اور تباہی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ہندو اور رومن اسے انتہائی نجس مانتے تھے۔ کسی جگہ لوگ اکٹھے ہوئے تو تیرہویں نمبر پر بیٹھنے کو برا شگون مانتے تھے۔

طلسم جادو کی ایک قسم ہے۔ قدیم عربوں میں بچھو کے نشان والے طلسم ہوتے تھے۔ وہ ان کی مدد سے زہریلے کیڑوں کے کاٹے کا علاج کرتے تھے۔

سعد ساعت یا شبھ گھڑی یا بری ساعت آشبھ گھڑی کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کو اسی لیے زائچے بنائے جاتے تھے۔ ہر سیارے کی اپنی لوح (برج) ہوا کرتی تھی۔ ان الواح سے مختلف اثرات مہیا کیے جاتے تھے۔ زحل کی لوح پر ایک مربع بنا ہوتا تھا۔ اس مربع کے نو خانے ہوتے تھے۔ عطارد کی لوح کو چاندی سے بنایا جاتا تھا۔ مریخ کی لوح کو لوہے پر بنایا جاتا تھا۔ عقیق پر بنی ہوئی لوح خون کو بہنے سے روکتی تھی۔ جادوئی انگوٹھیاں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ ان میں قیمتی پتھروں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ آج بھی قیمتی پتھروں کے ساتھ جادوئی اثرات موجود ہیں۔

یاقوت پتھر کے بارے میں عقیدہ ہے کہ وہ طاعون سے محفوظ رکھے گا۔ یہ اداسی دور کرنے، برے حالات سے نجات پانے، خوفناک خوابوں سے محفوظ رہنے اور شہوت پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے۔ نیلم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اسے دیر تک تکتے رہنے سے بینائی بہتر ہوتی ہے۔ یہ طاقت اور توانائی عطا کرتا ہے۔ زمرد کے بارے میں عقیدہ تھا کہ یہ بری روحوں کو بھگاتا ہے۔ رازوں سے آگاہ کرواتا ہے۔ مستقبل میں ہونے والے واقعات سے آگاہ کرتا ہے۔ پکھراج کے حوالے سے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اسے بائیں ہاتھ میں پہنایا جائے تو یہ غصے کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ اداسی کو دور کرتا ہے۔ اچھے مزاج اور شگفتگی میں اضافہ کرتا ہے۔ اوپل کو منحوس پتھر تسلیم کیا جاتا ہے۔ فیروزے کے بارے میں لوگوں کا اعتقاد تھا کہ یہ سر درد رفع کرتا ہے۔ نفرت ختم کرتا ہے۔ محبت کرنے والے دلوں کو بدگمانی سے روکتا ہے۔ مرجان پتھر سے یہ بات منسوب ہے کہ جب کوئی

مرجاتا ہے تو مرجان کا پتھر زرد ہو جاتا ہے۔ محبت اور جادو کا بھی آپس میں گہرا تعلق ہے۔"

"پروفیسر انکل!" ندیم بے تابی سے بولا "محبت کا جادو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ محبت تو ایک ارفع اور اعلیٰ جذبہ ہے۔ اسے کسی پتھر سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ آفاقی جذبہ ہے۔"

پروفیسر دھیرے سے بولے "بیٹا ندیم! انسان اپنی تخلیق کے بعد سے محبت کی بیماری کے علاج کے لیے جادوگروں سے مدد لیتا آیا ہے۔ محبت کے حصول کے لیے جادوگروں سے مدد لیتا ہے۔ دیومالاؤں میں اس کے لیے اس سے مختلف رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ تعویذ باندھے جاتے تھے اور جادوئی جڑی بوٹیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ محبت کا ایک منتر سولہویں صدی کے ایک کتابچے میں درج ہے کہ اگر محبت کرنے والا مرد اپنے پاس ہاتھ پر H.L.D.P.N.A.G.U لکھ کر محبوبہ کے پاس جائے اور اس ہاتھ سے چھوئے تو وہ اسی کی ہو جائے گی۔

ایک دوسرا منتر H.L.N.P.M.Q.U اس منتر کو سورج طلوع ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ پر لکھنا پڑتا ہے۔ یہ منتر عورتوں کے لیے ہے۔ وہ اسے بائیں ہاتھ پر لکھنے کے بعد اس مرد کی گردن کو چھوئیں جس کی محبت کے حصول کی آرزو ہو۔ ایک اور منتر اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے خون سے لکھنا پڑتا ہے۔ وہ یہ منتر تھا۔ O.C.I.P.E.A.N.A.P.A.R.A.B. سورج طلوع ہونے سے پہلے لکھنا ہوتا تھا۔ جس شخص کی محبت مطلوب ہو اسے چھوتے ہی مندرجہ ذیل ادا کرنا پڑتا تھا "El Signere me etstat in vanief tipei" محبت کے حصول کا ایک عجیب و غریب طریقہ یہ تھا کہ چڑیا کی زبان کو تازہ موم کے اندر رکھ کر اپنے لباس کے اندر چار دن تک چھپائے رکھو۔ پھر اسے نکال کر اپنی زبان کے نیچے رکھو اور اس عورت کا بوسہ لو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ جادوئی رسومات میں الوہی ہستی کے نام کی شمولیت کا مقصد بری روحوں سے محفوظ رہنا تھا۔ سترہویں صدی کے اوائل میں کسی نامعلوم مصنف کا لکھا ہوا ایک دلچسپ خط دریافت ہوا ہے۔ اس نے جادو کی نو کتابوں کے عنوان سے درجہ بندی کی ہے۔ جو کچھ یوں ہے۔ پہلی کو Hagage یا جادو کے اداروں کی پہلی کتاب کہا جاتا ہے۔ دوسری کتاب ہے کائنات اور اصغر کا سفر، تیسری کتاب کا نام ہے "اولمپائی جادو" چوتھی کتاب کا نام ہے "ہیسڈ اور ہومر کا جادو" پانچویں کتاب کا نام "رومن یا سبلین جادو" چھٹی کتاب کا نام "فیثا غورث اور اس کا

جادو" ساتویں کتاب کا نام "اپولیشن کا جادو" آٹھویں کتاب کا نام ہے "ہر منتر کا جادو" نویں کتاب کا نام ہے "حکمت" جو کہ سراسر خدا کے کلام پر منحصر ہے۔

مصنف لکھتا ہے: جس شخص کو پیدائشی طور جادو کی صلاحیت عطا کی گئی ہو، وہی سچا جادوگر ہوتا ہے۔ جو لوگ اس علم کو حاصل کرتے ہیں، ناخوش رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جدو کے سات اسرار کو منکشف کرتا ہے۔

1) نقوش یا فطری اشیاء یا اعلیٰ ترین روحوں کے ذریعے بیماریوں کا علاج کرنا۔
2) زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا۔
3) عناصر میں موجود روحوں کو قابو کرنا۔
4) تمام مرئی اور غیر مرئی اشیاء سے گفتگو کرنا۔
5) خداوند کے متعین کردہ آخری وقت تک اپنی زندگی پر قابو پانا۔
6) خداوند اور یسوع اور اس کی مقدس روح کو ماننا۔
7) دوبارہ جنم لینا۔

رابعہ نے مداخلت کی۔ "جادو اور کالا جادو میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

پروفیسر دلاور بولے: "بیٹے جادو پر بہت بات ہو گئی ہے۔ کالا جادو، جادو ہی کی ایک قسم ہے۔ فرانسیسی زبان میں (کالے جادو کی کتاب) کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سرورق پر علی بیگ مصری (Ali beck the egyption) کا نام موجود ہے۔ یہ میمفس (Mafus) میں 1517ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر کالے جادو پر ایک خط میں بہت سی رسومات درج کی گئی ہیں۔ لکھا گیا ہے کہ ایک رسم کے دوران کالے مرغ کو ذبح کر کے اس کی آنکھیں، زبان اور دل نکال لیے جائیں۔ اسی طرح ایک خط میں سینٹ جان کی جادوئی رسومات سے ربط عیسوی سن کے آغاز ہی سے ہو گیا تھا۔ سینٹ آگسٹن کے زمانے میں رواج تھا۔ بیماروں کو صحت یاب کرنے کے لیے ان کے سر پر سینٹ جان کی بائبل کو رکھا جاتا تھا۔

برٹش میوزیم میں سولہویں صدی سے تعلق رکھنے والے تاریخی کاغذات سے پتہ چلا ہے کہ یہ کائیس کالج کیمبرج کے بانی ڈاکٹر کائیس کی خفیہ تحریروں میں سے ایک تحریر ہے۔ وہ جادو کے فن کا ماہر تھا۔ ان اوراق پر جدول بنے ہوئے ہیں جن میں ستاروں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ ان سے منسوب فرشتوں کے نام درج ہیں۔ آئینے میں روحوں کو دیکھنے کا طریقہ درج ہے۔ اس

کے علاوہ دو جادوئی دائرے اور ایک نقش بھی ہے۔

شیکسپیئر کے ڈراموں میں بھی جادو کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اپنے گیارہ ڈراموں میں اس نے کسی نہ کسی شکل میں مابعد الطبیعیاتی مخلوقات کا استعمال کیا ہے۔ ''دی ٹیمپسٹ (The Tempest) میں ایریئل اور اس کی ماتحت روحیں جادو کے فن سے واقف ہیں اور پروسپرو کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے خوفناک طوفان پیدا کرتی ہیں اور بادشاہ کے بحری جہازوں کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔

''کامیڈی اور ایررز'' میں پنچ کا کردار ہے جو الفیس شہر کا استاد ہے اور جادوگر بھی ہے۔ ''اے مڈسمر نائٹس ڈریم'' (A mid summer nights dream) جو کردار خود کو پریوں کی سلطنت میں پائے جاتے ہیں جہاں اوبرن بادشاہ ہے۔ جادو رسوم کی نفسیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیکسپیئر کو جادو کے فن سے مکمل آگاہی تھی۔

رابعہ بینا جدید دور میں اگرچہ جادو پر یقین کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، تاہم اب بھی لوگ قسمت کا حال بتانے والے آئینہ بینی حضرات، دست شناسی اور سب سے بڑھ کر Horoscope اور اپنی جگہ، نام، تاریخ اور وقت سے آپ کو زندگی میں آنے والے حالات کی پیشگوئی کرتے ہیں۔

آج کے دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں یقین ہے کہ وہ مردہ لوگوں کی روحوں کو بلا سکتے ہیں۔ جدید دور میں بھی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی موجود ہے اور پتہ چلتا ہے کہ انسانی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس سب کے باوجود آج تک یہ ثبوت نہیں ملا کہ جادوگر غیر فطرت ذرائع کے بغیر کچھ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی مردہ شخص کی روح کرۂ ارض پر انسانی پیکر میں نمودار ہوئی ہو۔ ماضی میں جتنی بھی جادوئی رسومات ادا کی جاتی تھیں، اس کا مقصد سادہ لوح لوگوں کی ضعیف الاعتقادی کو نامعلوم کے خوف کو استعمال کر کے انہیں بے وقوف بنانا تھا۔ اس رسومات کے ساتھ جتنی زیادہ پراسراریت وابستہ کی جاتی اتنا ہی زیادہ عام لوگوں کے ذہن متاثر ہوتے تھے۔ آج کے دور میں لندن اور پیرس جیسے بڑے اور جدید شہروں میں تماشا گاہوں میں جو لوگ جادو کرتے ہیں، وہ سب فطری اور طبعی اشیاء کے ذریعے پیدا کردہ فریب ہوتا ہے جسے جادو سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ سائنس کی ترقی اور تعلیم کے فروغ سے رموز و اسرار کی حقیقت کھل گئی ہے اور جادو کی اصلیت فاش ہو گئی ہے۔ آج کا جادوگر تو

سائنسدان ہے، جس کے جادو کی کوئی حد ہی نہیں ہے لیکن جب تک دنیا میں بے وقوف لوگ موجود ہیں، ذہین اور عقل مند لوگ کبھی بھوکے نہیں مر سکتے۔"

پروفیسر ولاور نے بات مکمل کر دی۔

ساجد نے ایک نیا سوال کر ڈالا "یہ بات تو ٹھیک ہے۔ ابھی آپ نے مغربی مفکروں اور ان کی تصانیف کا اظہار کیا تھا لیکن مشرق کے مفکروں اور ان نمایاں کتابوں کے بارے میں بھی بتا دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"ساجد صاحب! سب سے پہلے میں آپ کو ڈاکٹر ویلز کی الیکٹرانک جیم تھراپی سے متعارف کروا دوں جو بالکل ایک نیا اچھوتا طریقہ علاج ہے۔ اس نے بے انتہا ریسرچ اور تحقیق کی کہ کس طرح ہیرے، جواہرات اور مخصوص پتھروں میں پوشیدہ توانائی موجود ہے اور کس طرح اسے انسانی صحت یابی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر جان ویل وہ شخص ہے جس نے نقطۂ ارتکاز کے قدیم غیب ہیں علم اور انسان کی تکمیل حالت اور اس کی فلاح و بہبود میں اس کے کردار کو عصری سائنسی کامرانیوں اور ٹیکنالوجیز سے یکجا کرنے کا بے حد مشکل کام سرانجام دیا۔ ڈاکٹر ویل کے نقطۂ ارتکاز کے کچھ بنیادی اصول ہیں۔

1) طبعی، جذباتی یا جزوی سطح پر ہر انسان ایک آزاد ارتعاشی توانائی کا میدان ہے۔ تمام ارتعاشی توانائیوں کا تعلق ایک ایپی سنٹر (Epicenter) یا ورٹیکس (Vortex) سے ہوتا ہے۔ انسانی توانائی کا یہ میدان نقطۂ ارتکاز گردانا جاتا ہے۔

2) نقطۂ ارتکاز کا مقام اور داخلی زاویہ جسم کی شکل کے لحاظ سے طبعی انسانی توانائی کا باعث بنتے ہیں بالکل ایسے جیسے کہ بیماری۔

3) انسانی توانائی میدان کی شکل اور تقسیم، حیاتیاتی توانائی طبعی جسم کے اعضا اور غدودوں کی سرگرمیوں اور جذباتی توانائی کی کوالٹی کی راست متناسب ہوتی ہیں۔"

ندیم بول پڑا "انکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

پروفیسر ولاور نے پیار سے کہا "میں مختصراً سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بنیادی طور پر انسان کا نقطۂ ارتکاز ہے جس کو سمجھنا ضروری ہے۔ جب سفید روشنی کسی جسم پر ہوتی ہے جو جسم کی سطح ایک خاص فریکوئنسی جو رنگ کی فریکوئنسی کے برابر ہوتی ہے۔ دونوں کے ملاپ سے ارتعاش پیدا ہوتا

ہے۔ اس امر کی دریافت اور ثبوت کہ ہر انسان کا ایک توانائی جسم اور ایک نقطۂ ارتکاز ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔"

پروفیسر دلاور بولے" میں ارتکاز توجہ (Meditation) کے طریقوں کی ترتیب بتاؤں گا۔ تفصیل میں جانے سے گفتگو بہت طویل ہو جائے گی ارتکاز توجہ کی پچاس مشقیں ہیں۔

1) شعوری ذہن کو قابو میں رکھنا۔

2) اتھیرل ورلڈ (Athoric world) میں رابطہ پیدا کرنا۔

3) چکروں (Charaakras) کو کنٹرول کرنا۔

4) روحانی جسم سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

5) اعلیٰ ذہنی جسم میں شمولیت لینا (Higher mind body)

6) ارتکاز توجہ (meditation) کو اگر گہرائی میں دیکھا جائے تو یہ وہ روحانی تجربہ ہے جہاں آپ کی ذات خدا کے وجود کو شدت سے محسوس کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور ہمارے نبی آخر زماں ﷺ نے اسلامی عبادات کے جو طریقے بتائے ہیں۔ ان کی روح بھی خدا کی بندگی، اطاعت اور اس ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہے۔ عبادت میں یکسوئی اور خشوع وخضوع بھی ارتکاز توجہ ہے تاکہ نماز کے دوران ان کی توجہ خدا کی ذات پر مرکوز رہے اور خیالات آپ کے ذہن کو پریشان نہ کریں۔ اگر آپ کو شعور اور آگاہی حاصل ہوگی تو نہ صرف آپ کی عبادت میں گداز پیدا ہوگا بلکہ آپ کی ذات میں ایک نئی انرجی اور روحانی قوت پیدا ہوگی۔

اپنی ذات کے بارے میں علم سب سے پہلا قدم ہے۔ اپنے آپ کو پہچانو۔ اگر آپ کو اپنی انا پرستی توڑنا مقصود ہے تو آپ کو خود پسندی اور انا پرستی سے اوپر اٹھنا ہوگا اور اپنی روحانیت کو بیدار کرنا ہوگا۔ جب انا آپ کے دل سے رخصت ہو جائے گی تو جو خلا پیدا ہوگا، اس میں روحانیت داخل ہوگی اور ایک شعور ذات اور فہم وفراست جنم لے گی۔ (Wisdom) پھر ہم شعوری طور پر جب اپنے خالق و مالک کی شعور اعلیٰ (Universal wisdom) سے ہم آہنگ کریں گے تو ہم باشعور، متوازن اور اپنی ذات سے آگاہی حاصل کر لیں گے۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے بارے میں مکمل آگاہی ہونی چاہیے کیونکہ ہمارا جسم ایک مقدس چیز ہے۔ Meditation کے ذریعے آپ اپنی ذات کے شعور کو جب کائناتی شعور سے

ہم آہنگ کریں گے تو آپ میں ایک عظیم شعور (Superconsciousness) پیدا ہوگا جو زندگی میں آپ کو توانائی دے گا اور آپ کی راہنمائی کرے گا۔

دوسرے مرحلے میں آپ کو اپنے شعوری ذہن کو سمجھنا ہوگا۔ آپ کو بحث اور دلیل والے خیالات سے بچنا ہوگا جو آپ کے شعوری ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں کنٹرول کرنا ہوگا۔ جب تک اس میڈی ٹیشن کے دوران وہ خاموش نہ ہوگا، اسے خاموش کرنا بہت اہم ہے۔

تیسرے آپ کو اپنے لاشعور پر قابو پانا ہوگا جس میں زندگی بھر کے جذباتی اور ذہنی تجربات موجود ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ منفی اور مثبت سوچ کے رویئے جنہوں نے خوشی یا غم پیدا کیا، اگر ہم اپنے لاشعور کی گہرائی میں ایک تجربات کو گزرنے دیں تو ہمیں آگے مرحلے میں آسانی ہوگی۔

چوتھے مرحلے میں جب آپ اپنے گہرے لاشعور یا روحانی ذہن سے آگاہی حاصل کریں گے تو آپ کے اندر ایک حسین اور توازن ہوگا جس میں آپ اپنے وجود، اپنی ذہانت اور جذبات سے آگاہ ہوں گے۔ اس مقام پر آپ کوئی طریقہ اختیار کرلیں۔ آپ کی زندگی میں اطمینان اور سکون پیدا ہوگا۔

بنیادی سکون اور میڈی ٹیشن میں آپ کو ایک خاموش کمرے یا جگہ پر بیٹھنا ہوگا جہاں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ وقت کا انتخاب کرلیں، سیدھے بیٹھ جائیں۔ کمر سیدھی رکھیں، ٹانگوں پر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں رکھیں۔ آنکھیں بند کریں۔ وزن کو محسوس نہ کریں اور جسمانی حواس پر توجہ نہ دیں۔ آپ کے ذہن میں خیالات کی بوچھاڑ آئے گی تاکہ ارتکاز توجہ حاصل ہو۔ آپ آہستہ آہستہ گہرے سانس لیں۔ اپنے سانس کو کچھ دیر اندر رکھیں اور پھر خالی کردیں اور اسے بڑی آہستگی اور نرمی سے دہراتے جائیں۔

آپ خدا سے روحانی تحفظ کی تمنا کریں اور اپنی پسند کی دعا کریں۔ پھر ایک ایسی روشنی کا تصور کریں جو آپ کے دل و دماغ میں داخل ہو رہی ہے۔ یہ روشنی یا شعاعیں آپ کے جسم اور دل و دماغ کو اضطراب اور ٹینشن سے نجات دلوا کر آپ کو پرسکون بنا دے گی۔

پروفیسر صاحب بولے وہ پچاس روحانی مشقوں کا پہلے آپ نے ذکر کیا تھا، وہ مختصراً بتا دیجیے۔

پروفیسر دلاور بولے:

(1) اپنے شعوری ذہن کا کنٹرول کرنا کیونکہ آپ کا شعوری ذہن اکثر دھوکے باز اور جھوٹا ہوتا ہے۔ یہ کوشش کرے گا کہ آپ کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں رہے اور آپ کا مخصوص ذہن (Mindset) تبدیل نہ ہو۔ وقت کے ساتھ آپ شعوری ذہن کی گرفت کم کرتے جائیں گے اور آپ کی اعلیٰ ذاتِ صفات (Higher Self) آپ سے متعارف ہو جائے گی۔

(2) عام زندگی میں عام چکراز (جسم کے جذباتی عضو) اپنی کمتر سطح پر کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے (Chakras) انرجی خارج کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کو کنٹرول کر لیں تو آپ کی توانائی بدن سے خارج نہیں ہوگی۔ اس لیے آپ ان چکراز کو کنٹرول کر کے توانائی کا خزانہ بن سکتے ہیں۔

(3) ایتھرل جسم سے رابطہ پیدا کرنا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے خاکی بدن کو اپنے روحانی بدن سے مربوط کریں۔ یہ (Etheral Body) ہمارے ذہنی اور جذباتی رجحانات سے ملتی ہے۔ ارتکاز سے ہمارے جسم اور جذبات میں روشنی اور ہم آہنگی پیدا ہوگی اور ہمیں سکون حاصل ہوگا۔

(4) اپنے روحانی وجود سے ہم آہنگ ہونا۔ آپ کا روحانی وجود، روشنی اور توانائی سے بھرپور ہوگا۔ اس توانائی کو جب آپ شعوری طور پر محسوس کرتے ہیں اور روزمرہ کے جذبات کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس سے سکون آمیز راحت ملتی ہے اور آپ کو بھرپور زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

(5) اپنی اعلیٰ اور ارفع ذہنی حالت سے ربط کرنا۔ اس (Higher body mind) کا حصول آسان کام نہیں۔ آپ اپنی اعلیٰ اور ارفع قوت سے شناسا ہو گئے تو آپ کو اپنے اوپر بہت اعتماد پیدا ہوگا اور آپ بلندی کی طرف سفر کریں گے۔

(6) چیلنگ کے لیے ارتکاز توجہ (Channeling) دراصل وہ کوشش ہے جو آپ کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے۔ اگر آپ اپنے دماغ کو خاموش کرنے، جس میں ضبط پیدا کرنے اور بے لوث محبت کرنے اور محبت میں ذات کو فنا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپ نے اپنے آپ کو Channelise کر لیا ہے۔

(7) شعوری طور پر چیلنگ کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ آپ کا جسم آپ کی روحانیت کے

آگے ہتھیار نہیں پھینکتا (Surrender) نہیں کرتا۔ آپ کو ارتکاز کے ذریعے جسم سے ہتھیار گروانے ہوں گے۔ (Complete Surrender) کروانا ہوگا۔

(8) موسیقی یا قوال یا ردھم (Rhythm) کے کسی بھی ذریعے سے آپ کی چیلنگ ہو سکتی ہے۔

(9) اسی طرح آپ تحریر کے ذریعے بھی اپنی ذات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ جب آپ بچے تھے تو آپ کا تصور بڑا تیز تھا۔ آپ کا دل چاہتا تھا کہ کوئی افسانہ لکھا جائے۔ شاعری کی جائے، ناول لکھا جائے۔ ارتکاز توجہ آپ کے اندر کے چھپے ہوئے بچے کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتی ہے جو تخلیقی ہے اور جسے آپ کے بڑے پن نے مار ڈالا ہے۔

(10) فنون لطیفہ بھی اپنے آپ کو چینلا ئز (Challanise) کرنے کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔ آرٹ نہ صرف آپ کی روحانی طاقت کا بھرپور اظہار ہے بلکہ دوسروں کو بھی آپ کی طرف کھینچتا ہے۔

(11) روح کے ارتعاش سے ربط پیدا کرنا یعنی Akasthic Records سے رابطہ کرنا۔ یہ ارتعاشی مجموعہ حرکت سے رابطہ آپ کی روح میں ہلچل مچا دیتا ہے اور یہی ارتعاش کائنات میں پھیلی ارتعاش سے ٹکراتا ہے تو آپ کے اندر وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوتا ہے جو کہ رب کائنات نے کائنات میں رکھی ہوئی ہے۔

(12) انہیں ارتعاشی مجموعوں سے ہم آہنگ ہو جانا۔ ایک ہو جانا۔ آپ کو خدا کے قریب لے جائے گا اور آپ کے اندر یکسوئی اور وحدت پیدا ہوگی اور خدا کی وحدانیت کا بھرپور احساس ہوگا۔

(13) ارتکاز توجہ سے ذاتی تجربات اور تاریخی واقعات سے دست بردار ہو جانا۔ آپ کے لیے اپنی عادات کو چھوڑنا بہت ہی مشکل ہے۔ آپ ارتکاز توجہ سے اس عادت کے جبر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ ارتکاز سے آپ کا ذہنی نظام (Mindset) مضبوط اور لچکدار ہو جائے گا اور آپ کی زندگی آسان ہو جائے گی۔

(14) آپ اپنی ذاتی ہسٹری یا پرانے تجربات سے نجات حاصل کر لیں کیونکہ انسانی ذہن ہمیشہ ماضی میں قید رہتا ہے۔ آپ ماضی کے بوجھ کو اتاریں گے چیزوں کو (Unlearn) کرنا سیکھیں گے تو خدا سے لو لگ جائے گی۔

(15) دوسرے سے وصول کرنے کی صلاحیت بہت عظیم ہے۔ ہم میں سے اکثر اپنے خیالات و واقعات لوگوں تک پہنچاتے ہیں مگر لوگوں کے خیالات کو وصول نہیں کرتے۔ بہت بولتے ہیں مگر سنتے بہت کم ہیں۔ ارتکاز آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ آپ اپنی ذات کا احترام (Self respect) پیدا کریں اور وہ پیغام خدا نے آپ کو دیا ہے۔ اسے وصول کریں اور اس پر عمل کریں۔

(16) خدا کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھیں۔ ارتکاز ہمیں سکھاتا ہے۔ آپ خدا کی مرضی، منشا اور قوت ایزدی اور اس کی مرضی میں اپنی مرضی شامل کریں کہ جو میرے خدا نے چاہا ہے، وہی میری رضا ہے اور بندگی کا تقاضا بھی یہی ہے۔

(17) بلند تر شعور اور آگاہی Transcendental Awareness یہ وہ کیفیت ہے جہاں ہم شعور کی بلند ترین سطح پر ہوتے ہیں۔ یہاں ہم مکمل دست بردار ہو جاتے ہیں۔ ہر نفسانی خواہش کو ترک کر دیتے ہیں اور مکمل آگاہی "نروان" سے متاثر ہوتے ہیں۔

(18) اپنے زخموں کو خود ہی بھرنا (Self Healing) ارتکاز خدا کی بے پناہ قوت کا کوئی ذرہ برابر ٹکڑا آپ کی ذات میں نمودار ہو جاتا ہے۔ آپ کا یقین آپ کے اندر ایک تاثیر (Anti suggestion) پیدا کرتا ہے۔ دماغ جو جسم کا پاور سٹیشن ہے، جسم کو حکم دیتا ہے اور آپ کی Healing شروع ہو جاتی ہے۔

(19) خدائی شعار۔ جب جسم اندر کی آواز پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے اور ہمارا عقیدہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ شفا من جانب اللہ ہے، تو آپ کی روحانی قوتیں متحرک ہو جاتی ہیں اور آپ صحت یاب ہونے لگتے ہیں۔

(20) درستگی شفا (Protective healing) یعنی اگر آپ مزید شفا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو انسانی جسم کی ترکیب ہیئتی (Anatomy) کا موازنہ کریں اور شعوری طور پر علم حاصل کریں کہ جسم کے عضو کی کیا فنکشن ہے اور یہ کیسے کام کرتے ہیں۔ دل کیسے دھڑکتا ہے، شریانیں کیسی ہوتی ہیں تو آپ کو اپنے جسم سے آگاہی حاصل ہو جائے گی اور آپ کے لیے شفا (Healing) کرنا آسان ہو جائے گا۔

(21) اپنے اندر کی صفائی کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ (Self Cleansing) ان برے خیالات کو جو ڈپریس اور دوسری بیماریوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ارتکاز کے

ذریعے ہم اپنے اندر کی منفی سفلی اور ہیجانی خیالات کو حرص، ہوس، دولت اور اقتدار کی خواہش کا گلہ گھونٹ کر ہمارے ذات کی صفائی کر سکتے ہیں۔

(22) اسٹریل دنیا کا سفر اور شفا۔ ہمارے اوپر ایک اسٹریل باڈی ہے۔ اگر آپ شعوری طور پر اپنی ذات کو چھوڑ دیں گے۔ اپنے جسم سے لاتعلق ہونا بہت مشکل ہے لیکن اگر آپ نے ایسا کر لیا تو آپ دوسروں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور آپ ان کے ساتھ Share کریں گے اور ان کے زخم بھی مندمل کر دیں گے جو آپ پر یقین کریں گے۔ اگر آپ کی محبوبہ بیمار ہو جائے گی تو آپ کی اسٹریل باڈی اس کو ٹھیک کر دے گی۔

(23) پرانی زندگی کے گناہوں کے خود سے آزاد ہونا۔ ہم سب زندگی میں چھوٹے یا بڑے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ گناہ ہمارے ماضی کا بوجھ بن جاتے ہیں۔ ہماری یادداشت میں نقش ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمارے شعور کا احساسِ ندامت بن جاتے ہیں۔ اسی صورت میں ہمیں ماضی سے باہر آنا ہوگا۔ احساسِ گناہ کی ندامت سے آزاد ہونا ہوگا۔

(24) ہمیں ایتھرل ربنز یا رکاوٹوں کو توڑنا ہوگا (Cut the elteric Ribbons) ہم زندگی کا آغاز ایک بچے کے طور پر کرتے ہیں۔ ہم ایک ماورائی قوت سے منسلک ہوتے ہیں۔ یہ Ruibbon یا باریک سا ناطہ ہمیں ہماری ماں سے منسلک رکھتا ہے۔ جیسے بچہ بڑا ہوتا ہے، وہ اپنے باپ، استاد اور دوسرے لوگوں سے بھی منسلک ہو جاتا ہے۔ یہ جذباتی وابستگی ہمیں دوسروں سے پیوست رکھتی ہے اور یہ وابستگان (Ribbons) ہماری قوت کو جو گزرے ہوئے تجربات سے پیدا ہوتی ہے، ہمارے اندر اور باہر کی طرف منعکس ہوتی رہتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا رویہ اور عادات Behaviour & habits تکلیف دہ ہیں تو ارتکاز توجہ سے ان عادات سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔

(25) رنگ اور موسیقی سے علاج اور سکون کی طلب ہماری ساری ہستی اوشی اور آواز سے تخلیق سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ (Light & sound) ایک متحرک فریکوئنسی ہے جو ہمیں ایک ٹھوس حقیقت کا روپ دیتی ہے۔ جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو یہ متحرک فریکوئنسی (Viberatinal Frequency) ترتیب میں خرابی ہو جاتی ہے۔ آپ میوزک اور

رنگ سے اپنی فریکونسی کو دوبارہ Tune کر سکتے ہیں۔

(26) Obsessions یا کسی خواہش کی بار بار تکرار یا ایک Desire کا بار بار ابھرنا بھی بہت بڑی مصیبت ہے۔ ہم سب زندگی بھر کسی نہ کسی خواہش یا کسی نہ کسی منزل کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں۔ کسی منزل کے لیے سرگرداں رہنا بری بات نہیں ہے لیکن ہم خواہش کی تکرار کے غلام بن جائیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے تمام قوتیں استعمال کریں تو یہ ایک منفی خواہش (Negetive obsession) بن جاتی ہے اور ہماری زندگی کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ ہمیں خواہشات کے منفی اثرات کے بجائے مثبت اثرات پر توجہ دینی چاہیے۔

(27) اپنے اوپر اعتماد پیدا کرنا۔ بعض اوقات ہم اپنے نفس یا انا کو زیادہ تسکین دینے کے لیے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا اظہار کرتے ہیں۔ ارتکاز توجہ آپ کی خود اعتمادی کو قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

(28) ارتکاز آپ کو مستقبل کے سفر کی طرف لے جاتا ہے۔ ہمارے گہرے لاشعور میں ہمیں سب چیزوں کا پتہ ہوتا ہے۔ وہ بھی جو مستقبل آپ سے چھپائے رکھتا ہے۔ آپ کے مستقبل کے بہت سے منصوبے پہلے سے تیار ہوتے ہیں اور وہ آپ کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کب آپ ان پر عمل پیرا ہوں۔ ارتکاز انہی کی مدد کرتی ہے کہ آپ کی آگاہی اور شعور اتنا بلند ہو جائے کہ آپ کی اندرونی صلاحیت بیدار ہو جائے اور آپ مستقبل کو اپنے شعوری ذہن میں دیکھ لیں۔

(29) کرسٹل کے ساتھ ارتکاز توجہ۔ کسی بھی ہیرے (Gemstone) یا قدرتی کلسٹر سے ارتکاز کی صلاحیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہر پتھر اپنی ارتعاش (viberation) کے حساب سے آپ کے درد کا مداوا کرے گا۔ آپ کی تمام اجسام میں تحریک پیدا کرے گا تا کہ آپ منفیت (Negativity) پر قابو پالیں۔

(30) ارتکاز میں مابعد الطبعیاتی ذرائع کا استعمال۔ یہ ذرائع جو استعمال ہو سکتے ہیں مثلاً ٹیرٹ کارڈز (Yarot Cards) پتھر، موم بتیاں اور کوئی بھی اور چیز معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ نہ صرف آسانی اور خود اعتمادی کے لیے مددگار ثابت کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ساتھ مخلص ہو جائیں تو شعور حاصل کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

(31) ارتکاز کا خاموشی میں سفر (Journey into Silence) کا مطلب ہے۔ بعض اوقات ہم جتنا بھی چاہیں کہ ذہن کو خاموش (Still) کریں لیکن خیالات کی ایک یلغار ہمارے شعوری ذہن کو مرکزی نقطے (Focus) سے ہٹا دیتی ہے۔ ارتکاز ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے اور سوچ کی یلغار کو کم سے کم کرنے میں مدد دیتا ہے اور خاموشی اور مکمل خاموشی جب ذہن میں پیدا ہو جائے تو آدمی بدھا بن جاتا ہے۔

(32) ارتکاز توجہ سے اپنے لمس کو ترقی دینا (Psycholometry) ہماری قوت لمس (Sense of Touch) کو مضبوط کرتی ہے۔ ہم زندگی بھر چیزوں اور انسانوں کو چھوتے ہیں اور لمس کی قوت پیار اور جنسی عمل میں طاقت رول ادا کرتی ہے۔ اگر ہمیں لمس کے استعمال کی مہارت ہو جائے تو بقول فیض:

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

اس لمس کے ترقی یافتہ ہونے سے آپ اپنی اور دوسرے کے احساسات (Feelings) سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اس سے رابطہ (Communication) بہت بہتر ہو جاتی ہے اور زندگی کی کوالٹی بہتر ہو جاتی ہے۔ اس ارتکاز میں خوف سے بچیں کیونکہ خوف آپ کے اندر ایک اذیت پیدا کرتا ہے۔ آپ اپنا رویہ اس بچے کا سا رکھیں جو کھیل کھیل میں کچھ دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

(33) اپنے روحانی وجود کی قوتِ سماعت (Clairauduience) کی ترقی دینا ارتکاز کے لیے اہم ضرورت ہے۔ جیسا کہ ہم سب روحیں ہیں یا روحانی وجود رکھتے ہیں تو وہ روح ہمارے گوشت پوست کے جسم میں قید ہے یا قیام پذیر ہے۔ ہم سب اس قابل ہیں کہ اپنے پانچ حواس خمسہ (Five Senses) سے رابطہ قائم کر سکیں اور شعوری طور پر حواس خمسہ کے استعمال سے ہم ایک اعلیٰ ذوق سماعت پیدا کر سکتے ہیں۔ خوبصورت قرأت، مدھم سُروں کی موسیقی (Rine & Rhythm) موسیقی سحر انگیز ہے۔ مدہوش کن ہے۔ لحن داؤدی پیغمبرانہ صرف ہے۔ ہزاروں راگ راگنیاں، سات سُر اور سُروں کا ملاپ، Rhythm اور ترتیب۔ موسیقی بذات خود علم کا گہرا سمندر ہے۔ آلاتِ موسیقی بھی جادو بکھیرتے ہیں۔ بانسری سے لے کر جدید ترین آرکسٹرا موسیقی کو

نئی جہتیں عطا کرتے ہیں۔ عظیم موسیقاروں اور سنگرز نے تمام میں عوامی مقبولیت کے ریکارڈ توڑے ہیں۔ آخر وہ کیا چیز ہے جو ہمیں موسیقی کی طرف دیوانہ وار کھینچتی ہے۔ یہ ہماری روح کی غذا ہے۔ روح موسیقی سے جذب وکیف اور مستی کے عالم میں آجاتی ہے۔ تیز مغربی موسیقی جو بہت تیز آواز میں سنائی جاتی ہے، انسان پر ایک اور طرح کا اثر ڈالتی ہے۔ تیز آرکسٹرا جسم میں ہیجان اور اضطراب پیدا کرتا ہے اور تیز دھنوں پر انسانی جسم تھرکنے لگتا ہے۔ اس سے جنسی جذبات کو تسکین ملتی ہے۔ مدھم روشنی اور ڈسکو کلب میں تیز موسیقی، انسان ایک پراسرار ماحول تخلیق کرتا ہے۔ جہاں رقص اور موسیقی باہم ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اپنے اندر وجود اور کیف کی مسرت پیدا کرنے میں قوالی میں آواز اور آلات موسیقی کا آہنگ وجود کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور ہم اپنے آپ سے جدا ہو کر انہی مدھم سُروں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لذتِ سماعت پر پوری ایک انڈسٹری کام کر رہی ہے۔ ذاکر، علما، مقرر الفاظ سے ہمیں رلا بھی دیتے ہیں، ہنسا بھی دیتے ہیں۔ صرف یہ الفاظ جب سماعت سے ٹکراتے ہیں تو روح کی تاروں کو ہلا دیتے ہیں۔ ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' یہ بہت بڑی Fallacy ہے لیکن سننے والا عقل وخرد سے بیگانہ ہو کر انہی الفاظ کے دام میں اسی جملے کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

(34) ارتکازِ توجہ آپ کی قوتِ شامہ اور قوتِ ذائقہ (Sense of Smell & taste) بہت بڑی صلاحیتیں ہیں۔ اگر آپ کی قوتِ ذائقہ بہتر ہو جائے تو آپ اچھی اور فائدہ مند خوراک کھائیں گے۔ لذیذ کھانا ہم سب کی کمزوری ہے۔ ہر آدمی اچھے ذائقے کی تلاش میں ہے اور اچھی اور ذائقہ دار خوراک ہمارے جسم کے لیے بہت ضروری ہے۔ ذائقے سے ہماری خوبصورت یادیں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہماری قوتِ شامہ (Sense of Smell) بھی اہمیت کی حامل ہے۔ خوشبویات ہماری قوتِ شائمہ کی طلب ہیں۔ ہزاروں قسم کے پرفیومز، کولونز اور ٹیلکم پاؤڈر اور عطریات ہماری روح اور دل ودماغ پر خوشگوار اثر لاتے ہیں۔ ہمیں ایک راحت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارا (aura) اس سے خوش ہوتا ہے۔

(35) اسٹرل دنیا کا سفر (Journey into Astral) دراصل نیند میں ہماری روح

میں چلی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ شعوری دماغ نامعلوم Astral planes مقامات سے خوفزدہ ہے اور کوئی بھی غیر معمولی سرگری کو مسترد کردے گا جو آپ نے اسٹریل کے سفر میں کی ہوگی۔ مراقبہ اس سفر کو آسان کردے گا۔

(36) اپنے اندر ایک نئے انسان کی تلاش۔ مراقبہ سے (Rebirthing yourself) آپ ہی محمود آگاہی زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ آخر آپ کا روحانی وجود آپ کے پست وجود کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے وہ پستی سے بلندی کے سفر کو آسان کر سکتا ہے۔ جیسے کے حقیقی پیدائش میں مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نئے جنم میں کسی روحانی راہبر اور راہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ مراقبہ تب بھی آپ کی مدد کرے گا جب آپ ایک جنم کی تلاش میں ہوں گے۔

(37) مراقبہ سے صدمے اور خوف پر قابو پانا۔ آپ مراقبہ کے ذریعے دونوں کیفیتوں پر قابو پا سکتے ہیں جس کا ہر انسان کو کئی مرتبہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر انسان مکمل طور پر ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہمارے صدمے اور خوف کی کیفیت میں اضافہ ہو جاتا ہے (Fear Syndrome) زندگی کا سب سے بڑا قاتل ہے۔ یہ اندر سے آپ کو ہلاک کرتا ہے اور صدمے سے دوچار کر دیتا ہے۔ ہم سنبھل نہیں پاتے۔ اگر ہم صدمے اور خوف کو مٹا دیں جو ہماری یادداشت (Neuro mascular memory) پر نقش ہو چکا ہے اور آپ کی جان نہیں چھوڑ رہا۔ آپ مراقبہ کی مدد سے اس نقش کو اپنی یادداشت سے مٹا کر دوبارہ خوش و خرم زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

(38) پیدائشی خوف یا روح کے خوف سے نجات پانا۔ ہمارے (soul Fears) پیدائشی ہوتے ہیں اور یہ خوف ضروری ہوتے ہیں تاکہ پناہ کے لیے آپ خدائے واحد کی طرف متوجہ ہوں۔ روح کے جو پانچ خوف ہیں، جس میں نامعلوم کا خوف (Fear of the unknown) سب سے زیادہ طاقتور ہے اور پانچ خوف یہ ہیں۔ کامیابی کا خوف (Fear of Ascension) ناکامی کا خوف (Fear of Descending) علیحدگی یا تنہائی کا خوف۔ ذمہ داریوں کا خوف۔ (the fear of Assinmilation) خدا سے بے لوث محبت کا خوف کہ میری عبادات اور اطاعت قبول ہوگی یا نہیں ہوگی۔ مراقبہ ان سب خوف کی کیفیتوں پر قابو پانے میں آپ کی مدد

کرے گا۔

(39) جذبات کا سامنا کرنے کی صلاحیت۔ دنیا میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ پہلے وہ لوگ جو صرف اپنے دماغ میں رہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو اپنے جذبات میں رہتے ہیں اور تیسرے وہ لوگ جو ان دونوں میں رہتے ہیں۔ دماغ میں بھی اور جذبات میں بھی۔ آپ کی روزمرہ زندگی میں عادات کا تجربہ کو غلط (Role model) سے حاصل ہو جاتا ہے، وہ آپ کے اندر رکاوٹیں پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے جس سے آپ اپنا تحفظ اور بچاؤ کر سکتے ہیں۔ مراقبہ ان رکاوٹوں (barriers) کو دور کر دیتا ہے اور آپ کو آپ کے اندر کے سچے احساسات سے روشناس کرواتا ہے۔

(40) اپنے حقیقی وجود کا سامنا کرنا (Facing the real self) کبھی کبھی ہمارے اندر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم آخر کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں زندہ ہیں؟ کیا اس زندگی کا کوئی مقصد ہے؟ مراقبہ آپ کے لاشعور کی گہرائیوں میں جا کر ان سوالات کے جواب ڈھونڈتا ہے جو دراصل گہرے شعور یا اندرونی وجود (Real self) میں ہی موجود ہوتے ہیں۔ کہیں باہر سے تلاش نہیں کرنے پڑتے۔

(41) بغیر شرائط کے بے لوث محبت (Unconditional Love) ہر آدمی کے اندر ایک پیدائشی خواہش ہے کہ وہ بے لوث محبت کو تلاش کرے۔ وہ یہ محبت اپنے والدین سے، اپنے دوستوں اور سب سے زیادہ اپنی محبوب عورت سے اس کا طلبگار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خدا سے بھی محبت کا طلبگار ہوتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو بے غرض اور بے لوث محبت سے شناسائی حاصل ہوتی ہے ورنہ عام طور پر محبت ہمیشہ مشروط ہوتی ہے۔ محبت، اسی سے زیادہ محبت کی طلبگار ہوتی ہے۔ چاہنا اس شرط کے ساتھ کہ مجھے بھی چاہا جائے تو مشروط ہوگی۔ بے لوث محبت تو یکطرفہ ہے۔ جس سے بھی محبت کرتے ہو، بس کیے جاؤ۔ اسے پابند نہ کرو کہ وہ بھی تم سے محبت کرے۔

(42) خدائے واحد سے محبت۔ آپ کی ذات بھی ایک وحدت ہے اور خدا کی ذات بھی ایک مکمل وحدت ہے۔ (One ness) ہے۔ جب وحدت کا ایک وجود اپنے واحد خدا سے محبت کرتا ہے تو دوئی نہیں یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔ ایک ربط باہم جنم لیتا ہے جو زندگی میں ہمارا اثاثہ ہوتا ہے اور ہماری راہنمائی کرتا ہے۔

(43) گزری ہوئی زندگی یعنی ماضی کا پچھتاوا۔(Past life Regression) ایک دور میں ہم سب حیران ہوتے ہیں کہ کیا ہم ماضی میں زندہ رہے ہیں۔ ہمارا تصور یا تخیل ہمیں بہت سے واقعات جو تاریخ میں گزر چکے ہیں، ہمیں یاد دلائے گا۔ جیسے ان واقعات کے رونما ہونے پر ہم وہاں موجود تھے۔ ہمارے جذبات ہمیں واضح احساس دلاتے ہیں اور ہمارا رشتہ اس وقت سے جوڑ دیتے ہیں اور ہمارا ذہن فوراً ان وجوہات کو تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ان معلومات کو دیکھتے ہوئے تو ہمیں اس زندگی میں ماضی کے متعلق معلوم ہوئی ہیں، ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ صرف اس لیے تاکہ ہمارے اندر کا تالا (Lock) کھل جائے اور حقیقی شعور حاصل ہو جائے۔ پہلے یہ کم درجے کا ہو سکتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ طاقتور ہو جائے گا اور لاشعور سے شعور میں آ جائے گا اور گہرا شعوری دماغ آپ کے منفی رجحانات کو سب سے پہلے ختم کرے گا۔ وہ منفی رجحانات پھر بھی آپ کی زندگی میں باقی رہیں گے مگر ہمیں اپنی زندگی میں مثبت پہلوؤں کو غالب کرنا ہوگا۔

(44) محفوظ مقام کی تلاش۔ ہر انسان محفوظ مقام کی تلاش میں ہے جہاں اسے تحفظ حاصل ہو۔ وہ دکھوں سے محفوظ رہے۔ جو لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں یا زندگی میں آپ کے مقام کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مراقبہ ہمیں یہ قوت عطا کرتا ہے کہ آپ نئی امید، نئے جذبہ اور نئی سمت کے ساتھ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

(45) پریوں کی دنیا کو محسوس کرنا۔ بچے پریوں اور ایسی چھوٹی مخلوق یعنی Eeins, goins (gnomes) میں یقین رکھتے ہیں لیکن بہت ہی کم انہیں دیکھ پاتے ہیں۔ بڑے کہتے ہیں، پریوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا (Fairy False) محض خوبصورت کہانیاں ہوتی ہیں۔ مراقبہ کا مقصد آپ کو یقین دلاتا ہے کہ وہ حقیقتاً موجود ہوتی ہیں لیکن آپ کو مکمل شانت، پرسکون (Seren state) میں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ایک تصوراتی دنیا کا تصور کیجیے جو کہ ماورائی ہے۔ غیر مرئی مخلوق کا تصور پختہ کیجیے۔ اس سے آپ کو فرشتوں اور جنت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور آپ کا تخیل پختہ ہو جائے گا۔

(46) زمین، ہوا، آگ اور پانی کا مراقبہ۔ کیونکہ ہم ان قدرتی عناصر اور قوتوں کے درمیان گھرے ہوتے ہیں، ہم بہت کم اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ یہ قوتیں ہم پر حاوی

ہیں اور ہمیں بہت سے سبق سکھاتی ہیں۔ تیز آندھیاں، سمندری طوفان، زلزلے اور آگ لگنے کی تباہیاں ہمارے خوف کا حصہ ہیں۔ مراقبہ ان حقیقتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو آفاقی آفات ہیں۔ ان کے خلاف صرف احتیاطی تدابیر اور حفاظتی انتظامات کیے جا سکتے ہیں۔ ان کو روکا نہیں جا سکتا۔ یہیں سے خدائے کائنات کا تصور ابھرتا ہے جو کامل قدرت ہے اور اس زمین کو تہہ و بالا کر سکتا ہے۔ ہر تقدیر کا مالک ہے۔ کائنات کا مالک ہے۔

(47) اندرونی آنکھ کا بیدار ہونا (Opening of inner eye) بہت سے لوگ اپنی تیسری آنکھ چکڑا کو بیدار کر لیتے ہیں جو دونوں آنکھوں کے درمیان ہوتی ہے۔ آپ کے Perception کو تین سمتی (Three dimensional) کر دیتی ہے۔ دراصل تیسری آنکھ کی صلاحیت ہمیں وہ چیزیں دکھا دیتی ہے جو دراصل موجود نہیں ہوتیں۔ تیسری آنکھ کو دیکھنے کی بصیرت دوسرے انسان کے دماغ کو پڑھ لیتی ہے۔ اس کی اندرونی کیفیات سے آگاہ ہو جاتی ہے اور دل کے احوال بتانا شروع کر دیتی ہے۔

(48) اپنی ذات کا بھرپور اظہار کرنا (Express full self) کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پانچوں حواس اپنے جوبن پر کام کر رہے ہوں گے تو آپ کی زندگی بھرپور لذت اور توانائی سے بہرہ ور ہوگی۔ آپ ایک بھرپور زندگی جئیں گے۔ آپ کو اپنے جسمانی وجود کے لیے اپنے دماغی یا شعوری وجود کی مکمل مدد درکار ہوگی تاکہ روحانی اور شعوری رابطہ مضبوط ہو جائے اور وہ عقلِ اعلیٰ (Inner wisdom) بحال ہو جائے جو اعلیٰ جسمانی دماغ (Higher mind body) سے حاصل ہوتی ہے۔ جب ان سب عناصر میں یکسوئی (alignment) پیدا ہوتی ہے جو آپ کے اندر قدرتی اور فطرتی خواہش پیدا ہو جائے گی کہ ہر چیز یا شخص سے بے لوث محبت کی جائے۔

(49) دوسری دنیاؤں کا سفر (Journey to other worlds) سے مراد یہ ہے کہ بہت سے لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس زمین پر ہم ایک مخلوق نہیں ہیں بلکہ اور مخلوق بھی آباد ہے جو اپنی طاقت اور قدرت میں ہم سے کہیں طاقتور ہے۔ ہمیں اپنی Astral body کو ان جگہوں پر لے جائیں جہاں جسمانی طور پر جانا ناممکن ہے۔ بدقسمتی سے اس پہلو پر ابھی زیادہ ریسرچ نہیں ہوئی۔ آپ صلاحیت حاصل کر لیں تو آپ اپنے

جسم سے باہر نکل کر بہت دور تک سفر کر سکتے ہیں۔ آپ کے روحانی وجود کو پتہ ہے کہ آپ نے کہاں جانا ہے۔ اگر آپ کو یقین ہے تو سب کچھ ممکن ہو جائے گا۔

(50) اپنی روحانی صلاحیت کو زیادہ بڑا اور طاقتور بنانا (Increase the size & power of your spirit body) روحانی وجود کو طاقتور بنانا اور بڑا کرنا بہت ضروری ہے۔ جب ہم چھوٹے بچے ہوتے ہیں تو ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ آپ چھوٹے ہیں اور آپ کے جسم کی طرح آپ کی روح بھی بہت چھوٹی ہے۔ جب ہم جسمانی طور پر بڑے ہو جاتے ہیں تو ہمارا لاشعور ہمارے روحانی وجود کے بڑا ہونے کو نہیں مانتا۔ مراقبہ ہمیں بتلاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کا روحانی وجود بہت طاقتور ہوتا جاتا ہے۔ ہماری روحانی صلاحیتیں زیادہ متحرک ہو جاتی ہیں اور جب بڑھاپے میں ہماری جسمانی جبلتیں (Instincts) کمزور پڑ جاتی ہیں تو ہمارا روحانی وجود زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔

پروفیسر زبیر بولے "یہ ساری روحانی مراقبے کی مشقیں آپ نے کہاں سے سیکھی ہیں۔ آپ کے پاس اس کا ماخذ کیا ہے؟"

پروفیسر دلاور دھیرے سے بولے "یہ ساری مراقبہ کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان مشقوں کی تفصیل ڈاکٹر مارگریٹ راجر وان کوپس کی کتاب "روحانی طاقتور مراقبے" سے لی گئی ہیں جو ہماری زندگی کو خوب سے خوب تر بنا سکتی ہیں لیکن سب سے اہم بات ہے "اسی لمحے میں رہنا" جب آپ میری بات سن رہے ہیں تو آپ کو ذہنی طور پر یہیں اور میرے ساتھ ہونا چاہیے۔ ذہن ہمیشہ ماضی یا مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے لیکن ہمیں اسی ایک لمحے میں زندہ رہنا ہے۔ اگر آپ اس لمحے میں زندہ نہیں رہتے تو آپ زندگی سے انصاف نہیں کر رہے یعنی اگر آپ اپنا پسندیدہ کھانا کھا رہے ہوں جو بڑی مشکلوں سے ملا ہے اور آپ کا ذہن کہیں غیر حاضر ہے۔ غیر حاضر ذہن ہمیشہ پریشانیوں کی طرف جھکتا ہے۔ اگر آپ ایسی ذہنی حالت میں کھانا کھائیں گے تو آپ کو کھانے میں کوئی مزا نہیں آئے گا بلکہ الٹا یہ آپ کے معدے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اب اسی کھانے کو آپ دماغی طور پر حاضر ہو کر کھائیں تو یہ کتنا فرق ہوگا۔ کوئی بھی پسندیدہ اور جبلتی کام کرتے وقت بہت سے لوگ یہی غلطی کر رہے ہوتے ہیں۔

گفتگو کے دوران بھی اگر آپ کا دماغ غیر حاضر ہے تو آپ کو بات سمجھ نہیں آئے گی

اور دوسرا آدمی محسوس کرے گا کہ آپ اس کی بات توجہ سے نہیں سن رہے۔ اس لیے تو ہر شاعر اور مقرر سامعین سے بار بار کہتا ہے، توجہ چاہیے، توجہ چاہیے۔ سیانے کہتے ہیں کہ آدمی نہ اچھا بولنے والا ہوتا ہے، نہ اچھا سننے والا۔ دماغی طور پر غیر حاضر رہنے والا شخص نہ اچھا سننے والا ہوتا ہے نہ اچھا بولنے والا کیونکہ اچھے بولنے والے کو دوسروں کی بات سننی بھی آنی چاہیے اور دوسرے کی بات میں دلچسپی لینی بھی آنی چاہیے۔ چاہے وہ کوئی غیر دلچسپ بات یا موضوع ہی بول رہا ہو۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ کسی خوشگوار لمحے یا واقعے کو سوچ کر خوشی اور توانائی محسوس کرتا ہے اور اگر وہیں بیٹھے بیٹھے کسی پریشان چیز یا موقع کا سوچے تو اداس اور ڈپریس ہو جاتا ہے۔

زیادہ تر لوگ خوش باتیں اور توانائی سے بھرپور لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ اداس بندے سے بات کر کے ہر کوئی خود کو اداس محسوس کرتا ہے۔ توانائی کی حالت میں ہی انسان اچھے موڈ میں ہوتا ہے۔ ذہنی طور پر غیر حاضر لوگوں کو بہت سے اور مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر فرار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ماضی کی یادوں میں پناہ لیتے ہیں۔

لمحہ موجود میں زندہ رہنا بہت ضروری ہے جو اس وقت موجود ہو، اس سے لطف اندوز ہوں۔ کل کی فکر نہ کریں۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ مستقبل کی فکر میں ہی مرے جاتے ہیں اور اس فکر میں آج کو بھول رہے ہیں۔ آج سے لطف اندوز نہیں ہو رہے۔ یہ ایک طرح کی ناشکری ہے اور خدا کو ناشکری پسند نہیں۔ اس چیز کی کیا گارنٹی ہے کہ کل بھی اچھا ہو گا۔ اس لیے آج ہی خوش ہوں۔

آپ آج کو اچھا بنائیے، کل کی فکر کل خود کرے گا۔ ایک محاورہ ہے، کل کس نے دیکھا ہے؟ جو لوگ بات چیت میں دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے، وہ نہیں جان سکتے کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے خیالات و جذبات کیا ہیں۔ ہر بڑا اور ذہین آدمی گفتگو کے دوران Eye Contact قائم رکھتا ہے۔ ہر کام میں جلدی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ عجلت میں کام کرنے سے غلطی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے ہر کام دھیرج سے کرنا چاہیے۔ محفوظ طریقے سے بغیر کسی جذباتی ہلچل کے۔ سکون اور قرار کے ساتھ اور یہ آپ کی سوچ اور دیکھنے کا زاویہ ہے جو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ زندگی بھرپور انداز میں شکر سے دیکھنا چاہیے۔ ناشکری خدا کو بہت ناپسند ہے۔ ناشکرے کا رزق کم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمت کا انکار کرتا ہے اور خدا کی

ناراضگی مول لیتا ہے۔

یہ گلاس میں آدھے بھرے ہوئے پانی والی بات ہے۔ ایک منفی سوچ والے آدمی کو گلاس خالی نظر آئے گا کیونکہ وہ صرف خالی والے حصے کو دیکھ رہا ہوگا جبکہ ایک مثبت سوچنے والا بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ رہا ہوگا تو اسے بہت کچھ مثبت نظر آئے گا اور پورا گلاس بھرا ہوا نظر آئے گا۔ ہمیں صرف بھرے ہوئے گلاس کو دیکھنا چاہیے اور شکر ادا کرنا چاہیے۔"

رابعہ جو بہت دیر سے توجہ کے ساتھ یہ باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ روزمرہ کی زندگی میں ہم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد نہیں رکھتے اور بلاوجہ غم پال لیتے ہیں۔ ان کو غذا دیتے ہیں۔ اچھی یادوں کو اچھے دنوں کو بھول جاتے ہیں اور برے دنوں کی ایک البم بنا کر سب کو اپنے دکھ بھرے واقعات سناتے ہیں تاکہ ان کی ہمدردی حاصل کر سکیں۔ وہ حیران تھی کہ ہم اپنی خوشی شیئر نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے ساتھ دکھ ہی شیئر کرتے ہیں تاکہ وہ بھی دکھی ہو جائیں۔ اس نے ندیم کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ یہ گفتگو سن کر بور ہو رہا تھا۔ اتنے میں زبیر صاحب بولے" مجھے تمہارے چہروں سے پتہ چلتا ہے کہ تم ان دانائی کی باتوں سے بور ہو گئے ہو۔ اگر پسند کرو تو باہر لان میں تازہ ہوا میں چہل قدمی کر لو۔" سب نے اصرار کیا تو وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ لان میں ہلکی سی خنکی تھی اور رات کے اندھیرے نے ماحول کو پراسرار بنا دیا تھا۔ ندیم نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا:

"رابعہ اس دن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ Have you prepared your mind۔ کچھ تو بتاؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔ Just tell me Yes or No."

رابعہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا" میرے پاس چوائس بہت محدود ہے۔ محبت میں Yes or No نہیں ہوتا۔ محبت میں کبھی Yes کا مطلب No ہوتا ہے اور کبھی No کا مطلب Yes۔ انکار میں اقرار ہوتا ہے تو اقرار میں انکار۔ یہ سمجھنے والے میں صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ بن کہے سمجھ جائے کہ حقیقت کیا ہے۔"

"رابعہ میری بات سنو۔" ندیم نے اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا" میری طرف غور سے دیکھو۔ تمہاری آنکھوں میں ہاں یا ناں تحریر ہوگی اور میں اسے پڑھ لوں گا۔" لیکن Eye Contact کے بعد بھی وہ نہ سمجھ پایا۔ تاثرات بھی کچھ نہ سمجھا سکے۔ رابعہ کے جذبات کی سطح بہت گہری تھی۔ بہت پاتال میں تھی اور ندیم کے لیے اتنی گہرائی میں جا کر صدف آرزو کو تلاش کرنا

بہت مشکل تھا۔ وہ بے بس نظر آیا اور پیچھے ہٹ کر بولا:

''مجھے تو کچھ بھائی نہیں دیتا۔ سیاہ رات میں جگنو ٹمٹماتا ہے، پھر بجھ جاتا ہے۔ روشنی کی کرن پھوٹتی ہے۔ پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تم نے محبت کا اقرار کیا ہے۔ شادی کا اقرار نہیں کیا۔''

رابعہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔ گہری آزمائش، ٹھوس حقیقتوں کا دیوتا ڈراتا تھا۔ بہت فاصلہ طے نہیں کر پاتی تھی کہ عقل کی بات مانے جو حقیقت کی دلیل تھی یا عشق کی فریاد سنے جو خواہشات بن کر دور کی آواز بن گئی تھیں۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور اپنے منہ کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ کچھ دیر ایک جان لیوا سکوت طاری رہا۔ دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ شاید الفاظ ختم ہو گئے تھے اور خاموشی کو زبان مل گئی تھی۔ اتنے میں رابعہ کی ہلکی سسکیوں نے ماحول کو قدرے سوگوار کر دیا۔ ندیم نے پریشان ہو کر دیکھا۔ رابعہ خاموش تھی جیسا فراز کے اس شعر کی تصویر بن گئی ہو:

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

رابعہ کے باطن میں واقعی ایک خواہش رو رہی تھی جو پوری ہوتی نظر نہیں آئی تھی۔ اسے معلوم تھا، ندیم کا باپ اور اس کی امریکی ماں اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے۔ وہ جانتی تھی ندیم کا محبت کا دریا جلد اتر جائے گا۔ وہ نامرادی کے صحرا میں بے چین روح بن کر بھٹکتی رہے گی۔ سسکتی رہے گی۔ ٹھکرائے جانے (Rejection) ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ راندۂ درگاہ ہونے کا احساس ایک احساسِ محرومی کو جنم دیتا ہے اور محرومی کا احساس کمتری میں تبدیل ہو کر عزتِ نفس کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ رابعہ کے پاس اور کیا تھا ایک عزتِ نفس (Self Respect) ہی تو تھی وہ اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی۔ پامال ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ بت کی طرح ساکت ہو گئی۔

اُدھر دلاور صاحب بول رہے تھے'' آپ نے پوچھا تھا کہ دنیا کی بہترین کتابیں کون کون سی ہیں۔ میں آپ کو مصنف اور کتاب کا نام بتا دوں گا۔ ان کتابوں نے انسانی سوچ کا رخ موڑ دیا اور انقلابات کا پیش خیمہ بنیں۔

1) میکاولی کی کتاب "The Prince" جو حکمرانی کے طریقے بتاتی ہے اور انسانوں کو غلام رکھنے کے لیے نفسیاتی گر سکھلاتی ہے۔ اس لیے میکاولی کو (Evil Genius) قرار دیا گیا۔

2) ٹامس پین کی کتاب "عقل سلیم" ٹامس پین نے امریکہ پہنچ کر بڑی محنت سے یہ کتاب لکھی۔ عقل سلیم آزادی کی داستان ہے۔ امریکی دستور سازوں اور جارج واشنگٹن کو اس کتاب کی افادیت اور فکر حریت کو بہت متاثر کیا۔ سر جارج ٹریویلین لکھتا ہے "انسان کی مرتب کی ہوئی کسی دوسری کتاب کا نام لینا مشکل ہے جس کا اثر اس درجہ فوری اس قدر وسیع اور اتنا پائیدار ہوا ہو۔"

3) ایڈیم سمتھ کی کتاب "ثروت اقوام" (Wealth of the nations) نے بھی تاریخ ساز حیثیت حاصل کی۔ سمتھ نے اسی اصول کو بنیاد بنایا ہے جو میکاولی نے پیش کیا تھا یعنی ہر انسان درحقیقت اپنے ذاتی مفاد کی خاطر حرکت میں آتا ہے۔ دولت کی خواہش ذاتی مفاد کا صرف ایک مظہر ہے۔ ذاتی محرکات وجذبات عالم انسان کی بہت سرگرمیوں کا پس منظر ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ افراد کی خودغرضی معاشرے کے بہبود کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ انگلستان کے مشہور عالم ماہر اقتصادیات اے آر بیریٹ نے لکھا ہے: "ہمارے زمانے میں غالباً کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس نے اپنے زمانے میں سائنٹفک اقتصادی فکر اور علمی انتظامات دونوں پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو۔ جتنا (ثروت اقوام) نے ڈالا ہے اور وجوہ موجود ہیں کیونکہ اب تک بدستور چلی آرہی ہیں۔"

4) ٹامس مالتھ کی کتاب "اصول آبادی" ایک عظیم کتاب ہے۔ مالتھس نے ابتدا میں دو بنیادی نظریے پیش کیے تھے کہ انسان کی بقا کے لیے خوراک ضروری ہے اور انسان کی فطرت میں جنسی میلان ناگزیر ہے اور یہ ہمیشہ اپنی حالت میں موجود رہے گا۔ اس کے خیال میں انسان کی خوش بختی آبادی کی کمی یا زیادتی یا افلاس و دولت یا جوانی اور بڑھاپے میں موقوف نہیں یا انحصار نہیں کرتی بلکہ آبادی اور خوراک پر منحصر ہے۔

5) کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" (Das Capita) یہ مشہور زمانہ کتاب مارکس "جدلی مادیت" Dialetic Meterialism کا قائل تھا۔ یہ نظریہ اس نے ہم وطن فلسفی ہیگل سے لیا تھا۔ مارکس نے تاریخی مادہ نظریہ پیش کیا۔ "مارکس اور اینجلز" کا نظریہ ہے کہ موجودہ معاشروں کی تاریخ دراصل طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔ آزاد اور غلام، امیر اور غریب، کارخانہ دار اور مزدور، ظالم اور مظلوم سب ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کے درمیان مسلسل جنگ جاری رہے گی۔

6) ہٹلر کی کتاب ''میری جدوجہد'' یہ کتاب بڑا بننے کے خبط کی داستان ہے۔ ہٹلر کے بلند پرواز ارادوں نے جو اپنے لیے طریقے تجویز کیے وہ تین تھے۔ پہلا پروپیگنڈا، دوئم ڈپلومیسی، سوم بے رحم قوت کا استعمال۔ ''میری جدوجہد'' بے شمار منفی تصورات اور خامیوں کے باوجود اس کے بدترین نقاد ہندرک نے کہا ''تمام زمانوں کی ایک نہایت غیر معمولی تاریخ دستاویز ہے جس میں چنگیز، چیک روسو اور عہد نامہ قدیم کے کسی نبی کا قصہ جمع کر دیے گئے ہیں اور ایک نقاد نارمن کوزنس کہتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کی سب سے زیادہ موثر کتاب ہے۔ اس کتاب کے ایک ایک لفظ کے لیے سوا سو جانیں ضائع ہوئیں۔ اس کتاب کے ہر صفحے نے چار ہزار سات سو نفوس کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس کے ہر باب کے لیے بارہ لاکھ جانیں قربان ہوئیں۔''

7) سائنس کی دنیا میں کوپرنیکس کی کتاب ''دورہ احرام فلکی'' کوپر نے اپنا ایک تصور کائنات پیش کیا۔ فاصلے کے لحاظ سے فلک سب سے زیادہ دور ہے۔ اس کے اندر سب کچھ موجود ہے، اس لیے غیر متحرک ہے۔

8) ہاروے کی کتاب ''دوران خون'' یہ طبی تحقیق کی طبع اول ہے۔ ہاروے نے جانوروں پر بے شمار تجربات کے بعد یہ معلوم کر لیا کہ دل سکڑتا ہے تو اندر کا خون باہر پھینکتا ہے۔ دل کے سکڑتے ہی سرخ رنگ کی رگیں خون لینے کے لیے کھل جاتی ہیں۔ دل ایک پٹھا ہے جو پمپ کی طرح کام کرتا ہے۔ خون رگوں میں پہنچتا ہے تو نبض چلتی ہے۔

9) نیوٹن کی کتاب ''اصول ریاضیات'' بہت مشہور کتاب ہے۔ آئن سٹائن نے نیوٹن کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ قابل تحسین ہے'' اس نے کہا، کائنات آئزک نیوٹن کے لیے ایک کھلی کتاب تھی۔ اس کے حروف وہ کسی خاص کوشش کے بغیر پڑھ سکتا تھا۔ وہ ایک شخص تھا جس میں مختلف شخصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔

10) ڈارون کی کتاب ''اصل انواع'' Origin of Species بھی ایک مشہور اور خوبصورت کتاب ہے۔ ڈارون نے حیاتیات پر بہت کام کیا اور ساری عمر حیاتیاتی حقیقت کو تلاش کرنے میں گزار دی۔ جب اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ ڈارون کے کام نے نسل انسانی کے تمام خطوط پر جو وسیع اثر ڈالا ہے، خصوصاً حیاتیات اور نفسیات پر تو آدمی اس نتیجے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ڈارون کو انیسویں صدی کے بارآور

مفکروں میں سب سے اونچی جگہ ملنی چاہیے۔

11) فرائیڈ کی کتاب "تعبیر خواب" Analysis of dreams عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ علم کی تمام شاخوں میں سے نفسیات سب سے پر اسرار اور مبہم علم ہے۔ فرائیڈ نے تحلیل نفسی کو متعارف کروایا۔ فرائیڈ نے نفسی قوت کا نظریہ بھی پیش کیا۔ Psycholo Analyios جس کی حیثیت حقیقی معنوں میں جنسی ہے۔ ولفرڈ اور رسوسلر کی رائے بہت اہم ہے۔ "ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ایک سو سال گزر جانے کے بعد فرائیڈ بھی کوپرنکس اور نیوٹن کی طرح ان افراد میں شامل ہو جائے گا جنہوں نے فکر کے لیے نئی راہیں کھولیں۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ ہمارے عہد میں کسی انسان نے فرائیڈ کے برابر انسانی قلب واعمال پر روشنی نہیں ڈالی۔"

12) آئن سٹائن کا "نظریہ اضافیت" آئن سٹائن نے بے شمار کارنامے انجام دیئے لیکن اس کی اصل شہرت نظریہ اضافیت پر مبنی ہے۔ اس نے یہ نقطہ پیدا کیا کہ روشنی کی رفتار ہمیشہ ایک رہتی ہے، خواہ حالات کچھ ہوں۔ آئن سٹائن کے تصورات میں سے جس چیز کا سمجھنا سب سے زیادہ مشکل ہے وہ وقت کی اضافیت کا مسئلہ ہے۔ اسے طبعیات کا نوبل انعام ملا تھا۔ اس موقع پر آئن سٹائن نے اپنی فطرت کی گہری روحانی حیثیت کی شہادت ایک بیان میں پیش کی: "ہم جس زیبا اور نہایت عمیق جذبے کا تجربہ کر سکتے ہیں وہ روحانیت کا احساس ہے۔ خاص کر ہر حقیقی علم کا بیج بویا جو شخص اس تجربے سے بے بہرہ ہو جس میں حیرت واستعجاب کی صلاحیت نہ ہو۔ اسے ظاہری طور پر مردہ سمجھنا چاہیے۔ یہ جاننے کہ جس تک ہم نہیں پہنچ سکتے، وہ حقیقت موجود ہے۔"

ادھر رابعہ نے سسکیوں کے درمیان خاموشی توڑتے ہوئے کہا "ندیم کل آپ اپنے والد کو ہمارے گھر بھیجو۔ ساتھ پروفیسر دلاور بھی آجائیں تو اچھا رہے گا۔ وہ میرے بھائی سے رشتہ مانگیں۔ میری طرف سے اقرار ہے۔ میں آپ کی شریکِ حیات بننا چاہتی ہوں۔ آؤ اب اندر چلتے ہیں۔"

کمرے میں پروفیسر دلاور بات ختم کر چکے تھے لیکن پروفیسر زبیر نے ایک سوال پوچھ لیا۔

"سوال ضرور پوچھنے چاہئیں۔ Sense of inquiry بہت بڑی خوبی ہے۔"

پروفیسر زبیر مدبرانہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

''زبیر صاحب دعا کی بڑی فضیلت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم مجھے پکارو، میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔'' اور ارشاد نبویؐ ہے: ''تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا، اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''اس کے لیے قبولیت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔'' ایک اور ارشاد مبارک ہے کہ ''دعا کے سوا کوئی چیز قضا و قدر کے فیصلہ کو رد نہیں کر سکتی اور نیکی کے سوا کوئی چیز عمر کو نہیں بڑھا سکتی۔''

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ قضا و قدر سے بچنے کی کوئی تدبیر فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ ہاں اللہ سے مانگنا اس آفت و مصیبت میں بھی نفع ہو جاتا ہے جو نازل ہو چکی ہو اور اس مصیبت میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور بے شک نازل ہونے کو ہوتی ہے کہ اتنے میں دعا اس سے جا ملتی ہے۔ بس قیامت تک ان دونوں میں کشمکش ہوتی رہتی ہے اور انسان دعا کی بدولت اس بلا سے بچ جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ''دعا مومن کا ہتھیار ہے۔''

''انکل دلاور دعا کی قبولیت کے بارے میں کچھ بتائیے۔'' رابعہ نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ شاید وہ ندیم کی محبت کی تلاش میں کسی دعا کا سہارا لینا چاہتی تھی۔

''رابعہ بیٹا۔ قبولیتِ دعا کے مختلف طریقے ہیں۔ کبھی تو وہ مدعا پورا ہو جاتا ہے جو مانگا جاتا ہے۔ کبھی کوئی آفت ٹل جاتی ہے۔ کبھی کوئی اور نعمت مل جاتی ہے یا وہ ذخیرہ آخرت ہو جاتی ہے یعنی آخرت کے لیے بچا کر رکھ لی جاتی ہے۔ اس لیے مدعا یا تمنا کو پورا ہوتا ہوا نہ دیکھ کر دعا مانگنے سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ دعا فائدے سے خالی کبھی نہیں ہوتی کیونکہ تمام تعریفیں اس پروردگار عالم ''اللہ'' کے لیے ہیں۔ جس کی قوت، جس کا علم و اختیار و ارادہ اس کائنات ہستی میں جاری و ساری ہے۔ وہ عزیز و غالب ہے۔ حکیم و علیم ہے۔ اللہ کا کوئی کام، حکمت، علم و بصیرت سے خالی نہیں ہے۔ اس کی ذاتِ واحد بے مثل ہے۔ وہ واجب الوجود ہے اور حیّ القیوم ہے اور تمام کائناتِ ہستی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

پروردگار عالم نے انسان کی تخلیق کے بعد اس کے لیے حقوق و فرائض بھی بنائے اور کاروبارِ حیات کی کشمکش کے پیشِ نظر کچھ اصول و ضوابط بھی رکھے۔ دینِ اسلام اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید اور آخری نبی سید الاولین و آخرین حضرت محمدؐ کی ذات کو مبعوث فرمایا اور انسانیت کے مذاہب اور اخلاقیات کے لیے بہترین نمونہ بنایا۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ قدرت کی جانب سے حقوق و فرائض کی سرانجام دہی کے لیے سب سے اول جسمانی اور روحانی صحت کی اشد ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو تو انسان قدرت کی جانب سے جن حقوق و فرائض کو ادا کرنا چاہتا ہے، ان کو بخوبی طور پر سرانجام نہیں دے سکتا۔ اہل علم میں یہ بات مشہور ہے یعنی کہ علم دو ہیں، ایک ادیان کا عالم (Knowledge of realgious) اور دوسرا ابدان کا عالم (Knowledge of Human Bodies) جب تک جسمانی و روحانی صحت و سلامتی نہ ہو تو دینی قواعد و ضوابط پر عمل درآمد کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ نے قرآن مجید میں روحانی، جسمانی معالجات (Diseases) اور مجرب دعاؤں کو بیان فرمایا ہے۔ یقین کریں زندگی و موت ہر دو حالتیں انسان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ رحمٰن میں فرماتے ہیں "یہ کہ ہر ایک کو فنا کے گھاٹ اترنا ہے۔" چنانچہ جہاں زندگی ہے، وہاں موت بھی ہے۔ جہاں صحت ہے، وہاں امراض بھی ہیں۔ امراض دو اقسام پر مشتمل ہیں۔ جسمانی امراض اور روحانی امراض۔ مختصر یہ کہ جہاں دعا ہے تو وہاں دوا بھی ہے اور جہاں دوا ہے، وہاں دعا بھی ہے۔"

"دلاور صاحب! آپ کے یونانی، ہندی اور اسلامی تصوف کے مآخذ بتائیے۔ آپ نے فلاسفروں کی باتیں سنائیں مگر آپ ایک بہت بڑی شخصیت کو بھول گئے جو تاریخ انسانی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ جو ولایت و تصوف کا بانی بھی ہے۔ جو علم و دانش کا پیکر بھی ہے۔ جو صوفیوں کا امام ہے۔ جو داتاؤں کا داتا ہے اور وہ ذاتِ گرامی ہے حضرت علیؓ۔ اس دروازہ علم و عرفان کے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"آپ نے بالکل درست کہا ہے۔" پروفیسر دلاور بولے: "حضرت علی کی شخصیت اتنی ہمہ جہت، عالمگیر ہے کہ ان کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر بات کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ ان کے علم و فضل کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ میں صرف ان کی علمی حیثیت اور چند اقوال دانش تک محدود رہوں گا۔" سب متوجہ ہو کر سننے لگے۔

"حضرت علی کا پہلا خطبہ ایک فصاحت و بلاغت کی وجہ سے لاثانی ہے۔

"حمد و ثنا کا سزاوار وہ ہے کہ قوتِ منطق، کلام کرنے والی تمام ہستیاں اس کی حمد و ثنا سے عاجز درماندہ ہیں۔ جس کی نعمتوں کو شمار کرنے والے گننے سے قاصر ہیں اور جو کا حق نعمت کوشش کرنے والے ادا نہیں کر سکتے۔ وہ خدا کہ جس کی حقیقت بلند ہمتوں کے ادراک سے ماورا ہے۔ جن تک فکر کی گہرائیاں پہنچنے سے قاصر ہیں۔ جن کے صفات کی کوئی حد نہیں۔ نہ کوئی ایسی نعت ہے

جو صفات خداوندی کو بیان کر سکے۔ نہ کوئی ایسا وقت جس کا شمار ممکن ہو کہ وہ ایسی جدت جس کی کوئی حد ہو۔ اس نے خلائق کو اپنی قدرت اور اختیار سے پیدا کیا اور ہواؤں کو اپنی رحمت اور مہربانی سے پھیلایا اور متحرک اور لرزاں زمین کو سنگ ہائے بزرگ (پہاڑوں اور میخوں سے کیا کیلیں ٹھونک دیں) اور مستحکم و استوار فرمایا۔ دین کی پہلی بنیاد خدا کی معرفت ہے۔ اور معرفت کا کمال اس کی تصدیق ہے۔

کمال تصدیق توحید ہے اور کمال تفویق اس کو ہر چیز سے برتر ماننا ہے۔ یہ کمال اخلاص صفات کی ذات سے نفی ہے کیونکہ ہر صفت غیر موصوف ہے اور ہر موصوف غیر صفت ہے۔ جس نے اس کی توصیف میں ذات کو صفت (زائد) سے ملایا۔ اس نے گویا ذات الٰہی میں دوئی پیدا کی اور جس نے دوئی پیدا کی۔ اس نے گویا اس کی ذات میں تقسیم مانی اور جس نے ذات الٰہی میں تقسیم مانی، وہ نادان ہے اور جس نے نادانی کی، اس نے خدا کی طرف اشارہ کیا اور جس نے اشارہ کیا۔ اس نے اسے محدود کر دیا اور جس نے یہ پوچھا کہ خدا کس چیز میں ہے تو اس نے گویا کسی چیز کے ضمن میں اسے قرار دیا اور جس نے سوال کیا، وہ کس چیز پر ہے تو اس نے دوسرے مقام کو اس سے (خالی) تسلیم کر لیا۔

خداوند تعالیٰ ہمیشہ سے موجود ہے مگر حادث اور نو پید نہیں (حدوث زمانی کی نفی مراد ہے) مگر اس کی ہستی عدم و نیستی کے بعد نہیں (یہاں حدوث ذات کی نفی کی گئی ہے) وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن بطور ہمسر نہیں۔ وہ ہر چیز سے الگ ہے لیکن اس سے کنارہ کش نہیں۔ وہ ہر چیز کا فاعل ہے لیکن اس کا فعل حرکات و آلات کا نتیجہ نہیں۔ وہ بصیر ہے جبکہ اس کی مخلوق نہ تھی۔ وہ منفرد ہے کیونکہ اس کا کوئی ساتھی نہیں جس سے وہ اپنا جی بہلائے اور جس کے نہ ہونے سے اسے الجھن ہو۔ (اس لیے کہ خدا علم اس کی عین ذات ہے) اس نے دنیا کو پیدا کیا اور پہلے پہل بنایا۔ بغیر اس کے کہ فکر کو کام میں لاتا یا تجربے سے فائدہ اٹھاتا اور نہ اپنے نفس میں کوئی حرکت پیدا کی (یعنی نہ کوئی کام نہ اس نے صلاح سے کیا نہ اضطراب سے) نہ پہلے سے کوئی اہتمام کیا جس کے لیے بے چین ہوا ہو۔ جو چیزوں کو ٹھیک وقت پر عدم و نیستی سے وجود کی طرف لایا۔ اور گوناگوں چیزوں میں موافقت اور سازگاری پیدا کی اور ہر چیز کو اس کی طبیعت اور مزاج عطا کیا اور ان طبائع کے لیے شکل و صورت معین کی۔ وہ ان کی ابتدا اور آغاز سے پہلے ان سے واقف تھا۔ اس کا علم ان کی حدود اور انتہا کو محیط تھا۔ ان کی حالت اور پوشیدہ کیفیت سے آشنا تھا۔ پھر خدائے بزرگ و برتر نے زمین

وآسمان کے درمیان ''فضا'' یعنی (وہ فضا جو زمین وآسمان کے درمیان موجود ہے) اور اطراف اور گوشوں میں شگاف اور آسمان سے ملی ہوئی ہوا پیدا کی اور اس فضا میں متلاطم پانی جاری کیا۔ جس کی موجیں بڑھ بڑھ کر بلند ہو رہی تھیں۔ اس پانی کو بادِ تند کی پیٹھ پر سوار کیا جو ہر چیز کو متزلزل کیے دیتی تھی۔ ہوا کو حکم دیا کہ وہ پانی کو گرنے سے روکے (یعنی پانی کو حکم دیا کہ پانی کو روکے، اس لیے کہ پانی ثقیل ہے اور ثقیل چیز بغیر ٹھہراؤ کے ہمیشہ نیچے گرتی ہے) اور اسے پانی کے زور پر مسلط کر دیا اور اسی ہوا سے پانی کی حد بندی کر دی۔ ہوا کا دامن دور تک پھیلا تھا اور پانی اس کے اوپر اچھل رہا تھا۔ پھر خدا نے ایک ایسی ہوا چلائی جو خشک تھی (یعنی وہ ہوا جو نہ بادلوں سے پانی برسا سکتی ہے، نہ زمین پر روئیدگی پیدا کر سکتی ہے) اسے پانی کے ساتھ ساتھ کر دیا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ خدا نے حکم دیا کہ اس پانی کو حرکت دیتی رہے اور موجوں کو ابھار کر اوپر کی طرف پھینک دے۔ ہوا نے اس پانی کو اس طرح متھا (زور و شدت کے ساتھ الٹا پلٹا جیسے دودھ کو اچھی طرح متھ ڈالتے ہیں کہ اس میں سے مکھن نکل آئے) جیسے مشک کو دودھ میں متھا جاتا ہے اور وہ فضا میں بڑی تیزی سے دور گئی۔ یہ پانی کے نچلے حصے کو اوپر کی طرف پلٹانے لگی اور ساکن کو متحرک سے ملانے لگی۔ یہاں تک کہ پانی کی جو چوٹی بلند ہو گئی اور تہ بہ تہ پانی پر پھسلین اٹھ آیا۔ پھر اس پانی کو شگاف دی ہوئی اور کشادہ فضا میں بلند کیا جس سے سات آسمان بنائے اور آسمان زیریں کو ایک جمی ہوئی اور رکی ہوئی موج قرار دیا اور آسمان بالا تو ایک خوبصورت چھت اور بنائے مرفوع بنا دیا۔ آسمان کو بغیر کسی ستون کے روکے اور بغیر میخ کے اپنی جگہ پر قائم رکھا۔ پھر خدائے بزرگ و برتر نے اس آسمان کو چمکتے ہوئے ستاروں اور دمکتے ہوئے تاروں سے مزین کیا اور چراغ اور افشاں یعنی خورشید (سورج) اور ماہِ درخشاں کو رواں دواں کیا اور یہ ساری چیزیں گھومتے ہوئے آسمان، چاند، رواں دواں چھت اور لوحِ متحرک میں تھیں اور پھر خدا نے بلند آسمانوں کے بیچ شگاف دیا اور ان خلاؤں کو فرشتوں کی مختلف قسموں سے بھر دیا اور ان فرشتوں میں کچھ حالت سجدہ میں ہیں، رکوع نہیں کرتے اور کچھ مصروف رکوع ہیں، کھڑے نہیں ہوتے اور ان میں سے ایک گروہ صف بستہ کھڑا ہے جو اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں۔ کچھ وہ فرشتے ہیں جو تسبیح خوان میں مصروف ہیں مگر ذرا نہیں تھکتے۔ (یہ تمام ملائکہ ایسی غیر مادی ہستیاں ہیں کہ نہ ان پر آنکھوں کی نیند چھاتی ہے نہ عقلوں کی بھول کا غلبہ ہوتا ہے، نہ بدنوں کی سستی طاری ہوتی ہے۔ نہ بھول چوک کی غفلت کا اثر طاری ہوتا ہے۔ انہیں فرشتوں میں ایک قسم کے وہ ہیں جو خداوند تعالیٰ کی وحی کے امین ہیں۔ اس کے پیغمبروں اور رسولوں

کے پیامبر بن کر اور احکام و فرامین الٰہی لے کر آتے جاتے ہیں اور ان ہی میں ایک قسم ان فرشتوں کی بھی ہے جو اس کے بندوں کے نگہبان اور اس کی جنتوں کے دربان ہیں۔ ان میں ایسے فرشتے ہیں جن کے قدم زمین کے طبقات زیریں میں گڑے ہوئے اور گردنیں بلند و بالا آسمان سے نکلی ہوئی اور ان کے اجسام اطراف عالم سے نکلے ہوئے ہیں اور ہیبت اور عظمت نور الٰہی سے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں اور عرش کے نیچے اپنے پردوں میں لپٹے رکھے ہیں۔ ان کے اور دوسرے ملائکہ کے درمیان حجابات ہائے عزت و پردہ ہائے قدرت پڑے ہوئے ہیں۔ یہ فرشتے اپنے رب کا تصور صورت کشی سے نہیں کرتے، نہ اوصاف خلائق کو اس کے اوپر جاری (منطبق) کرتے ہیں۔ نہ اسے کسی مکاں میں محدود کرتے ہیں۔ نہ امثال و نظائر سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔" جو کوئی اپنے پروردگار کو کسی صورت سے متصور کرتا ہے، خلائق کے اوصاف اس پر جاری کرتا ہے، کسی حد میں اسے محدود کرتا ہے۔ امثال نظائر کو اس کے سامنے رکھ کر اس کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ وہ نادان ہے۔"

زبیر صاحب بولے" ماشاء اللہ میں نے اس سے پہلے خداوند تعالیٰ کو اس سے بہتر نہیں سمجھا۔ خدا کی وحدت کا اتنا خوبصورت تصور پہلے کسی نے پیش نہیں کیا نہ آئندہ کوئی پیش کر سکے گا۔ کچھ اور خطبات بھی سنایئے۔"

دلاور صاحب بولے"میں اردو کے ساتھ ان خطبات عالیہ کی انگلش ٹرانسلیشن بھی سناتا جاؤں گا کیونکہ نئی نسل کو سمجھنے میں دقت نہ ہو اور وہ بھی اس نایاب علم کے خزانے سے بہرہ مند ہو سکیں۔"

پروفیسر دلاور کو غور سے سنیں۔" جب عباس اور ابوسفیان نے بیعت پر اصرار کیا تو آپ نے کیا جواب دیا:

"اے لوگو! فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر پار ہو جاؤ۔ منافرت کی راہ چھوڑ دو اور مفاخرت اور بزرگی کے تاج سر سے اتار کر زمین پر پھینک دو جو پر و بال دیار و یاور کے ساتھ اٹھا وہ کامیاب ہوا، جس کے حالات کو ان کے حال پر چھوڑا اس نے راحت پائی۔ یہ ذمہ داری تو ایک گندا پانی ہے۔ وہ لقمہ ہے جس کے کھانے والوں کو اچھو ہو جاتا ہے اور وقت سے پہلے خوشہ چینی کرنے والا ایسا ہے جیسے کوئی عنبر کی زمین پر کاشت کرے۔ اب اگر خلافت کے بارے میں کچھ کہتا ہوں تو لوگ کہیں گے، یہ امارات کی حرص ہے اور اگر خاموش رہتا ہوں تو ایسے لوگ بھی

ہیں جو کہیں گے کہ مرنے سے اور جان دینے سے ڈرتا ہوں افسوس! میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے مصائب جھیل چکا ہوں۔ خدا کی قسم ابو طالب کا بیٹا ہوں۔ موت مجھ سے زیادہ مانوس ہے۔ جتنا کہ ایک طفل شیر خوار پستان مادر سے۔ نہیں یہ بات نہیں میرے سکوت کا راز وہ اسرار ہیں کہ جو کچھ جانتا ہوں، اگر اسے افشا کر دوں تو تم یوں لرزنے اور کانپنے لگو گے جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور کانپتی ہیں۔"

ان کا ایک مختصر خطبہ ہے جس کا نام ہے "موت کے بعد"

مولا علیؑ فرماتے ہیں "اے لوگو۔ اگر تم وہ چیز دیکھ لیتے جو تم سے پہلے لوگ دیکھ چکے ہیں، جو مر چکے ہیں تو بلاشبہ تم کانپ جاتے، خوفزدہ ہو جاتے۔ پھر تم کلمہ حق سنتے بھی اور اس کی پیروی بھی کرتے لیکن جو کچھ وہ (تم میں سے وہ لوگ وفات پا چکے ہیں) دیکھ رہے ہیں، تمہاری نگاہ (ظاہری) سے محجوب ہے لیکن پردہ اٹھائی چاہتا ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہتے کہ وہ کونسی چیز تھی، تمہیں دکھائی نہیں گئی اور اگر تم سننا چاہتے ہو تو ہر چیز سنا دی گئی تھی۔ ہدایت حاصل کرنا چاہتے تو راہ ہدایت بھی دکھا دی گئی تھی۔ لوگو! میں تم سے کہتا ہوں، عبرتیں اور نصیحتیں تم پر کھولی جا چکی ہیں۔ قابل احتراز چیزوں سے تمہیں بھی روکا جا چکا ہے اور ہاں تبلیغ کو یاد رکھو کہ آسمانی رسولوں کے بعد یہ فریضہ اب جس پر عائد ہوتا ہے، وہ بشر ہی ہے۔"

آل رسول اور امت خطبہ نمبر 4 میں ارشاد فرمایا۔ تم نے تاریکیوں میں ہمارے باعث ہدایت پائی۔ ہمارے ہی سبب تم سر بلند ہوئے، ہماری ہی وجہ سے تم نے رات کے اندھیرے میں صبح کا اجالا پایا۔ وہ کان بہرے ہو جائیں جو اپنے راہنما کی سننے والی بات نہ سنیں لیکن وہ کان ہلکی آواز کیا سن سکتا ہے جو چیخ سے بہرا ہو چکا ہو۔ خدا اس دل کو سکون عطا کرے جو خوف خدا سے لرزاں اور ترساں ہو۔ میں ہمیشہ تمہارے نتائج خیانت ونقص عہد وہ بے وفائی کا منتظر ہوں اور میری نگاہ و بصیرت تم میں فریب کاری کے اوصاف محسوس کر رہی ہے لیکن لباس، تقویٰ اور پیراہن دینداری نے مجھے تم سے پنہاں رکھا۔ میرے صفات باطن نے تمہارا حال مجھ پر منکشف کر دیا۔ میں بھٹکانے والے راستوں میں تمہارے لیے راہ حق پر کھڑا ہو گیا۔ جب تم راہبر ڈھونڈتے تھے مگر کوئی راہنما نہ تھا۔ تم کنویں کھودتے تھے مگر پانی نہیں نکلتا تھا۔ آج میں تمہارے لیے حقائق بیان کر رہا ہوں۔ اس شخص کی رائے کوئی رائے نہیں جس نے مجھ سے کنارہ کشی کی۔ جب سے مجھے حق کا جلوہ دکھایا گیا ہے۔ مجھے کبھی اس بات پر شک نہیں پیدا ہوا کہ میں ثابت قدم رہا اور باطل نے بھی

میرے دل میں راہ نہ پائی کہ حضرت موسیٰ کو خوف اپنی جان اور اپنی ذات کا نہ تھا بلکہ خطرہ جو کچھ تھا، یہ کہ مبادا غلبہ جہال اور اقتدار دول ضلال قائم نہ ہو جائے۔ ہم دونوں آج حق اور باطل کے راستے میں کھڑے ہیں۔ اب جو شخص پانی پر اعتماد کرے گا، ہرگز پیاسا نہیں رہے گا۔

''خطبہ نمبر ۱۸۱ میں حضرت علی کا سب سے اہم ترین خطبہ ہے۔'' پروفیسر ولاور بولے: اس کے بعد میں اپنا کلام ختم کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی نشست بھی برخاست کر دیں گے کیونکہ رات کافی ہو گئی۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: ''مستحق سپاس وشکر وہ خدا ہے جو اپنی نعمتوں کو روک لے اور کسی کو کچھ نہ دے۔ تو اور زیادہ امیر نہیں ہو سکتا اور جود و بخشش اس کی ثروت اور دولت میں کمی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ ہر دینے والے کا سوا خدا کے مال کم ہو جاتا ہے اور ہر نہ دینے والا سوا خدا کے برا سمجھا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ خدا ہی ہے جو اپنے بندوں پر احسان کرتا ہے اور انہیں نعمت منفعت اور بڑے بڑے انعامات سے نوازتا ہے۔ یہ مخلوق اس کی عیال ہے جس کی روزی کا وہ ذمہ دار بنتا ہے۔ وہ خدا ہی ہے جس نے محبت کرنے والوں اور طلب کرنے والوں کو واضح اور صاف راستہ بتا دیا ہے۔ اس سے جس چیز کا سوال کیا جائے۔ اس سے غیر سوال شدہ چیزوں کے مقابلے میں زیادہ سخی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ایسا اول ہے جس سے پہلے کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی چیز اس سے پہلے مانی جا سکے اور ایسا آخر ہے جس کی کوئی انتہا اس سے پہلے مانی جا سکے اور ایسا آخر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جس کے بعد کوئی چیز تسلیم کی جا سکے۔ وہ اس سے مانع ہے کہ مردیک چشم اس تک پہنچ سکے یا ادراک کر سکے۔ اس پر زمانہ کے انقلابات وارد نہیں ہوئے کہ جس سے اس کے احوال کہ جس سے اس کے احوال و مقامات میں تغیر واقع ہو۔ نہ وہ کسی مکان میں ہے کہ اس کے لیے نقل و حرکت روا ہو سکے۔ وہ اگر تمام چیزوں کو عطا کر دے جنہیں پہاڑوں کی کانیں اور سمندر کی سیپیاں دیتی ہیں جیسے چاندی، سونا، موتی، مرجان کے خوشے جب بھی اس کی عطا اور بخشش پر اثر نہیں ہوتا اور اس کی نعمتوں کے خزانے ختم نہیں ہو سکے اور اس خدا کے پاس وہ نعمت ہائے بے پایاں اور پنہاں ہیں کہ آدمی ان سے آگاہ نہیں جنہیں کبھی بھی اہل دنیا کی طلب گاریاں ختم نہیں کر سکیں گی۔ اس لیے کہ وہ ایسا جوادِ غنی ہے کہ جس کی عطا کو سوال کرنے والوں کا سوال کم نہیں کر سکتا اور مسلسل سوال کرنے والوں کی دریوزہ گری اسے بخیل نہیں بنا سکی۔ پوچھنے والے دیکھ اور قرآن کریم نے اس کے جن صفات کی طرف راہنمائی کی ہے، ان کی پیروی کر اور اسی کی ہدایت کے نور سے روشنی حاصل کر اور جن صفات کے

جاننے کا تجھے شیطان نے مکلف اور پابند کیا ہے، نہ طریقہ پیغمبر اکرامؐ اور اثر ائمہ ہدیٰ سے ان کا کوئی سراغ ملتا ہے، ان کا عرفان خدا پر چھوڑ دے۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے بتایا ہے اسے جان لے اور یاد رکھ راسخین فی العلم وہ لوگ ہیں جنہیں پردہ غیب اور حجاب الٰہی کے اندر کی نامعلوم باتوں کے اقرار عجز نے پردۂ غیب میں جانے سے بے نیاز کر دیا اور ان کی مدح سرائی ہے کہ جس چیز کو جانتے نہیں، اس کے بارے میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیتے ہیں اور جن چیزوں کی کنہ اور جس حقیقت کے بارے میں انہیں فسق و فکر کا مکلف نہیں کیا ہے، ان کے بارے میں جستجو نہ کرنے ہی کو رسوخ فی العلم قرار دیا ہے، لہٰذا اسی پر اکتفا کر اور اپنی مختصر و معذور عقل کے سہارے خدا کی عظمت و جلالت کا اندازہ کرنے سے باز آ جا ورنہ ہلاک اور برباد ہو جائے گا۔

بلاشبہ وہ قادر مطلق ذات ان اوہام کو ناکام بنا دیتی ہے جو اس کی انتہا اور قدرت کا ادراک کرنا چاہتے ہیں۔ وہ وساوس سے مبرا فکر جب اس کی مملکت کے پوشیدہ اسرار کی گہرائیوں تک پہنچنا چاہتی ہے اور قلب والہانہ طور پر اس کے صفات معلوم کرنے پر توجہ دیتا ہے اور جب عقل کی راہیں علم ذات حاصل کرنے کے لیے درجۂ خفا تک پہنچ جاتی ہے جہاں تک صفات نہیں پہنچ سکتے تو خدائے آخر زنگار انہیں اسی وقت روک دیتا ہے جب وہ دوسری چیزوں سے دامن جھٹک کر اس کی کنہ ذات کی معرفت کے لیے عیوب کی تاریکی میں مقام ہلاکت کو طے کر لیتی ہے۔ پھر یہ فکر جستجو پسند ناکامی کا اعتراف کرتی ہوئی لوٹ آتی ہے کہ نہ اس کی معرفت اپنی حدوں سے آگے بڑھ کر حاصل ہو سکتی ہے نہ قلب بشر میں اس کی علو شان اور جبروت منزلت کا گمان بھی آ سکتا ہے۔

خدا نے بغیر کسی مثال کو سامنے رکھے ہوئے خلق کو پیدا کیا اور بغیر کسی مقدار کی پیروی کیے ہوئے اس نے آفرینش کا کام انجام دیا۔ اس نے ہمیں اپنی ملکوت و قدرت دکھائی جو عجائبات دکھائے جو آثار حکمت پر زبان حال سے گویا ہیں اور مخلوقات کے اقرار احتیاج نے کہ ان کا وجود قدرت خدا کے سہارے ہے۔ اس اقرار نے ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اس کی معرفت حاصل کرنے پر دلیل قائم ہو چکی ہے اور گنجائش عذر نہیں اور اس کی بے مثال تخلیق اور پیدا کردہ چیزوں میں اس کی کاری گری وصف و حکمت، دانائی کے نشانات اور جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ پس جو کچھ اس نے پیدا کیا، وہ اس کی حقیقت پر حجت اور دلیل ہے۔ اگرچہ وہ مانند نباتات و جمادات بے زبان ہی کیوں نہ ہو۔ پس ان موجودات کی تدبیر و نظم بجائے خود حجت و برہان گویا

ہے اس کی خلاقیت پر۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ جو شخص تیری مخلوق کے اعتبار سے تجھے تشبیہ دے (زیر گوشت و پوست) جوڑوں کی پیوستگی میں تیری نظیر دے درحقیقت اس نے تجھے نہیں پہچانا نہیں اور یقین نہیں کیا کہ تیرا مثل و مانند کوئی نہیں ہے۔ گویا متبوعین (بت) کے تابعین (مشرف و کافر) کا یہ قول ہی نہیں سنا جب وہ قیامت کے روز کہہ رہے ہوں گے۔

خدا کی قسم جب ہم اے بتو تمہیں خدا کے برابر قرار دیتے تھے، سخت گمراہی میں مبتلا تھے۔ بے شک وہ لوگ جھوٹے تھے جو تجھے اپنے بتوں سے تشبیہ دیتے یا اپنے وہم سے تیری مخلوقات کے برابر قرار دیتے تھے اور صفات مخلوق کے ساتھ متصف جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے دل سے تجھے عام جسم رکھنے والی چیزوں کی طرح تیرے اجزا قرار دیئے اور مختلف قوتیں رکھنے والی مخلوق پر اپنے ایجادات عقل سے تیرا قیاس کیا۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ جس کسی نے تیری مخلوق میں سے تجھے کسی کا ہم پایہ بنایا، اس نے گویا اسے تیرے برابر مانا اور جس نے کسی کو تیرا ہم پایہ مانا وہ قطعاً ان باتوں سے انکار کرتا ہے جنہیں لے کر تیرے آیات محکم نازل ہوئے ہیں اور جن پر دلائل و بنیات کے شواہد گویا ہیں۔ تو ہی وہ خدا ہے کہ تیرے لیے عقل کی انتہا (دوری) بیکار ہے کہ ان کے افکار کے حدود میں کیفیت کے ساتھ سما سکے۔ ذہنی تصورات کے دائرے میں آ سکے اور اس طرح محدود ہو کر رہ جائے۔ اس لیے کہ محدودیت تغیر لوازم امکان، میں سے ہے اور یہ خدا کی شان نہیں۔

خدا نے اپنی مخلوق کی بقا (زندگی) کو معین کیا، اسے مستحکم اور استوار بنایا۔ اس کا بندوبست کیا اور اس میں کرم نمایاں ملحوظ رکھیں۔ اسے اپنے مقصد حیات میں اس حصہ متوجہ کر لیا کہ اب نہ وہ حدود منزل سے تجاوز کر سکتا ہے اور نہ منزل مقصود تک پہنچے بغیر دم لے سکتا ہے۔ جب اسے راہ مشیت پر رہروی کا حکم دیا گیا کہ یہ بات اس پر گراں نہیں گزری اور یہ کس طرح ہوتا جبکہ جملہ امور اس کی مشیت ہی سے صادر ہوتے ہیں جو اشیائے گوناگوں کا خالق ہے۔ قوت فکر کی طرف رجوع کیے بغیر ورنہ انسانی طبعوں کی طرح اس کو کوئی محرک تھا کہ اس نے پہلے سوچا، پھر جب کیا اور بغیر تجربہ اور آزمائش کے کہ کبھی اس سے استفادہ کہ جو اس اور بغیر شریک کے اس نے تخلیق کے جو کام ہیں، اس کی مدد یا اس کا ساتھ دیا ہو (خلاصہ کلام یہ کہ) خلقت اور آفرینش کا سارا کام اس نے اپنی مشیت سے کیا۔ اس میں سے ہر ایک نے اس کی اطاعت قبول کی۔ اس کی

دعوت تسلیم کی اور اس طرح کہ نہ تاخیر کو دخل دیا، نہ سستی کو درمیان میں آنے دیا۔ اس کے تمام چیزوں کی نادرستی اور کجی دور کر دی۔ ان کے حدود مقرر کیے اور اپنی قدرت سے متضاد چیزوں کے درمیان جوڑ اور ربط پیدا کیا اور انہیں اسی طرح باہم پیوست کر دیا کہ ان کا جدا ہونا ممکن نہ رہا اور پھر اجناس کے اعتبار سے اقدار، طبائع اور حیات میں فرق پیدا کیا۔ یہ ہے وہ پہلے پہل پیدا ہونے والی کائنات جس کی بناوٹ کو اس نے محکم دیا اور (محض) اپنے ارادے اور مشیت پر اس کی ایجاد و اختراع کی۔

حضرت علیؑ خطبہ نمبر 98 میں فرماتے ہیں۔ اس خطبہ میں انہوں نے دنیا کی بے اعتباری، بے ثباتی، حیات انسانی کی ناپائیداری اور دنیا کی فریب کاری اور اندوہناکی کو بیان فرمایا ہے:

''ہم جس حال میں ہیں، اس پر خدا کی حمد کرتے ہیں اور جو کچھ پیش آنے والا ہے۔ اس پر اس کی مدد کے طلبگار ہیں۔ دین اور عقائد کے بارے میں اس سے سلامتی کی درخواست کرتے ہیں (کہ گمراہی اور نافرمانی میں مبتلا نہ ہوں) جس طرح بیماریوں سے سلامتی بدن کی دعا کرتے ہیں۔ بندگانِ خدا میں تمہیں ترکِ دنیا کی نعمت کرتا ہوں کہ جو بالآخر خود تمہیں ایک نہ ایک دن چھوڑ دے گی اور قیامت میں تمہارے کام نہ آئے گی۔ چاہے تم اسے نہ بھی چھوڑنا چاہو۔ وہ تمہارے اجسام کو کہنہ کر دینے والی ہے۔ گو تم چاہتے ہو کہ وہ ہمیشہ تر و تازہ رہیں۔ پس تمہاری اور دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے وہ مسافر کی راہِ مسافرت پر قدم زن ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ راستہ طے ہو گیا اور نشانِ منزل کہ دور سے نظر آتے ہیں۔ قریب آ گئے اور وہ ان تک پہنچ گئے اور کتنا غلط خیال ہے۔ ان لوگوں کا جو اپنے مرکب کو منزل کی طرف بڑھاتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اس کی امید بقا ہی کیا جس کی موت کا ایک دن مقرر ہے جس کی حد سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا اور طلب کنندہ (موت) جو تیزی کے ساتھ اسے ہنکارتا ہے تا آنکہ وہ اس دنیا سے مفارقت اختیار کر لیتا ہے۔ پس دنیا کی عزت پر دیوانے نہ ہو اور اس کی نیت اور نعمت پر فریفتہ نہ ہو جانا۔ اس کی مصیبت اور کلفت پر فغاں و زاری نہ کرنا کیونکہ اس کی عزت دار جمندی ختم ہونے والی ہے۔ اس دنیا کی ہر مدت اور ہر زمانے کو ختم ہونا ہے۔ یہاں کے ہر جاندار کو فنا کی آغوش میں پہنچنا ہے۔ پس کیا ماضی کے آثار میں کوئی چیز ایسی نہیں جو دنیا میں دل اٹکانے سے تمہیں روکے اور کیا اپنے آباکے اولین میں اگر تم عقل و فکر سے محروم نہیں ہو، کوئی عبرت و نصیحت نہیں پاتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس دنیا سے جانے والے پھر کبھی واپس نہیں آتے اور ان کے جو جانشین اس وقت زندہ

ہیں، وہ بھی ہمیشہ زندہ باقی نہیں رہیں گے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اہل دنیا کیسے گوناگوں حالات میں شب و روز بسر کرتے ہیں اور کہیں کوئی دم توڑ چکا ہے اور اس پر رونے والے رو رہے ہیں اور کوئی دوسرا ہے جیسے پرسا دیا جا رہا ہے۔ تعزیت کی جا رہی ہے۔ کوئی بیمار ہے اور وہ درد سے پچھاڑیں کھا رہا ہے اور عیادت کرنے والا عیادت کر رہا ہے اور کوئی دوسرا ہے کہ عالم نزاع میں ہے۔ کوئی دنیا کا خواہاں ہے اور موت اس کی تلاش میں ہے اور کوئی دوسرا ہے کہ حساب و پرسش روز قیامت سے غافل و بے خبر ہے لیکن نہیں یہ گزر جانے والوں کے نقش قدم پر ہی ہیں جن پر باقی زندہ لوگ چل رہے ہیں۔ خبردار! برے کام کرتے وقت تو اس موت کو یاد کر لو جو لذتوں کو ڈس دینے والی، خواہشات کو فنا کر دینے والی، آرزوؤں اور تمناؤں کو قطع کر دینے والی ہے۔ خدا کا حق (عبادت) ادا کرنے کے لیے اس سے مدد طلب کرو اس کی ان گنت نعمتوں اور انسانوں کا شکر ادا کرو۔"

خطبہ نمبر 102 میں مولیٰ علی فرماتے ہیں۔

"دنیا پر اس طرح نظر ڈالو جس طرح اس سے نفرت کرنے والے اور اس سے اور اس سے روگرداں ہونے والے اسے دیکھتے ہیں کیونکہ خدا کی قسم یہ اپنے رہنے والوں کو بہت جلد اپنے سے دور کر دے گی۔ اس کی جو چیزیں گزر چکیں جیسا کہ جوانی، صحت، قوت و توانائی وغیرہ اب وہ واپس نہیں آئیں گی اور اس کے بعد جو چیزیں آنے والی ہیں وہ نامعلوم ہیں۔ پھر انتظار کیسا؟ نعمت یا زحمت، خوب یا بد، کچھ معلوم نہیں۔ دنیا کی خوشی غم کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور اس کی قوت جواں مردی، ضعف و توانائی، پیری کی طرف چلنے والی ہے۔ پس اس کی جو چیزیں تمہیں مسرور کرتی ہیں، وہ تمہیں دھوکہ نہ دے (جیسے مال و دولت و فرزند اور زن کیونکہ ان میں سے بہت کم چیزیں تمہارے ساتھ جائیں گی۔ خدا اس شخص پر رحم کرے جو اپنے انجام پر نظر رکھتا ہے۔ فکر میں مبتلا اور دنیا کی ناپائیداری سے عبرت حاصل کرنے والا ہے۔ جو بینا ہے اور اس کا یقین کرتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے، وہ جاودانی ہے اور ساعات عمر سے جو چیز حساب میں آ گئی وہ اختتام کو پہنچے گی اور جس کا انتظار (مرگ و قیامت) کیا جا رہا ہے، وہ آئے گی اور نہ آنے والی چیز (یوں سمجھنا چاہیے کہ گویا) بہت جلد قریب آ رہی ہے۔"

زبیر صاحب بولے "واہ پروفیسر دلاور صاحب، آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ تو علوم کا سمندر ہیں۔ آپ کی باتوں میں بڑی فصاحت ہے۔ آپ نے تصوف کو مختلف مذاہب، جدید اور قدیم مذاہب میں ایسے تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مہاتم بودھ کے افکار و حیات میں جو تصوف

اور وجودیت کا نظریہ موجود ہے، وہ نسل در نسل مختلف مفکروں اور فلاسفروں کے ذریعے بالآخر حضرت علیؓ کے خطبات پر اپنے عروج وکمال کو پہنچ جاتا ہے۔ لگتا ہے روشنی کا ایک ہی سفر ہے۔ وحدت کی ایک کہانی ہے۔ ہر مفکر اور ولی نے اپنے دور میں اپنے ماحول اور الوہی ہدایت کے تحت اسے بیان کیا۔ کہانی ایک ہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کردار بدلتے رہے۔ سوچ بدلتی رہی۔ تقاضے بدلتے رہے لیکن سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں اور ہمارے پیارے نبیؐ سب کے آقا ومولیٰ ہیں۔ جمہوری نے انسانی عقل وفراست کو عروج وکمال تک پہنچا دیا۔

CHAPTER ON SELECTIONS FROM SERMONS OF AMEERUL MOMINEEN (A.S.) AND HIS INJUNCTION

This selection also includes his utterances delivered in the form of sermons in various meetings, encounters and occasions that he faced.

Sermon I

in this sermon he recalls the creation of Earth and Sky and the birth of Adam.

Praise, is due to Allah whose worth, can not be described by speakers, whose boundies can not be counted by calculators and whose claim (to obedience) can not be satisfied by those who attempt to do so, whom the height of intellectual courage cannot appreciate, and the divings of understanding cannot reach. He for Whose description no limit has been laid down, no eulogy exists, no time is ordained and no duration is fixed. He' brought forth creation through his 'Omnipotence, dispersed winds through His compassion! and made firm the shaking earth with rocks. The foremost in

religion is His knowledge, the perfection of His knowledge is, to testify Him, the perfection of testifying Him is to believe in His oneness the perfection of believing in His Oneness is to regard Him Pure and the perfection of His purity is to deny Him Attributes, because every attribute is a proof that it is different from that to which it is-attributed and everything to which Something is attributed is different from the attribute. Thus whoever attaches attributes to Allah recognises His like, and who recognises His like regards him two and who regards Him two recognises parts for Him and who recognises parts for Him mistook. Him and who mistook Him pointed at Him and who pointed at Him admitted limitations for Him and who admitted limitations for 'Him numbered Him. Whoever said in, what is he held that He is contained and whoever said on what is He held He is not on something else He is a Being but not through phenomenon of coming into being; He exists but not from non-existence. He is with everything but not in physical separation. He acts but without connotation of movements and instruments. He sees even when there is none to be looked at from 'among His creation. He is only One, such that there is none with whom He may keep company or whom He may miss in his absence. He initiated creation most initially and commenced it originally, without undergoing reflection, without making use of any experiment, without innovating any movement, and without experiencing any aspiration of mind. He allotted all things their times, put together their variations gave them their properties, and determined their features knowing them before creating them, realising fully their limits and confines and. appreciating their

propensities and intricacies. When Almighty created the openings of atmosphere, expanse of firmament and si ratà of winds, He flowed into it water whose waves were stormy and whose surges leapt one over the other. He loaded it on dashing wind and breaking typhoons, ordered them to shed it back (as rain), gave the wind control over the vigour of the rain, and acquainted it with its limitations. The wind blew under it white water flowed furiously over it. Then Almighty created forth wind and made its movement sterile, perpetuate its position, intensified its motion and spread it far and wide. Then He ordered the wind to raise up deep waters and to intensify the waves of the oceans. So the wind churned it like tiie churning of curd and pushed it fiercely into the firmament throwing its front position on the rear and the stationary on the flowing till its level was raised and the surface was full of foam. Then Almighty raised the foam on to the open wind and vast firmament and made therefrom the seven skies and made the lower one as a stationary surge and the upper one as protective ceiling and a high edifice without any pole to support it or nail to hold it together. Then He decorated them with stars and the light of meteors and hung in it the shining sun and effluent moon under the revolving sky, moving ceiling and rotating firmament.

Then He created the openings between high skies and filled them with all classes of His angels. Some of them are in prostration and do not kneel up. Others are in kneeling position and do not stand up. Some of them are in array and do not leave their position. Others are extolling Allah and do not get tired. The sleep of the eye or the slip of wit, or languor of

the body or the effect of forget fulness does not effect them. Among them are those who work as trusted bearers of His message, those who serve as speaking tongues for his prophets and these who carry to and fr His orders and injunctions. Among them are the protectors of His creatures and guards of the doors of Paradise. Among them are those also whose steps are fixed on earth but their necks are protruding into the skies, their limbs are getting out on all sides, their "shoulders are in accord with the columns of the Divine Throne, their eyes are down cast before it, they have spread down their wings under it and they have rendered between themselves and all else curtains of honour and screens of power. They do not think

SERMON 4

Through us you got guidance in the darkness and secured high position, and through us you got out of the gloomy night. The ears who do not listen to the cries may become deaf. How can one who remained deaf to the loud cries (of the Quran and the Prophet) listen to (my) feeble voice. The heart that has ever palpitated (with fear of Allah) may get peace. I always apprehended from you consequences of treachery and I had seen you through in the garb of the decietful. The curtain of religion had kept me hidden from you but the truth of my intentions disclosed you to me. I stood for you on the path of truth among misleading tracks where you met each other but there was no leader and you dug but got no water. Today I am making these dumb things speak to you (i.e. my suggestive ideas and deep musings etc.) which are full of descriptive power. The opinion of the person who abandons

me may get astray. I have never doubted in the truth since it has been shown to me. Moses* Did not entertain fear for his own self. Rather he apprehended mastery of the ignorant and away of deviation. Today we stand on the cross-roads of Truth and untruth. The one who is sure of getting water feels no thirst.

1. The reference is to that event of Moses when sorcerers were sent for to confront him and they showed their sorcery by throwing ropes and sticks on the ground and Moses felt afraid. Thus the Quran records:-

(It) seemed to him (Moses) by their sorcery as if they were running. Then
Moses felt in himself a fear. Said We: "Fear thou not I Verify thou shall be
the uttnermost. 20:66/68.

Ameerul Momineen (A.S.) says that the ground for Moses fear was not that since he saw ropes and sticks moving he might have entertained fear for his 'life.but the cause* of his fear was lest people be impressed with this sorcery and get astray, and untruth might prevail on account of this craft. That is why Moses was not consoled

handsome and of huge body. He jumped over it and took possession of it. Shai-tan did not agree to spare it and said to him to take over some other she-camel in its place but Ziad would not agree. Shaitan sent for his brother A'da bin

Hajr for his support. On coming he too had a talk but Ziad insisted on his point and did not, by any means, consent to keep off his hand from that she-camel. At last both these brothers appealed to Masrooq bin Madi Karb for help. Consequently Masrooq also used his influence so that Ziad might leave the she-camel but he refused categorically, whereupon Masrooq became enthusiastic and untying the she-camel handed it over to Shaitan. On this Ziad was infuriated and collecting his men became ready to fight. On the other side Bani Walia'a also assembled to face them, but could not defeat Ziad and were badly beaten at his hands. Their women were taken away and property was looted. Eventually those who had survived were obliged to take refuge under the protection of Asha's. Asha's promised assistance on the condition that he should be acknowledged ruler of the area. Those people agreed to this condition and his coronation was also formally solemnised. After having his authority acknowledged he arranged an army and set out to fight Ziad. On the other side Abu Bakr had written to the chief of Yemen, Muhajir bin Ummayya to go for the help of Ziad with a contingent. Muhajir was Coming with his contingent when they came face to face. Seeing each other they drew swords and commenced fighting at Zarqan. In the end Asha's fled from the battle-field and taking his remaining men closed himself in the fort of Nujair. The enemy was such as to let them alone. They laid seige arround the fort. Asha's thought how long could be remain shut up in the fort with this lack of equipment and men, and that he should think out some way of escape. So one night he stealthily came out of the fort and met

Ziad and Muhajir and conspired with them that if they gave asylum to nine members of his family he would get the fort gate opened. They accepted this term and asked him to write for them the names of those nine persons. He wrote down the nine names and made them over to them, but acting on his traditional wisdom forgot to write his own name in that list. After settling this he told his people that he has secured protection for them and the gate of the fort should be opened. When the gate was opened Ziad's forces pounced upon them. They said they had been promised protection whereupon Ziad's army said that this was wrong and that Ash'as had asked protection only for nine members of his house, whose names were preserved with them. In short eight hundred persons were put to sword and hands of several women were chopped off, while according to the settlement nine men were let off, but the case of Asha's became complicated. Eventually it was decided he should be sent to Abu Bakr and he should decided about him. At last he was sent to Medina in chains along with a thousand women prisoners. On the way relations and others, men and women, all hurled curses at him and the women were calling him traitor and one who got his own people put to sword. Who else can be a greater traitor ? However when he reached Medina Abu Bakr released him and on that occasion he was married to Umme Farwa.

SERMON 20

If you could see what has been seen by those of you who have died you would be puzzled and troubled. Then you would have listened and obyed: but what they have seen is yet

curtained off from you. Shortly the curtain would be thrown off. You have been shown, provided you see and you have been made to listen provided you listen, and you have been guided if you accept guidance. I spoke into you with truth. You have been called aloud by (instructive) examples and warned through items full of warnings. After the heavenly messengers (angles) only man can convey message from Allah. (So what I am conveying is from Allah).

[SERMON 21

Your aim is before you. Behind your back is the hour (of your death) which is driving you on. Keep yourself light and overtake (the forward ones). Your last ones are being awaited by the first ones (who have preceded).

Syed Razi says : If this utterance of Ali is weighed with any other utterance except the word of Allah or of the Prophet (S.A.), it would prove heavier and superior in every respect. For example, Ali's saying 'keep light and overtake" is the shortest expression ever heard with the greatest sense conveyed by it. How wide is its meaning and how clear its spring of wisdom! We have pointed out the greatness and meaningfulness of this phrase in our book Khasaes.

SERMON 22

Beware! Satan has started instigating his forces and has collected his army in order that oppression may reach its extreme ends and wrong may come back to its position. By Allah they have not put a correct blame on me, nor have they done justice between me and themselves. They are demanding

of me a right which they have abandoned, and a blood that they have themselves shed.1 If I were a partner with them in it then they too have their share of it. But if they did it without me they alone have to face the consequences. Their biggest argument (against me) is (really) against themselves. They are suckling from a mother who is already dry, and bringing into life innovation that is already dead. How disappointing is this challenger (to battle) ? Who is this challenger and for what is he being responded to ? I am happy that the reasoning of Allah has been exhausted before them and He knows (all) about them. If they refuse (to obey) I will offer them the edge of the sword which is enough a curer of wrong and supporter of Right. It is strange they send me word to proceed to them for spear-fighting and to keep

NAHJULBALAGHA

His Being, His Being would have to be regarded as the object of change the result of which would be that He would have to be taken as having come into existence. In this way He would lose the attribute of being from ever. This is a very deceptive fallacy because changes in the object of knowledge can lead to changes in the knower only when it is assumed that the knower does not already possess knowledge of these changes. But since all the forms of change and alteration are crystal clear before Him there is no reason that with the changes in the objects of knowledge He too should be regarded changeable, although really this change is confined to the object of knowledge and does not affect knowledge in itself.

SERMON 90

When people decided to swear allegiance at his hands after the murder of Usman, Ameerul Momlneen (A.S.) said:

Leave me and seek some one else. We are facing a matter which has (several) faces and colours, which neither hearts can stand nor intelligence can accept. Clouds are hovering over the sky, and faces are not discernable. You should know that if I respond to you I would lead you as I know and would not care about whatever one may say or abuse. If you leave me then I am the same as you are. It is possible I would listen to and obey whomever you make incharge of your affairs. I am better for you as a counsellor than as a chief.

NAHJULBALAQHA

SERMON 98

Praise be to Allah Who spreads His bounty throughout the creation, and extends His hand of generosity among them. We praise Him in all His affairs and seek His assistance for fulfilment of His rights. We stand witness that there is no god except He and that Mohammad (S.A.) is His servant and Prophet. He sent him to manifest His commands and speak about His remembrance. Consequently he fulfilled it with trustworthiness, and he passed away while on the right path. He left among us the standard of right. Whoever goes farther from it goes out of Faith, whoever lags behind it is ruined. Whoever sticks to it would join. (the right). Its guide is short of speech, slow of steps, and quick when he rises. When you have bent your necks before it and pointed towards it with

your fingers his death would occur and would take him away. They would live after him as long as Allah wills till Allah brings out for you one who would collect you together and fuse you after diffusion. Do not place expectations in one who does not1 come forward and do not lose hope in one who is veiled, because it is possible that one of the two feet of the veiled one may slip while the other may remain sticking, till both return to position and stick.

Beware! The example of the descendants of Mohammad, (S.A.) is like that of stars of the Sky. When one star sets another one rises. So you are in a position that Allah's blessings on you have been perfected and He has shown you what you used to wish for.

1. The implication is that if for the time being your expectations are no: being fulfilled, you should not be disappointed. It is possible matters may improve, the impediments in the way of improvement may be removed and matters may be settled as you wish.

SERMON 99

He (Allah) is the First before every first and the last after every last. His Firstness necessitates that there is no (other) first before Him and His Lastness necessitates that there is no other last after Him. I do stand witness that there is no god but Allah both openly as well as secretly, with heart as well as with tongue.

O* people, do not commit the crime of opposing me.

do not be seduced into disobeying me and do not wink at each other with eyes

you from being put on trial. Allah the Sublimest of all speakers has

said.

Verily in this are signs and Wo do only try (the people). (23:30)

Syed Razi says: As regards Ameerul Momineen's words "Kullu Momineen Navamatin" (every sleeping believer), he implies thereby one who is talked of little and causes no evil. And the word "Ma-saeeh" is the plural of "misyah". He is one who spreads trouble among people through evils and calumnies. And the word Mazaeei" is the plural of "Mizya" He is one who on hearing of an evil about some one spreads it and shouts about it. And "Buzuru" is the plural of "Bazoor". He is one who excells in foolishness and speaks rubbish.

SERMON 102

So now, certainly Allah deputed Mohammad (S.A.) as Prophet while no one among the Arabs read the Book nor claimed prophethood or revelation. He had to fight those who disobeyed him in company with those who followed him, leading them towards their salvation and hastening with them lest death overtook them. When any weary person sighed or a distressed one stopped he stood at him till he got him his aim, except the worst in whom there was not virtue at all. Eventually he showed them their goal and carried them to their

places (of deliverance). Consequently their affairs moved on jp.nd their hand-mill bigan to rotate (i.e. position gained strength), their spears got straightened. By Allah, I was among their rear-guard till they turned back on their sides and were flocked in their rope. I never showed weakness or lack of courage, nor did I betray or become languid. By Allah I shall split the wrong till I extract right from its flanks.

SERMON 103

Then Allah deputed Mohammad (S.A.) as a witness, giver of good tidings and warner, the best in the universe as a child and the most chaste as a grown up man, the purest of the purified in conduct, the most generous of those who are approached for generosity. This world did not appear sweet to you in its pleasures and you did not secure milk from its udders except after having met it when its nose-rein was trailing and its leather girth was loose. For certain peoples its unwalful items were like bent branches (laden with fruit) while its lawful items where far away, not available. By Allah, you

----

کچھ اقوال حضرت علیؑ سن لیجیے۔

(1) جو شخص برائی کا نقصان نہیں جانتا۔ اس کے واقع ہونے سے نہیں بچ سکتا۔

(2) صدق یقین کے ساتھ سو رہنا اس نماز سے کہیں اچھا ہے کہ جو شک کے ساتھ ادا کی جائے۔

(3) جس شخص کی زبان اس پر حکمران ہو وہی اس کی ہلاکت اور موت کا فیصلہ کرتی ہے۔

(4) حیا کی غایت یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ سے حیا کرے۔

(5) جو شخص زیادہ خوش رہتا ہے، اس کی خوشنودی اور رضامندی معلوم نہیں کی جا سکتی۔

(6) اگر تو کسی کے ساتھ احسان کرے تو اس کو مخفی رکھ اور اگر کوئی تیرے ساتھ کوئی احسان کرے تو اس کو ظاہر کر۔

(7) خندہ پیشانی سے پیش آنا سب سے بڑی نیکی ہے۔
(8) دنیا مسافر خانہ ہے لیکن نادانوں نے اسے وطن بنالیا ہے۔
(9) پاکیزگی وہ دولت ہے جو محبت کی افراط سے حاصل ہوتی ہے۔
(10) مصیبت میں گھبرانا سب سے بڑی مصیبت ہے۔
(11) عالم وہی ہے جس کا اپنے علم پر عمل ہو۔
(12) ثواب حاصل کرنے کی نسبت گناہ سے پرہیز زیادہ بہتر ہے۔
(13) اگر تم اپنے دشمن پر قابو پالو تو قابو پانے کے شکریے میں معاف کردو۔
(14) سخاوت وہ ہے جو بن مانگے کی جائے۔ مانگنے پر سخاوت سخاوت نہیں ہوتی بلکہ حیا اور ندامت سے بچنے کے لیے ہوتی ہے۔
(15) قناعت وہ مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔
(16) بہترین زہد یہ ہے کہ اپنے زہد کو چھپایا جائے۔
(17) سخی ہو لیکن فضول خرچ نہ ہو۔
(18) کسی شخص کی قیمت وہی ہوتی ہے جو وہ اپنے لیے مقرر کرتا ہے۔
(19) تفکرات آدھا بڑھاپا ہوتے ہیں۔
(20) انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔
(21) اکثر اوقات ایک لقمہ کئی لقموں کو روک دیتا ہے۔
(22) دنیا کی تلخی آخرت کی شیرینی ہوتی ہے اور دنیا کی شیرینی آخرت کی تلخی۔
(23) جس نے عقل کا مقابلہ کیا، وہ شکست کھائے گا۔
(24) دو شخص کبھی سیر نہیں ہوتے (1) علم کا طالب (2) مال کا طالب۔
(25) جو شخص باتونی ہوگا وہ زیادہ غلطیاں کرے گا اور جو زیادہ غلطیاں کرے گا اس کی شرم کم ہو جائے گی۔
(26) دین خزانہ اور علم اس کا راستہ ہے۔
(27) علم کی خوبی اس پر عمل کرنے میں اور احسان کی خوبی اس کے نہ جتانے پر منحصر ہے۔
(28) جو لوگ تم سے زیادہ علم رکھتے ہیں، ان سے سیکھو اور جو نادان ہیں ان کو علم سکھاؤ۔
(29) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا۔

(30) دنیا حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

(31) جو چیز تم سے چھین لی جائے، اس کا غم نہ کرنا۔

(32) ہمیشہ حق اور صداقت کو ملحوظ خاطر رکھنا۔

(33) ہمیشہ نماز وقت پر ادا کرنا۔

(34) پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنا۔

(35) کبھی فحش کلمات منہ سے نہ نکالنا۔

(36) خدا ایسا فیاض ہے کہ جیسے سوالوں کو پورا کرنا مفلس نہیں بنا سکتا اور گڑگڑا کر سوال کرنے والوں کا اصرار بخل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

(37) خدا کے بندوں میں سے وہی سب سے زیادہ اپنے نفس کا خیر خواہ ہے جو خدا کا زیادہ مطیع و فرمانبردار ہے۔

(38) اس دنیا کی مثال اس سائے کی طرح ہے کہ اگر اس کے پیچھے دوڑو تو وہ آگے بھاگتا ہے اور اس سے دامن چھڑا کر بھاگو تو وہ پیچھے بھاگتا ہے۔

(39) جب تمہیں تھوڑی سی حکمتیں حاصل ہوں تو ناشکری سے انہیں اپنے تک پہنچنے سے پہلے نہ بھگا دو۔

(40) عادت پر غالب آنا کمال فضیلت ہے۔

(41) نادانوں کی بات پر تحمل عقل کی زکوۃ ہے۔

(42) اللہ کی بارگاہ میں وہ بدی جو تمہیں رنجیدہ کر دے، اس نیکی سے بہتر ہے جس پر تمہیں ناز ہو۔

(43) لمبی لمبی امیدیں باندھنے سے پرہیز کرو کیونکہ وہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی خوشی کو دور کرتی ہیں۔

(44) بے شک اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان پر گناہوں کا کرنا دشوار ہے۔

(45) حرص سے کچھ روزی نہیں بڑھتی مگر آدمی کی قدر گھٹ جاتی ہے۔

(46) علم کی خوبی اس پر عمل کرنے میں اور احسان کی خوبی نہ جتانے پر منحصر ہے۔

(47) جو شخص اپنے آپ کو گمراہ کرے اس کو کوئی دوسرا شخص کیسے راہ پر لا سکتا ہے۔

(48) جس شخص کی برائی کرنے پر اس کی شکر گزاری کی جائے وہ شکر گزاری نہیں بلکہ تمسخر ہے۔

(49) کہاوتیں اور مثالیں عقلمندوں اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بیان کی جاتی

ہیں۔ نادانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

(50) موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔

(51) دوستی ایک خود پیدا کردہ رشتہ ہے۔

(52) غیبت کا سننے والا غیبت کرنے والوں میں داخل ہے اور بے کام پر راضی ہونے والا گویا اس کا فاعل ہے۔

(53) جس شخص کو علم غنی اور بے پروا نہیں کرتا وہ حال سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔

(54) شریفوں کے واسطے یہ بہت بڑی مصیبت ہے کہ ان کو شریروں کی خاطر مدارات کی ضرورت پیش آئے۔

(55) بے موقع حیا بھی باعث محرومی ہے۔ قابل محبت بہت کم لوگ ہیں۔

(56) خواہش پرستی کو ہلاک کر دینے والا ساتھی اور بری عادت ایک زوردار دشمن ہے۔

(57) تجربے کبھی ختم نہیں ہوتے اور عقلمند وہ ہے جو ان کی ترقی کرتا ہے۔

(58) جب کلام کم ہو جائے تو آدمی اکثر صحیح بات کرتا ہے۔

(59) گناہ کو چھوڑ دینا توبہ کرنے سے آسان ہے۔

(60) تم بڑوں کی عزت کرو۔ چھوٹے تمہاری عزت کریں گے۔

(61) دشمن کے حسن سلوک پر بھروسہ مت کرو کیونکہ پانی آگ سے کتنا اونچا گرم کیا جائے، پھر بھی اسے بجھانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

(62) اگر تم دشمن کے ساتھ نیکی کر سکتے ہو تو اسے ترک مت کرو۔

(63) تجربوں کو یاد رکھنا عقل کا دوسرا نام ہے۔

(64) معاف کر دینا ایک احسان ہے اور احسان آپ کو غلام بنا دیتا ہے۔

(65) انسان کی بزرگی تھوڑا بولنے اور اس کی فضیلت کثرت عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔

(66) جب آدمی کا خلق اچھا ہو تو کلام لطیف ہوتا ہے۔

(67) جب کسی احسان کا بدلہ ادا کرنے سے تیرے ہاتھ قاصر ہوں تو زبان سے اس کا شکریہ ضرور ادا کر دو۔

(68) جو حقوق تیرے نفس کے ذمہ ہیں ان کے ادا کرنے کا تو خود اس سے تقاضا کرتا تا کہ دوسروں کے تقاضے سے محفوظ رہے۔

(69) جب کسی آدمی میں نیز ھی خصلت معلوم ہو تو اس بات کا منتظر رہ کہ اس میں اس قسم کی اور خصلتیں بھی ہوں گی۔

(70) انسان کا چہرہ حسن اللہ تعالیٰ کی عمدہ عنایت ہے۔

(71) کارخانہ قدرت میں فکر نا بھی عبادت ہے۔

(72) کشادہ دلی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے۔

(73) برائیوں سے پرہیز کرنا نیکیاں کرنے سے بہتر ہے۔

(74) اگرچہ کوئی قدر شناس نہ ملے مگر تو اپنی نیکی کو بند نہ کر۔

(75) عقیدے میں شک رکھنا شرک کے برابر ہے۔

(76) دوسروں کے حال پر غور کرنے سے نصیحت حاصل ہوتی ہے۔

(77) عقلمند آدمی ہمیشہ فکر و غم میں مبتلا رہتا ہے۔

(78) جب تک کسی شخص کا حال معلوم نہ ہو، اس کی نسبت بزرگی کا اعتقاد نہ رکھو۔

(79) قابل صحبت بہت کم لوگ ہیں۔

(80) بدکاروں کی صحبت سے بچتا رہ کیونکہ برائی برائی سے جلد مل جاتی ہے۔

(81) بے موقع حیا بھی باعث محرومی ہے۔

(82) گناہوں سے نادم ہونا بھی گناہوں سے معافی مانگنا ہے۔

(83) گناہوں پر نادم ہونا ان کو مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر مغرور ہونا ان کو برباد کر دیتا ہے۔

(84) برا کام لوگوں کے سامنے کرنا مناسب نہیں۔ اسے چھپ کر بھی نہ کرنا چاہیے۔

(85) مشورہ باعث تقویت ہے۔

(86) شکر نعمت حصول نعمت کا باعث ہے اور ناشکری حصول زحمت کا باعث ہے۔

(87) کسی دوسرے کے گرنے پر خوشی مت کرو کیا معلوم کل تیرے ساتھ کیا ہوگا۔

(88) ادب بہترین کمالات اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

(89) سخاوت کے ساتھ احسان رکھنا نہایت کمینگی ہے۔

(90) مال فتنوں کا سبب، حوادث کا نتیجہ، تکلیف کا باعث اور رنج و مصیبت کی سواری ہے۔

(91) لوگ سونے چاندی کی نسبت اچھے ادب کے زیادہ محتاج ہیں۔

(92) دولت مندی کی ترقی سے خدا کی پناہ مانگو۔ یہ ایک ایسی لمبی مستی ہے کہ اس سے بہت

دیر میں ہوش آتی ہے۔

(93) جو شخص مال دینے میں سب سے زیادہ بخیل ہو، وہ اپنی عزت کے دینے میں سب سے زیادہ سخی ہوتا ہے۔

(94) دولت، حکومت اور مصیبت میں انسان کی عقل کا امتحان ہوتا ہے۔

(95) کمینوں کی دولت تمام مخلوق کے واسطے مصیبت ہے۔

(96) تنگ دستی جسے لوگ معیوب سمجھیں، اس مالداری سے اچھی ہے جس سے انسان گناہوں اور خرابی میں مبتلا ہو کر ذلیل و رسوا ہو۔

(97) تنگ دست آدمی جو رشتہ داروں سے میل ملاپ رکھے اس مالدار سے اچھا ہے جو ان سے قطع تعلق کرلے۔

(98) تنگدستی میں سخاوت کی کوئی صورت نہیں اور کھانے کی حرص کے ساتھ صحت کی کوئی دلیل نہیں۔

(99) تواضع علم کا ثمرہ ہے۔

(100) ظلم نعمتیں دور کرتا ہے اور سرکشی عذاب لاتی ہے۔

(101) بے قراری کچھ تقدیر الٰہی کو نہیں مٹاتی۔ اجر و ثواب کو ضائع کر دیتی ہے۔

(102) غصب سے بچارہ کہ اس کا شروع جنون اور آخر ندامت ہے۔

(103) تمام لوگوں میں نیک کام پر سب سے زیادہ قادر وہ شخص ہے جسے غصہ نہ آئے۔

(104) اے اہل غرور! تمہیں دنیا میں کس چیز نے مغرور بنا رکھا ہے۔ حالانکہ یہ ایسا گھر ہے کہ اس میں بھلائی بہت قلیل ہے۔ اس میں طرح طرح کے شر موجود ہیں۔ اس کی نعمتیں سریع الزوال، اس سے صلح رکھنے والا مغلوب۔ اس کا مالک در حقیقت مملوک اور اس کا سامان آخرکار متروک ہے۔

(105) دنیا ایک ایسا گھر ہے جس کا اول تکلیف اور آخر فنا ہے۔ اس کی حلال چیزوں کا حساب اور حرام پر عذاب ہوگا جو شخص اس میں غنی ہے، وہ اکثر فتنہ میں مبتلا ہے۔ جو فقیر و محتاج ہے، وہ غم میں گرفتار ہے۔

(106) دنیا اگر آنے لگے تو آتی رہتی ہے۔ اگر پیٹھ پھیرے تو چلی ہی جاتی ہے۔

(107) دنیا ایسی مصیبتوں اور موتوں کا مجموعہ ہے جو سخت تکلیف دہ اور غیر مختتم ہے۔

(108) دین کی درستگی دنیا کے نقصان کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

(109) جب آدمی کی طرف دنیا متوجہ ہو تو اسے دوسروں کی خوبیاں پہنا دیتی ہے اور جب کسی سے پیٹھ پھیرے تو اس کی خوبیاں بھی چھین لیتی ہے۔

(110) خدا کی نعمت سے ناامید ہونا سخت نقصان دہ ہے۔

(111) انسان کی سب آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں۔

(112) طول عمل اور خلوص عمل کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

(113) فضول امیدوں پر بھروسہ کرنے سے بچارہ کہ یہ زحمتوں کا سرمایہ ہے۔

(114) سب سے بڑی مصیبت انقطاع امیدواری ہے۔

(115) جو شخص بہت بڑی بڑی امیدیں باندھتا ہے وہ موت کو بہت کم یاد کرتا ہے۔

(116) جب تم امیدیں باندھتے باندھتے دور جا پہنچو تو موت کی ناگہانی آمد کو یاد کرو۔

(117) کسی چیز سے اچھی طرح امید ہو جانا اس کی طلب میں ذلت اٹھانے سے بہتر ہے۔

(118) موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔

(119) مال امیدوں کو مضبوط کرتا اور موت آرزوؤں کی جڑ کاٹتی ہے۔

(120) تکلیف اور تنگی آلام سے اور موت حیات سے بہتر ہے۔

(121) موت سے بڑھ کر کوئی چیز سچی اور امید سے بڑھ کر کوئی چیز جھوٹی نہیں۔

(122) زمانے کے پل پل کے اندر آفات پوشیدہ ہیں۔

(123) خواہش پرستی ہلاک کرنے والا ساتھی اور بری عادت ایک زورآور دشمن ہے۔

(124) خواہش کی تابعداری ایک لاعلاج مرض ہے۔

(125) عقلمند آدمی اپنے آپ کو پست کر کے بلندی حاصل کرتا ہے اور نادان اپنے آپ کو بڑھا کر ذلت اٹھاتا ہے۔

(126) عقلمند وہ ہے جو غیروں سے عبرت حاصل کرے نہ کہ خود دوسروں کے لیے باعث عبرت بنے۔

(127) ہوشیار وہ ہے جو زمانہ کی روش پر چلے۔

(128) عقلمندی کا ایک نصف بردباری اور دوسرا نصف چشم پوشی ہے۔

(129) کمینے کے ساتھ بھلا کرنا نہایت برا فعل ہے۔

(130) فاسق کی برائی کرنا غیبت نہیں ہے۔

(131) برا آدمی کسی کے ساتھ نیک گمان نہیں رکھتا کیونکہ وہ ہر ایک کو اپنے جیسا خیال کرتا ہے۔

(132) فسق و فجور کے مقامات سے دور رہ کہ یہ خدا تعالیٰ کے غضب کے مقام اور اس کے عذاب کے محل ہیں۔

(133) فرصت کو کھانا بہت بڑی مصیبت ہے۔

(134) علم مالدار کی زینت اور تنگدستوں کے لیے تونگری کا ذریعہ ہیں۔

(135) علم بے عمل اور آزار اور عمل بغیر اخلاص بیکار ہے۔

(136) علم مال سے بہتر ہے کیونکہ تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو۔

(137) جس بات کا علم نہ ہو اسے برا نہ سمجھو۔ ہوسکتا ہے کئی باتیں ابھی تک تمہارے کان تک نہ پہنچی ہوں۔

(138) خودستائی کے برابر کوئی حماقت اور علم سے زیادہ کوئی راہنما نہیں۔

(139) تھوڑا سا علم فساد کا موجب ہے اور صحتِ عمل صحتِ علم پر منحصر ہے۔

(140) علم کے بیان کرنے والے تو بہت ہیں لیکن اس پر عمل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔

(141) اپنی لاعلمی کے اظہار کو کبھی برا نہ سمجھو۔

(142) دشمن ایک بھی بہت اور دوست زیادہ بھی تھوڑے ہیں۔

(143) غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔

(144) دنیاداروں کی دوستی ایک معمولی اور ادنیٰ بات سے دور ہو جاتی ہے۔

(145) اگر کوئی قابل شخص دوستی کے لائق نہ ملے تو کسی نا اہل سے دوستی مت کرو۔

(146) دوست سے دھوکا کھانے اور دشمن سے مغلوب ہونے سے بچو۔

(147) انسان جو اپنے لیے پسند کرے اسی حالت میں رہتا ہے۔

(148) تجربہ سے پہلے کسی پر اطمینان کرنا ہوشیاری کے خلاف ہے۔

(149) بات کی جانچ کر اور کہنے والے کی طرف خیال نہ کر کہ وہ کون ہے۔

(150) جب تک کوئی بات چیت نہ ہو اسے حقیر نہ سمجھو۔

(151) حق نہایت زبردست مددگار اور جھوٹ بہت ہی کمزور معاون ہے۔

(152) سچائی میں اگرچہ خوف ہے مگر باعث نجات ہے اور جھوٹ میں تو اطمینان ہے مگر موجب ہلاکت ہے۔

(153) جسے جہالت کی بات کہنے میں کوئی خوبی نہیں ویسا ہی حق ہے، چپ رہنے میں کوئی بھلائی نہیں۔
(154) صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔
(155) صبر کی نسبت بے قراری زیادہ تکلیف دہ ہے۔
(156) قانع ان آفات سے نجات پاتا ہے جو لالچی کو پیش آتی ہے۔
(157) حرام کاموں سے نفس کو روکنا بھی صبر کی دوسری قسم ہے۔
(158) بربادی بے عقلی کی سرپوش ہے۔
(159) لوگوں کے سامنے نصیحت کرنا ایک طرح کی ملامت ہے۔
(160) اقرار جرم مجرم کے لیے بہت اچھی سفارش ہے۔
(161) ایک وقت بھاگ جانا بھی ایک قسم کی فتح مندی ہے۔
(162) جلد باز آدمی اپنے کیے پر نادم ہوتا ہے۔ اگر نادم نہ ہو تو سمجھو کہ اس کا جنون مستحکم ہو گیا۔
(163) انسان کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔
(164) عورت سرتاپا شر اور خرابی ہے اور اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ عورت کے بغیر گزارہ بھی نہیں ہو سکتا۔
(165) شریر عورتوں سے بالکل برکنار رہو اور جو بھلی مانس ہوں، ان سے بھی ہوشیار رہو۔
(166) جب کوئی شخص کسی عورت کو دیکھے اور وہ اسے پسند کرے تو اپنی عورت سے ہم بستری کرے کیونکہ جیسی وہ عورت، ویسی ہی اس کی اپنی عورت ہے۔
(167) ظالموں سے عذاب اور مظلوموں سے نصرت الٰہی نہایت قریب ہے۔
(168) شریف عالم تو بضع اختیار کرتا ہے اور جب کمینہ باعلم ہو جائے تو وہ برائی کرنے لگتا ہے۔
(169) علما اس لیے غریب اور بے بس ہیں کہ جاہل لوگ زیادہ ہیں جو ان کی قدر نہیں کرتے۔
(170) عقلمند اگر خاموش رہے تو قدرت الٰہی میں فکر کرتا اور جب نگاہ اٹھا کر دیکھے تو عبرت حاصل کرتا ہے۔
(171) شرافت اپنی بلند ہمتی سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ باپ دادا کی پوشیدہ ہڈیوں پر فخر کرنے سے۔
(172) کم عقل سے دوستی پیدا کرنا اپنی کم عقلی جتانا ہے۔
(173) بصارت کا چلا جانا چشم بصیرت کے اندھا ہونے سے بہتر ہے۔
(174) جب عقل کامل ہو جائے تو کلام گھٹ جاتا ہے۔

(175) نیک کام کا ثواب اس کی مشقت کے انداز سے ملتا ہے۔
(176) بہترین کلام وہ ہے جس سے سننے والے کو ملال اور اس پر بوجھ نہ ہو۔
(177) ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق کلام کرو۔
(178) آہستہ بولنا، نیچی نگاہ رکھنا اور میانہ چال سے چلنا ایمان کی نشانی ہے اور دیانتداری کی خوبی میں شامل ہے۔
(179) صلۂ رحمی کی بہت سی صورتیں ہیں کہ ان سے قطع رحم بہتر ہے۔
(180) سب سے زیادہ سخت گناہ وہ ہے جو اس کے کرنے والے کی نظر میں چھوٹا ہو۔
(181) سب سے اچھا کلام وہ ہے جس کی حسن فعل تصدیق کرے۔
(182) جس شخص کا علم اس کی عقل سے زیادہ ہوتا ہے وہ اس کے لیے وبال بن جاتا ہے۔
(183) جس شخص کے دل میں جتنی زیادہ حرص ہوتی ہے، اس کو خدا تعالٰی پر اتنا ہی کم یقین ہوتا ہے۔
(184) جو شخص اپنی قدر نہیں کرتا تو کوئی دوسرا شخص بھی اس کی قدر نہیں پہچانتا۔
(185) جاہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ان سے دور رہو اور ان کو اپنے پاس سے دور رکھو کیونکہ بہت سے جاہلوں نے عقلمندوں کو ہلاک کیا۔
(186) انسان کی قدرت کا اندازہ اس کی ہمت سے، اس کی صداقت کا اس کی مروت سے، اس کی شجاعت کا اس کی صحبت سے اور اس کی پاکدامنی کا اس کی غیرت سے ہوتا ہے۔
(187) اپنا واجبی حق لینے سے کبھی کوتاہی نہ کرو، البتہ دوسروں کے غصب حقوق سے بچو۔
(188) شکریہ میں کمی کرنے سے محسن لوگ نیکی کرنے میں بے رغبت ہوتے ہیں۔
(189) سب سے اچھا اور عملی شکریہ یہ ہے کہ خداداد نعمتوں میں سے دوسروں کو بھی دے۔
(190) آدمی کی عقل اس کے کلام کی خوبی سے اور شرافت ان کے اعمال کی عمدگی سے ظاہر ہوتی ہے۔
(191) خواہش نفس کو علم کے ساتھ اور غضب کو حلم کے ساتھ مار ڈالو۔
(192) صاحب علم اگرچہ حقیر حالت میں ہو، اسے ذلیل نہ سمجھو۔ بے وقوف اگر بڑے درجے والا ہو تو اسے بڑا خیال مت کرو۔
(193) جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔
(194) میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا۔

''شکریہ زبیر صاحب!'' رات بہت ہو چکی تھی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ساجد

صاحب فکر میں ڈوبے ہوئے سب کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوئے۔ اس طرح ندیم اور رابعہ بھی روحانی جذبات سے مرغوب گردن جھکائے اپنی اپنی سمت میں چل دیئے۔

اگلے دن دوپہر تین بجے ندیم کا فون آیا۔ رابعہ ابھی ابھی کالج سے آئی تھی اور چائے بنا رہی تھی۔ فون کی گھنٹی بجی تو رابعہ نے فون اٹھایا۔ اس کی چھٹی حس یہ بتا رہی تھی کہ یہ ندیم ہی کا فون ہے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون اٹھایا تو ندیم ہی بول رہا تھا۔

''رابعہ! میری بات سنو۔ میں نے کل Dad سے تمہارے رشتے کی بات کی تھی۔ میں نے انہیں ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اپنی محبت کا اظہار بھی کیا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ رابعہ کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اگر میری شادی رابعہ سے نہیں ہوئی تو میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا لیکن وہ نہیں مانے۔ انہوں نے کہا، پہلے تو تمہاری امریکی ماں اسے قبول نہیں کرے گی کیونکہ وہ تمہاری شادی کسی امریکی سے کرنا چاہتی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی نسل کی ہو، کسی بھی ملک کی ہو۔ دوسرا وہ سماجی تضاد کی بات کر رہے تھے کہ تم ایک مڈل کلاس سے Adjust نہیں کر پاؤ گے۔ رومانیت پسندی اور محبت اپنی جگہ لیکن زمینی حقائق بہت تلخ ہیں۔ میں ہزار کوشش کے باوجود ان کو قائل نہیں کر سکا۔ میں ان سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ سن رہی ہو رابعہ! ہیلو، کچھ بولو۔''

ندیم رندھی ہوئی آواز میں مسلسل بول رہا تھا اور وہاں مکمل خاموشی تھی۔ گہرا سکوت۔ صرف سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔

ندیم ہیلو ہیلو کرتا رہا۔ پھر اس نے فون رکھ دیا۔

رابعہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گی۔ وہ بت بن گئی تھی۔ محرومی کا مجسمہ۔ پتھرائی ہوئی نظروں کے ساتھ چھت کو دیکھ رہی تھی اور پھر چھت بھی غائب ہوگئی۔ اس کا غیر مرئی وجود خلاؤں کو گھور رہا تھا۔ جہاں ایک شعر بادلوں پر تحریر تھا

وہ جو لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

حیات کی چیخ بھی سنائی دے رہی تھی جو فغاں کر رہی تھی

اپنی بقا کی فکر کرو اپنی زندگی کے لیے
زمانہ کچھ نہیں کرتا کبھی کسی کے لیے

اختتام
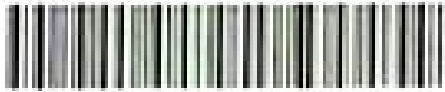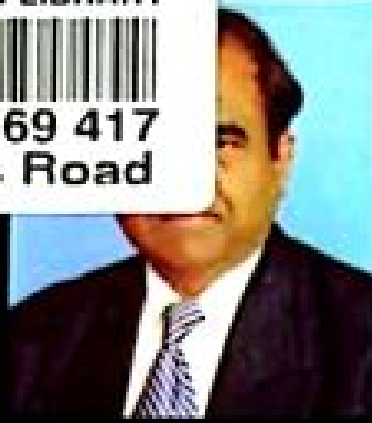
میرا تعلق ایک مڈل کلاس سید گھرانے سے ہے۔ میں بچپن سے مطالعے کا شوقین تھا۔ مجھے جوانی میں ہر خوبصورت چیز پسند تھی اور آج بھی ہے۔ یہی خوبصورتی کی تلاش مجھے انگریزی ادب کی طرف لے گئی۔ میں نے انگریزی میں ایم اے کیا اور چھ سال لیکچرار بن کر اپنا رزق کمانے کی کوشش کی۔ اسی دوران علم کی پیاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایم اے سیاسیات کر ڈالا اور قانون کی پیچیدگیوں کو سیکھنے کے لیے ایل ایل بی بھی پنجاب لاء کالج سے کرلیا۔ تدریس جیسے معزز پیشے کو تنگدستی کی وجہ سے چھوڑنا پڑا کیونکہ شادی اور بچوں کے بعد اخراجات بڑھنے لگے تھے جن کو صرف عزت اور شرافت پورا نہیں کرسکتی تھی۔ C.S.S کا امتحان پاس کیا تو محکمہ انکم ٹیکس میں نوکری مل گئی۔ زندگی چلتی رہی۔ رُتیں بدلتی رہیں۔ گمراہی سے ہی راست بازی کا راستہ نکلتا ہے۔ اسی انسانی کمزوری کی غلامی سے نجات پاتا ہوا ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہو گیا اور سوچتے سوچتے یہ کتاب لکھ ڈالی جو اب آپ کے دستِ مبارک میں ہے۔ اسے پڑھیے تو اپنی رائے کا اظہار کیجیے گا۔ یہ ایک نہایت ہی ادنیٰ کوشش بھی ہے اور پہلی جسارت بھی۔

آپ کی راہنمائی کا منتظر

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-2509-4
ISBN-13 978-969-35-2509-0